شعری ادب کی مکمل

اور جامع شرح

رہنمائے

شعری ادب

بی اے۔ اُردو الیکٹو

(نئے نصاب کے مطابق)

لاہور اکیڈمی ◎ چوک اُردو بازار ◎ لاہور

شعری ادب کی مکمل اور جامع شرح

رہنمائے

شعری ادب

بی اے۔ اردو ایلیکٹو

(نئے نصاب کے مطابق)

پروفیسر رشید احمد گریجہ شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج ـــــ فیصل آباد

روفیسر انور صابر شعبۂ اردو
یس ای کالج ـــــ بہاولپور

لاہور اکیڈمی ◎ چوک اردو بازار ◎ لاہور

قیمت :- ۳۶/- روپے

مطبع ـــــــ سیون برادرز پرنٹنگ پریس لاہور
ناشر ـــــــ لاہور اکیڈمی سرکلر روڈ
چوک اردو بازار لاہور

مندرجات

اسد اللہ وجہی

حمد

تعارف حمد اس نظم کو کہا جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی گئی ہو۔ اس کے لئے کوئی خاص ہیئت مخصوص نہیں ہوتی۔ ملا اسد اللہ وجہی کی یہ حمد سترھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں لکھی گئی۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ملا وجہی نے اللہ تعالیٰ کے بیشتر ایسے صفاتی نام استعمال کئے ہیں جو قرآن شریف میں موجود ہیں۔

حل لغات توں ۔ تو ؛ اوّل ۔ جو سب سے پہلے ہو۔ یہ تعریف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جو ساری کائنات کو وجود میں لانے والا ہے ؛ آخر ۔ جو سب کے بعد میں ہو۔ ساری کائنات کے ختم ہو جانے پر بھی اللہ تعالیٰ موجود رہیں گے ۔ اوّل و آخر دونوں صفاتی نام قرآنی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے لئے قرآن میں آتا ہے ۔ ھوالاوّل والآخر ؛ مالک ۔ آقا ؛ قابض ۔ اللہ کا یہ نام بھی قرآنی ہے ۔ قُل ھوالقادر علیٰ ان یبعث ؛ اہے ۔ ہے ؛ باطن ۔ چھپا ہوا ، پوشیدہ ، جو نظر نہ آئے ۔ نہ تو اللہ تعالیٰ کسی کو نظر آتا ہے نہ کوئی اسے دیکھ سکنے کا دعویٰ کر سکتا ہے ؛ ظاہر ۔ آشکار ، عیاں ۔ اللہ تعالیٰ باطن اور پوشیدہ ہونے کے باوجود ہر شے میں اپنی قدرت کے ذریعے ظاہر ہے اور صاحبِ بصیرت لوگ اُسے دیکھ سکتے ہیں جیسے حضرت ابراہیمؑ نے سورج ، چاند اور ستاروں کے طلوع و غروب کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ۔ باطن و ظاہر دونوں قرآنی نام ہیں ۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کے لئے آتا ہے ھوالاوّل والآخر والظاہر والباطن ؛ ستار ۔ چھپانے والا ، پردہ پوشی کرنے والا ، یہ نام بھی قرآنی ہے قرآن میں آتا ہے ستارالعیوب ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے عیوب پر پردہ ڈال دیتا ہے ؛ ہور ۔ اور ؛ جبار ۔ کے لفظی معنی جبر کرنے والے اور ظالم کے ہیں لیکن چونکہ یہاں پر یہ لفظ اصطلاحاً آیا ہے لہذا اس کے معنی زبردست اور طاقتور کرنا چاہیں اس لئے کہ ظلم و جبر کو اللہ تعالیٰ سے نسبت نہیں دی جا سکتی ۔ یہ نام بھی قرآنی ہے ۔ قرآن میں آتا ہے العزیز الجبار ؛ وہاب ۔ بہت زیادہ نعمتیں بخشنے والا ، اللہ تعالیٰ کا یہ صفاتی نام بھی قرآن میں آیا ہے ۔ قرآن میں ہے انک انت الوہاب ؛ قہار ۔ لفظی معنی قہر کرنے والا لیکن چونکہ ان معنوں کو بھی اللہ تعالیٰ سے نسبت نہیں دی جا سکتی لہذا اس کے معنی بھی ایسے زبردست کے ہیں جس کے حکم سے کوئی باہر نہ جا سکے ، یہ بھی قرآنی نام ہے للہ الواحد القہار ؛ رزاق ۔ رزق دینے والا ۔ بے شک اللہ ہی سب کو رزق دیتا ہے یہاں تک کہ پتھر میں کیڑے کو بھی وہی پالتا ہے ۔ قرآن میں یہ نام بھی آتا ہے ۔ ان اللہ ھوالرزاق ذوالقوۃ المتین ؛ عظیم ۔ بڑا ۔ یہ نام بھی قرآنی ہے ۔ لذوفضل العظیم ۔ فتاح بہت زیادہ عطا کرنیوالا علیم علم رکھنے والے ، جاننے والا ۔ یہ نام

بھی قرآنی ہے انك انت العليم الحكيم ؛ قدوس ۔ پاک، یہاں تک کہ وجود سے
بھی پاک جس کا تصور مادے سے بھی وابستہ ہے ۔ یہ بھی قرآنی نام ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلام
کو ظاہر کرتا ہے ۔ ملك القدوس السلم ؛ سمیع ۔ سننے والا، یہ بھی قرآنی نام ہے ؛ قیوم ۔
اللہ تعالیٰ کا قرآنی نام جس کے مختلف معانی بیان کئے جاتے ہیں مثلاً یہ کہ مصلح کل امور، ہمیشہ قائم
رہنے والا یا ہر شے کو اس کے معیار کے مطابق قائم رکھنے والا، هو الحی القیوم ؛ بدیع ۔
انوکھا، نادر، عجیب، یہ نام بھی قرآنی ہے ۔ بدیع السموات والارض ؛ تہیں ۔ تو ہی، معز،
عزت دینے والا ؛ بصیر، دانا و بینا، سمیع و بصیر دونوں قرآنی نام ہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لئے
آتا ہے سمیع ؎ بصیر ؛ مذل ۔ ذلت دینے والا اور ذلیل و رسوا کرنے والا ؛ قرآن میں اللہ کے لئے
معز و مذل دونوں صفاتی نام استعمال ہوتے ہیں اور صاف طور پر کہا گیا ہے کہ وہی عزت اور وہی
ذلت دینے والا ہے ۔ وتعز من تشاء وتذل من تشاء ؛ خبیر ہر بات کی خبر رکھنے والا،
عالم الغیب اللہ تعالیٰ کے لئے قرآن میں آتا ہے خبیر بما تعملون ؛ رؤف ۔ مہربان ۔
شفیق ۔ یہ بھی قرآنی نام ہے اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے نام رحیم کے ساتھ قرآن میں آتا ہے ۔
رؤف الرحیم ؛ رشید ۔ تربیت یافتہ (تربیت دینے والا) مانع ۔ منع کرنے والا ؛ ودود ۔
نیک بندوں کو دوست رکھنے والا یہ قرآنی نام ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں قرآن میں آیا
ہے وهو الغفور الودود ؛ غنی ۔ بے نیاز، دولت مند، اللہ تعالیٰ کا قرآنی نام ہے
ان ربی غنی کریم ؛ نافع ۔ نفع اور فائدہ دینے والا ؛ کبیر ۔ بڑا، بزرگ، قرآن میں آتا ہے
کبیر المتعال ؛ واسع ۔ پھیلنے والا، قرآن میں آتا ہے ان اللہ واسع علیم ؛ سبحان ۔ پاک ۔
یہ نام بھی قرآن میں آتا ہے ۔ قرآن میں ہے سبحان الذی اسری بعبدہ ۔ کریم ۔ کرم کرنے
والا ۔ قرآن میں آتا ہے ان ربی غنی کریم ؛ رحیم ۔ رحم کرنے والا ؛ رحمان ۔ مہربانی کرنے والا،
یہ دونوں قرآنی نام ہیں بسم اللہ الرحمن الرحیم ؛ ہمن ۔ ہمارے ؛ سنگ ۔ ساتھ ؛
نیر ۔ پانی ؛ اچھے ۔ رہے ؛ نیا ۔ اتنا ؛ پچھانے ۔ پہچانے ؛ چک ۔ ذرا ؛
کاں ۔ کہاں ؛ اپی ۔ آپ ہی ؛ تج ۔ تجھ کو ؛ زیب دینا ۔ موزوں رہنا ؛ جیوتا ۔ زندہ ؛ موا ۔
مردہ ۔ مرا ہوا ؛ ایک دھاتہ ایک جیسا ؛ سات ۔ بھی ساعت، لمحہ ؛ منجے ۔ مجھے ؛ منے ۔ میں ؛
شعر نمبر ۸ ۔ توں اول، توں آخر، توں قادر ہے ۔۔۔ توں مالک، توں باطن، تو ظاہر ہے

تشریح ملا وجہی کہتے ہیں کہ اے خدا اس دنیا میں جب کوئی چیز نہیں تھی اس وقت بھی تیرا وجود
تھا اور جب ہر چیز فنا کے گھاٹ اتر جائے گی ۔ تب بھی تو موجود رہے گا ۔ تیرے
سامنے دنیا کی ہر شے بے اختیار ہے اور صرف تیری ہی قدرت اور اختیار ساری دنیا پر چلتا ہے ۔

اس دنیا کا صرف تو ہی مالک و آقا ہے۔ باطن اور پوشیدہ طور پر بھی یہ دنیا تیری ملکیت ہے اور ظاہر طور پر بھی تیرے نظر نہ آنے کے باوجود اس کائنات کے ایک ایک منظر میں تیرے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔

شعر نمبر ۲: توں ستار ہور توں سوجبار ہے   توں وہاب ہور توں سو قہار ہے

تشریح: اے اللہ تو لوگوں کے گناہوں پر پردہ ڈالتا ہے اور ان کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اے اللہ تو اس قدر صاحب اختیار اور طاقت والا ہے کہ کوئی شے تیرے اختیار سے باہر نہیں جا سکتی۔ اے اللہ ایک طرف تو نعمتیں بخشنے میں بے مثال ہے اور دوسری طرف تو ایسا زبردست ہے کہ کوئی تیرے حکم سے باہر نہیں جا سکتا۔

شعر نمبر ۳: توں رزاق ہے ہور توں ہی عظیم   تو فتاح ہے ہور توں ہی علیم

تشریح: اے اللہ تو ہی سب کو رزق دیتا ہے اور تو ہی سب سے بڑا ہے۔ اے اللہ تو تو لوگوں پر اپنی رحمت اور بخشش کے دروازے کھولنے والا ہے اور تو سب کچھ جانتا ہے کوئی شے تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔

شعر نمبر ۴: توں قدوس ہے ہور توں ہی سمیع   توں قیوم ہے ہور توں ہی بدیع

تشریح: اے اللہ تیری ذات بہت ہی پاکیزہ ہے اور تو سب کچھ سنتا ہے۔ تو ہمیشہ قائم رہنے والا اور ہر شے کو اس کے معیار کے مطابق قائم رکھنے والا ہے۔ تجھے زوال نہیں اور اس اعتبار سے ساری کائنات کے مقابلے میں تو بہت ہی نادر اور عجیب ہے۔

شعر نمبر ۵: تہیں ہے معز ہور توں ہی بصیر   تہیں ہے مذل ہور توں ہی خبیر

تشریح: اے اللہ تو ہی لوگوں کو عزت دینے والا ہے اور تو سب کچھ دیکھتا ہے۔ کوئی چیز تجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ تو بہت ہی دانا و بینا ہے اور تو ہی لوگوں کو ذلت و خواری دیتا ہے۔ تجھے ہر بات کی خبر رہتی ہے خواہ کسی شے کو تجھ سے کتنا ہی پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جائے۔

شعر نمبر ۶: رؤف ہور رشید ہور مانع تہیں   ودود ہور غنی ہور نافع تہیں

تشریح: اے اللہ تو شفیق و مہربان ہے تو اپنے بندوں کو ہدایت دینے والا ہے تو لوگوں کو برائی سے منع کرنے والا ہے تو اپنے نیک بندوں کو اپنا دوست رکھتا ہے تو اس دنیا میں ہر چیز سے بے نیاز ہے اور ساری دنیا کو تو ہی نفع دیتا ہے۔

شعر نمبر ۷: کبیر ہور واسع ہے سبحان توں   کریم ہور رحیم ہور رحمان توں

تشریح: اے اللہ تو بڑا ہے۔ تجھ میں بہت بڑائی اور بے حد وسعت ہے تو برائیوں سے

بالکل پاک ہے تو اپنی مخلوق پر بہت کرم کرتا ہے اور تو بہت رحم کرنے والا اور مہربان ہے۔

شعر نمبر ۸:۔ لگے رات دن یوں ہمن سنگ توں ۔۔۔ کہ جیوں نیر مل کر اچھے رنگ سوں

تشریح: اے خدا! تو دن رات ہمارے ساتھ اسطرح رہتا ہے جیسے پانی اپنے رنگ کے ساتھ مل کر رہتا ہے۔ پانی اگر کسی جگہ اکٹھا ہو کر جمع ہو جائے تو اسمیں آہستہ آہستہ ایک رنگ پیدا ہو جاتا ہے، وہ رنگ پانی میں اسطرح ملا ہوتا ہے کہ اسے کسی بھی طور پانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وجہی کہتے ہیں کہ جسطرح پانی سے یہ رنگ جدا نہیں ہو سکتا اسی طرح خدا ہم سے جدا نہیں ہو سکتا۔

شعر نمبر ۹:۔ تیا توں ہے نزدیک جانے نہ کوئی ۔۔۔ قدیم آشنا ہور پچھانے نہ کوئی!

تشریح: تو لوگوں کے بہت قریب ہے یہاں تک کہ اُن کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ جیسا کہ اللہ نے خود فرمایا ہے نحن واقرب الیہ من حبل الورید۔ اس کے باوجود اپنی نادانی کے باعث بعض لوگ تجھے نہیں پہچانتے اس اعتبار سے تو لوگوں کا بہت پرانا شنا ہے کہ تو نے ہی پیدا کیا اور تو نے ہی رزق دیا اور تو نے ہی پرورش کی۔ تو انسانوں کے دلوں میں بھی رہتا ہے اس کے باوجود بعض لوگ تجھے نہیں جانتے اور سب لوگ تجھے پہچاننے سے قاصر ہیں۔ واضح ہو کہ منطق کی اصطلاح میں قدیم اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ہر شے سے پہلے موجود تھا اور جسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔

شعر نمبر ۱۰:۔ سورج چاند تارے نہ چک پھیرتے ۔۔۔ توں کاں ہے تجھے ڈھونڈتے پھیرتے

تشریح: یہ سورج، چاند ستارے اور زمین رات دن گردش میں رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ بھی تجھے ڈھونڈتا اور پانا چاہتے ہیں۔ ملا وجہی کے اس شعر کو خواجہ آتش نے بھی اپنے انداز میں نظم کیا ہے۔

؎ مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ ۔۔۔ کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

شعر نمبر ۱۱:۔ ولے کون جانے کہ توں کاں اہے ۔۔۔ نہیں جانتا ہے اپی جاں رہے

تشریح: لوگ تجھے تلاش کرتے ہیں لیکن تلاش بسیار کے باوجود کوئی تجھے نہیں پا سکتا۔ کون جان سکتا ہے کہ تو کہاں ہے۔ حالانکہ تو اُن کے جسم و جاں میں سرایت کر چکا ہے اور ایک ایک لمحہ ان کے ساتھ جان کی طرح رہتا ہے۔ نحن واقرب الیہ من حبل الورید۔

شعر نمبر ۱۲:۔ خدایا بڑا توں بڑائی ہے تج ۔۔۔ ہمیں سب بندے ہیں خدائی ہے تج

تشریح: اے خدا اس دنیا میں تو ہی سب سے بڑا ہے اور ساری بڑائی صرف تیرے لئے مخصوص ہے ہم سب تیرے غلام ہیں اور آقا و مالک صرف تو ہے۔

شعر نمبر ۱۳:۔ خدا ہے توں یو کام تجھ کو سہلتے ۔۔۔ کہ جیوتے کوں مارے موئے کوں جلائے

تشریح: اے خدا خدائی تجھے ہی زیب دیتی ہے۔ اور یہ کام بھی تیرے ہی لائق ہے کہ ایک پل میں

کسی جاندار کو مار دے اور کسی مرے ہوئے کو زندہ کر دے۔ تیرے سوا یہ کام کوئی نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس قدرت کاملہ کے بارے میں خود فرمایا ہے یخوج الحیّ من المیت و یخوج المیت من الحیّ۔ واضح رہے کہ کچھ اور ہستیوں مثلاً حضرت عیسیٰؑ کو بھی مردے زندہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا لیکن یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تھا۔

شعر نمبر ۱۴: بندیاں پر ہے تیرا کرم ایک دھات ہے تیری نظر سب پہ ہر ایک سات

تشریح اپنے تمام غلاموں یعنی انسانوں پر تیرا کرم یکساں ہے اور تو سب پر مہربان ہے۔ اس میں کالے گورے، غریب امیر، عربی عجمی اور مسلمان یا کافر کی کوئی تخصیص نہیں۔ تو سب پر مہربان رہتا ہے اور تو سب کو نوازتا ہے۔

شعر نمبر ۱۵: منجے بے نیازی دے دو جگ منے منجے سرفرازی دے دو جگ منے

تشریح اے اللہ تو مجھے دونوں جہانوں سے بے نیاز اور غنی کر دے اور مجھے دونوں جہانوں میں عزت اور توقیر عطا کر۔

اس حمد کا آخری شعر دعائیہ ہے لیکن حمد کا انداز اس میں بھی موجود ہے یعنی دونوں جہانوں کی کامیابی صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مل سکتی ہے۔

نعت

نعت اصطلاحاً ایسی نظم کو کہا جاتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی گئی ہو۔ حمد کی طرح نعت کے لئے بھی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی۔ ملا وجہی کی یہ نعت اُن کی مشہور مثنوی قطب مشتری سے لی گئی ہے۔ اس میں بھی وہی اسلوب موجود ہے جو ولی دکنی سے پہلے سترھویں صدی عیسوی کے دکنی شعراء کے لئے مخصوص ہے۔

حل لغات نانو۔ نام ؛ چھانو۔ چھاؤں، سایہ ؛ اسی ہور یک لاکھ۔ ایک لاکھ اور اسّی ؛ ولے۔ لیکن ؛ مرتبہ۔ مقام، رتبہ ؛ سایہ بان۔ دھوپ اور بارش وغیرہ سے پناہ دینے والا چھپر ؛ ملائک۔ ملک کی جمع یعنی فرشتے ؛ بندے۔ غلام ؛ ازل۔ وقت کا وہ لمحہ جس کے بارے میں یہ تصور ہے کہ اُس وقت کائنات تخلیق کی گئی تھی یہ لمحہ کب تھا اس بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ؛ ابد۔ ازل کی ضد، یعنی وہ لمحہ جب یہ کائنات ختم ہو جائے گی۔ اس لمحے کا تعین بھی ناممکن ہے ؛ قضا۔ اللہ کا حکم، مشیّتِ الٰہی ؛ قدر۔ تقدیر، فرمانِ الٰہی ؛ تے۔ سے ؛ پرگٹ۔ جاری ہونا۔ پھٹنا پھولنا ؛ تلپٹ۔ الٹ پلٹ، تباہ و برباد ؛ مروت۔ لحاظ، رعایت ؛ وفا۔ نباہ، خیر خواہی ؛ حلم۔ بردباری ؛ سلیمی۔ سلامتی ؛ بو۔ یہ ؛

ہویدا - ظاہر، عیاں ؛ پیدا - ظاہر، عیاں ؛ نو دنو - ننانوے ۹۹ ؛ نیس - نہیں ؛ پاپ - گناہ - جرم، عذاب، مصیبت ؛ سنسار - دنیا، جہان، کائنات، زمانہ ؛ شفاعت - گناہوں کی معافی اور بخشش کے لئے سفارش ؛ کرن ہار - کرنے والا ؛ لاڈلا - پیارا -

شعر نمبر ۱:- محمدؐ نبی نانو تیرا اہے ! عرش کے اوپر چھانو تیرا اہے

تشریح: اے نبیؐ آپ کا نام محمدؐ رکھا گیا جس کے معنی ہیں بے حد تعریف کیا گیا یعنی آپؐ کی ذاتِ اقدس ایسی ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ ممدوح ہے - نہ کسی کی اس حد تک تعریف کی گئی ہے اور کوئی اس حد تک تعریف کے قابل ہے - یہاں تک کہ آپؐ کا سایہ عرشِ اعظم پر بھی موجود ہے - اس شعر میں واقعہ معراج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کوئی شخص دنیا میں خواہ کتنے ہی بلند مرتبے پر فائز رہا ہو لیکن اُسے آسمان اور عرش تک رسائی حاصل نہ ہو سکی جبکہ آنحضرتؐ کو یہ منفرد مرتبہ بھی عطا ہوا -

شعر نمبر ۲:- اسی ہور یک لاک پیغمبر آئے ! دے مرتبہ تیرا کوئی نہ پائے !

تشریح: دنیا میں انسانوں کی رہنمائی کا اہم فرض ادا کرنے کے لئے ایک لاکھ اور اسی پیغمبر مبعوث ہوئے لیکن کسی کو بھی وہ مقام رفیع نصیب نہ ہوا جو آپؐ کو ملا - یہ شعر مسلمانوں کے اس عقیدے کے پس منظر بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ دعائے خلیلؑ و نوید مسیحا ہیں - آخر میں تشریف لانے کے باوجود تمام انبیاء کے سردار ہیں بلکہ بہت سے انبیاء مثلاً آدمؑ کی لغزش آپؐ کے اسم گرامی کی وجہ سے معاف ہوئی -

واضح ہو کہ انبیاء کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں جن میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ اور اسی پیغمبر آئے -

شعر نمبر ۳:- عرش کرسی تج گھر ہے در آسماں تُوں سورج ہے بادل ترا سایہ باں

تشریح: عرش اور کرسی آپؐ کے گھر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان مقامات تک پہنچنے کے لئے آسمان دروازے کا کام دیتا ہے جس میں بظاہر کوئی راستہ نہیں - بے شک اس دنیا میں دین اور انسانیت کی روشنی پھیلانے کے ناتے آپؐ کو سورج کہنا چاہیے اور جس طرح سورج کا سایہ نہیں ہوتا اسی طرح آپؐ کا بھی سایہ نہیں تھا اور بادل ہمہ وقت آپؐ پر سایہ فگن رہتا تھا - ایک روایت ہے کہ آنحضرتؐ کا سایہ نہیں تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ آپؐ پر بادل کے ٹکڑے سایہ کئے رہتے تھے - ملا وجہی نے یہ شعر اسی روایت کے پس منظر میں کہا ہے -

شعر نمبر ۴:- ملایک اہے جیتے اسمان میں رہیں رات دن سب ترے دھیان میں

تشریح: اے رسولؐ! آسمان میں جس قدر فرشتے ہیں وہ دن رات آپؐ ہی کے خیال میں مگن

رہتے ہیں۔ خود آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ میرے روضہ پر روزانہ ستر ستر ہزار فرشتوں کی جماعتیں درود شریف پڑھنے آیا کریں گی اور جس فرشتے کی باری ایک دفعہ آجائے گی اُسے دوبارہ یہ سعادت نصیب نہ ہوگی جس دن قیامت آئے گی اُس دن فرشتوں کی آخری جماعت اِس سعادت سے بہرہ ہوگی۔

شعر نمبر ۵: جو بندے ہو کے خدمت کریں تیرے گھر ــــ ازل ہور ابد ہور قضا ہور قدر

تشریح ازل، ابد، مشیت الٰہی اور تقدیر سب آپؐ کے گھر میں غلاموں کی طرح خدمت کرتے ہیں یعنی استعاراتِ تخلیق و فنا، حکم الٰہی، اور تقدیر آپؐ کے حاکم کی بجائے محکوم، غلام اور محض ایک اشارۂ ابرو کے محتاج ہیں اور آپؐ کی منشا کے مطابق کام کرتے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو اس کائنات کی تخلیق کی بنیادی وجہ بھی تو آپؐ ہی کی ذات اقدس ہے۔ حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اگر آپؐ کو پیدا کرنا منظور نہ ہوتا تو یہ افلاک بھی پیدا نہ کئے جاتے۔

شعر نمبر ۶: تیرا دین جس دن تے پرگٹ ہوا ــــ سو اُس دن تے سب کفر تلپٹ ہوا

تشریح اے نبیؐ! جس دن سے آپؐ کا دین یعنی اسلام اس دنیا میں آیا اور پھولا پھلا اُسی دن سے کفر کا سارا کاروبار تباہ و برباد ہوگیا۔ یعنی آپؐ کی بعثت سے قبل دنیا کفر کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی یہاں تک کہ خانۂ خدا میں بھی تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے لیکن آپؐ کی تشریف آوری کے بعد کفر کا چراغ نہ جل سکا۔

شعر نمبر ۷: محبت، مروت، وفا ہور حلم ــــ حلیمی، سلیمی، عمل ہور علم!

۸: توں پیدا ہوا یو ہویدا ہوئے ــــ اول یو نہ تھے، تج تے پیدا ہوئے

تشریح محبت، اخلاق و انسانیت، خیر خواہی، بردباری و نرم خوئی، سلامتی اور علم و عمل سب آپؐ کا عطیہ ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپؐ سے پہلے یہ رویے کوئی وجود نہیں رکھتے تھے۔ دنیا پر آپؐ کا ظہور ہوا تو آپؐ نے ان رویوں کو عام کیا اور ان کا اظہار ممکن ہو سکا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قبل از اسلام صرف عربوں کی حالت دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ آپؐ کی تشریف آوری کے سبب ان کی معاشرتی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا تھا۔

شعر نمبر ۹: نود نو ہیں تج نانو یک نانو نیں! ــــ توں رب چھانو ہے چھانو کوں چھانو نیں

تشریح آپؐ کا نام یوں تو محمدؐ ہے لیکن دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپؐ کا صرف ایک ہی نام نہیں ہے بلکہ ننانوے نام ہیں۔ ملا وجہی نے آنحضرتؐ کے ننانوے صفاتی ناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ کے نام بھی ننانوے ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دراصل زمین پر آپؐ خدا کا سایہ ہیں اور چونکہ آپؐ خود اللہ کے سائے کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا آپؐ کا سایہ نہیں تھا

اس لئے کہ سلئے کا کوئی سایہ نہیں ہوتا۔

شعر نمبر ۱۰:۔ امیدوار ہے جگ ترے پیار کا　　کہ بخشائے توں پاپ سنسار کا!

تشریح: ساری دنیا آپؐ کی مہربانی و عطا کی امید رکھتی ہے اور یہ توقع کرتی ہے کہ آپؐ ساری دنیا کی شفاعت فرمائیں گے اور اس طرح سب کے گناہ بخشے جائیں گے۔

شعر نمبر ۱۱:۔ شفاعت کرن ہار سب کا تہیں!　　اپی لاڈلا ایک رب کا تہیں!

تشریح: بے شک گناہوں کی بخشش کے ضمن میں آپؐ کی ہی ذات اللہ تعالیٰ سے سفارش کرنے کی اہل ہے اسلئے کہ ساری مخلوق میں اللہ کے پیارے کی حیثیت صرف آپؐ ہی کو حاصل ہے۔

ولی دکنی

غزل نمبر ۱

حل لغات: کوں۔ قدیم اردو میں بمعنی کو استعمال ہوتا تھا؛ ٹک۔ کچھ، تھوڑا سا، ذرا دیر کیلئے؛ مہر۔ محبت، عنایت، مہربان؛ سوں۔ بمعنی سے؛ توں۔ بمعنی تو؛ مان۔ غرور، گھمنڈ؛ چنچل۔ شوخ، شریر؛ بھاؤ بتانا۔ رقص کے دوران کسی حالت کا اظہار کرنا اور کہانی پیش کرنا، نرخ بتانا؛ تس سوں۔ تجھے؛ دھرم۔ دین، مذہب؛ کاجل۔ چراغ کا دھواں جو آنکھوں میں لگایا جاتا ہے، سرمہ؛ موہن۔ محبوب؛ سندر۔ خوبصورت، حسین و جمیل؛ مشتاق۔ شوقین، اشتیاق رکھنے والا؛ درس۔ دیدار؛

شعر نمبر ۱:۔ مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا۔　　ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھاتی جا

تشریح: اے محبوب میں تیرے فراق میں جل رہا ہوں اور تو اپنے غصّے کی آگ سے مجھے مزید جلا رہا ہے۔ دیکھ ایسا نہ کر اور غصّہ نہ کھا۔ اگر ہو سکے تو اپنی محبت، مہربانی اور عنایت سے میرے دل میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے کا سامان کر دے۔

شعر نمبر ۲:۔ تجھ چال کی قیمت سوں دل نئیں ہے مرا واقف۔　　اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

تشریح: اے محبوب تو بہت خوبصورت انداز میں چلتا ہے لیکن میں تیری چال کی قیمت سے واقف نہیں ہوں یعنی میں نے تجھے چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لہٰذا اے مغرور و شوخ محبوب تو چلنے کا ایسا انداز اختیار کر کہ مجھے تیری چال کی قیمت کا اندازہ ہو جائے۔

شعر نمبر ۳:۔ اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تس سوں۔　　ٹک پاؤں کے جھانجھر کی جھنکار سناتی جا

تشریح: ولی دکنی کہتے ہیں کہ رات کا وقت ہے، نیز رات بھی اندھیری ہے۔ ایسے میں اندیشہ ہے کہ کہیں

سمت کا صحیح اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے راستہ نہ بھول جاؤں اور تیری طرف آنے کی بجائے کسی اور طرف بھٹک جاؤں۔ ایسے میں ضروری ہے کہ تو میری رہنمائی کر۔ مناسب یہ ہے کہ تو اپنی جھانجھر کی آواز پیدا کرتا کہ میں جھانجھر کی آواز سن کر سمت کا اندازہ کر کے تیری طرف آسکوں اور بھٹکنے سے بچ جاؤں۔

شعر نمبر ۴:۔ مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑیا ہے تری لٹ نے ۔ یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا

تشریح: اے محبوب میرے دل کا کبوتر یعنی دل تیری زلفوں میں پھنس گیا ہے اور گرفتاری کے اس عالم میں اس کی حالت ابتر ہو گئی ہے۔ تو مہربانی کر اور میرے دل کو اپنی زلفوں کے جال سے آزاد کر دے یہ نیکی کا کام ہے اور اللہ تجھے اس کا اجر دے گا۔

شعر نمبر ۵:۔ تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل ۔ یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کوں لگاتی جا

تشریح: اے محبوب تیرے فراق میں میرا جسم جل کر راکھ ہو گیا ہے اور اس نے کاجل کی شکل اختیار کر لی ہے جو چراغ جلنے سے پیدا ہوتا ہے اور آنکھوں کی دلکشی اور بینائی میں اضافہ کرنے کے لئے آنکھوں میں لگایا جاتا ہے۔ اے محبوب میرے جسم سے بننے والا یہ کاجل بھی آنکھوں کی بینائی اور دلکشی بڑھانے والا ہے لہذا تو اسے بیکار سمجھ کر نظر انداز نہ کر اور اپنی آنکھوں میں لگالے۔ عاشق کی خاک کی عزت افزائی یہ ہے کہ وہ کوئے محبوب تک پہنچے۔ اسی طرح عاشق کی راکھ اور اس سے بننے والے کاجل کا اعزاز یہ ہے کہ وہ محبوب کی آنکھوں تک پہنچ جائے کہ یہ بھی وصل کی ایک صورت ہے۔

شعر نمبر ۶:۔ تجھ نیہہ میں دل جل جل جوگی کی لیا صورت یک بار اسے موہن چھاتی سوں لگاتی جا

تشریح: اے محبوب میں تیری جدائی میں جل جل کر جوگیوں کی سی صورت اختیار کر چکا ہوں میرے تمام جسم پر راکھ ہی راکھ ہے اگر تو مجھے ایک بار زمین سے اُٹھا کر اپنے سینے لگالے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے دنیا جہان کی دولت مل گئی۔

دکی کی شاعری کو سمجھتے وقت ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ ایک صوفی شاعر تھے اور انہوں نے اپنی شاعری میں زیادہ تر تصوف کے مضامین باندھے ہیں۔ صوفی شعراء عام طور پر تصوف کی ساری واردات عشق مجازی کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ اسلئے ولی کے ایسے اشارے صرف عشق مجازی کی واردات مراد نہیں لے لینی چاہیے اس شعر میں موہن خدا ہے اور صوفی عاشق ہے۔

۷:۔ تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

تشریح: اے خوبصورت محبوب ولی ہمیشہ تمہارے گھر کی طرف آتا ہے اور تمہارے گھر کا طواف کرتا رہتا ہے۔ اس کی اس سے زیادہ خواہش نہیں کہ ایک نظر تمہیں دیکھ لے۔ بس یہ تمہارے دیدار کا شوق رکھتا ہے لہذا تو مہربانی کر اور اسے ذرا دیر کے لئے اپنا دیدار کرا دے۔

غزل نمبر ۲

حل لغات: سوں ۔ بمعنی سے ؛ تغافل ۔ غفلت برتنا، جان بوجھ کر نظر انداز کرنا ؛ راہ دینا۔

گنجائش پیدا کرنا؛ کف۔ ہتھیلی؛ حنائی۔ مہندی لگا ہوا؛ آرسی۔ شیشہ، پرانے زمانے کا زیور زیور جو انگوٹھے میں پہنا جاتا تھا؛ خودنمائی۔ نمود و نمائش، خود پسندی؛ جبہ سائی۔ ماتھا رگڑنا، سجدہ کرنا؛

شعر نمبر ۱:۔ اب جدائی نہ کر خدا سوں ڈر　　　　بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر!

تشریح: اے محبوب تُو مجھے خود سے جدا نہ کر اور مجھ سے بے وفائی نہ برت۔ کچھ خدا کا خوف کر یعنی اگر تُو مجھ سے بے وفائی کرے گا تو خدا تجھ سے ناراض ہو جائے گا۔

شعر نمبر ۲:۔ مت تغافل کوں راہ دے اے شوخ　　　　جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر!

تشریح: تُو اب تک مجھ پر مہربان رہا ہے لیکن اب تو جان بوجھ کر مجھ سے غفلت برت رہا ہے اور مجھے نظر انداز کر رہا ہے۔ حالانکہ تجھے ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے ساری دنیا ہم پر ہنسے گی کہ کل تک اکٹھے رہنے والے آج ایک دوسرے کو نظر انداز کر رہے ہیں تجھے ایسا کرتے ہوئے خدا سے ڈرنا چاہیے۔

شعر نمبر ۳:۔ ہے جدائی میں زندگی مشکل　　　　آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر

تشریح: اے محبوب میں جانتا ہوں کہ ہجر و فراق کی زندگی سخت مشکل ہے۔ لہٰذا تُو اب میری مشکلات میں اضافہ نہ کر اور آ جا۔ اب جبکہ میں وصال کا عادی ہو گیا ہوں تو تُو جدائی کا سلسلہ پیدا نہ کر اور خدا سے ڈر۔

شعر نمبر ۴:۔ عاشقاں کو شہید کر کے صنم　　　　کف حنائی نہ کر خدا سوں ڈر

تشریح: اے محبوب تُو نے عاشقوں کو قتل کرنے کا شیوہ اختیار کر رکھا ہے اور تو ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ لیکن یہ کام اچھا نہیں ہے۔ بے شک اس سے تیرے ہاتھوں کی دلکشی اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے انسانی جانوں کا ضیاع بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا تجھے لوگوں کو قتل کرتے ہوئے خدا سے ڈرنا چاہیے۔

شعر نمبر ۵:۔ آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرور　　　　خودنمائی نہ کر خدا سوں ڈر

تشریح: اے محبوب تو آرسی دیکھتا ہے اور اس زیور کے آئینے میں تجھے اپنا حسن نظر آتا ہے جس سے تیرے غرور میں اضافہ ہوتا ہے اور تُو اپنے حسن پر اترانے لگتا ہے۔ لیکن یہ خود پسندی اور نمود و نمائش کا رویہ اچھا نہیں ہے۔ اس لئے غرور اور تکبر اللہ کو ناپسند ہے۔ لہٰذا تجھے اپنے حسن پر مغرور نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔ کہ اُسی نے تجھے یہ حسن دیا اور وہ یہ حُسن چھین بھی سکتا ہے۔

شعر نمبر ۶:۔ اے ولی غیر آستانۂ یار　　　　جبہ سائی نہ کر خدا سے ڈر

تشریح | اے ولی اپنے محبوب کے در دولت کے سوا کسی اور دہلیز پر سجدہ کرنا اور ماتھا رگڑنا اچھا نہیں ہوتا۔ لہٰذا تجھے اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

غزل نمبر ۳

حلِ لغات | سدا۔ ہمیشہ ؛ نوبہارِ حسن۔ حُسن کی تازہ اور نئی بہار رکھنے والا یعنی محبوب ؛ ساغر بکف۔ ہاتھ میں جام شراب لئے ہوئے ؛ سخن۔ بات، شاعری ؛ مہر۔ عنایت، مہربانی، محبت ؛ خمار۔ نشہ ٹوٹنے کی کیفیت مے نوش سر میں درد محسوس کرنے لگتا ہے ؛ سوں۔ بمعنی سے ؛ پیتم۔ محبوب ؛ آن۔ لمحہ، وقت ؛ جمیعت۔ اطمینان ؛ ہم خانہ۔ ایک ہی گھر میں رہنے والے یعنی ساتھی، دوست ؛

شعر نمبر ۱:۔ اے دل سدا اس شمع پر پروانہ ہو پروانہ ہو ۔ اس نوبہارِ حسن کا دیوانہ ہو دیوانہ ہو

تشریح | ولی دکنی کہتے ہیں کہ اے دل تجھے ہمیشہ اُس شمع کا پروانہ بنے رہنا چاہیے یعنی ہر وقت اپنے محبوب کے عشق کا دم بھرنا چاہیے اور تجھے ہمہ وقت نئی بہار کی تازگی رکھنے والے حسن کے حامل محبوب کا دیوانہ بنے رہنا چاہیے یعنی کسی بھی حال میں اپنے محبوب سے منہ نہ موڑنا چاہیے۔

شعر نمبر ۲:۔ اے یار گر منظور ہے تجھ آشنائی عشق کی ۔ ہر آشنائے عقل سوں بیگانہ ہو بیگانہ ہو

تشریح | اے دوست اگر تو جذبۂ عشق سے تعلق پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس دنیا میں ایک عاشق کی حیثیت سے جینا چاہتا ہے تو تجھے چاہیے کہ ہر عقل مند سے اپنا تعلق منقطع کرے۔ گویا ولی کہنا چاہتے ہیں کہ عشق اور عقل دو مختلف رویے ہیں اور ان کا ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں۔ ایک طرح یہ وہی بات ہے جسے علامہ اقبال نے زیادہ تفصیل سے عقل و عشق کی آویزش کی صورت میں پیش کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ علامہ کے ہاں عقل و عشق کے معاملے میں توازن پایا جاتا ہے اور اقبال عقل کی اہمیت بھی تسلیم کرتے ہیں جبکہ ولی سمیت تصوف کی روایت سے متاثر ہونے والے تمام شعراء عقل کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہیں۔

شعر نمبر ۳:۔ میری طرف ساغر بکف آتا ہے وہ مست حیا ۔ اے دل تکلف برطرف مستانہ ہو مستانہ ہو

تشریح | اے دل آج محبوب ہم پر مہربان ہے اور وہ خود ہاتھ میں شراب کا پیالہ اٹھائے ہوئے ہماری طرف آ رہا ہے۔ ایسے میں تکلف کرنا درست نہیں۔ لہٰذا شراب پینے سے انکار کرنے کی بجائے ہر طرح کے تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر مست و سرشار ہو جانا چاہیے۔ غالب کہتا ہے:

ـــ جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

شعر نمبر ۴: میرے سخن کوں مہر سے سنتا ہے وہ رنگین ادا — اے سرگزشتِ حالِ دل افسانہ ہو افسانہ ہو

تشریح: آج محبوب مہربان ہے اور اپنی عنایت کی وجہ سے آج وہ میری داستانِ غم سننے پر آمادہ ہے لہٰذا مجھے اُس کی مہربانی سے فائدہ اُٹھا کر اپنی داستان اس انداز میں سنانا چاہیے کہ وہ اُسے اچھی لگے اور وہ اس میں دلچسپی لے تاکہ اسی کی آڑ میں ہم اپنے دل کی بات بھی اُسے سنا سکیں۔ ایسے میں ولی داستانِ دل سے کہتے ہیں کہ آج تجھے افسانہ بن جانا چاہیے۔ افسانے سے مراد ایسی کہانی ہے جس میں سامعین کے لئے دلچسپی ہو اور وہ اسے سننے پر مجبور ہو جائیں۔ سخن، سننا، ادا، سرگزشتِ حال اور افسانہ کے لفظ لطف دے رہے ہیں۔

شعر نمبر ۵: مجھ کوں خمارِ ہجر سوں پیدا ہوا ہے دردِ سر — اے گردشِ چشمِ پری پیمانہ ہو پیمانہ ہو

تشریح: جب کسی شراب پینے والے کو شراب نہ ملے اور اُس پر خمار کی کیفیت طاری ہو جائے تو وہ اپنے سر میں درد محسوس کرنے لگتا ہے اور اس درد کا علاج صرف شراب ہوتی ہے۔ اس پس منظر میں ولی کہتے ہیں کہ مجھ پر ہجر کی کیفیت طاری ہے اور اس میں دردِ سر کی شکایت محسوس کر رہا ہوں جس کا علاج صرف وصالِ محبوب ہے لہٰذا اے محبوب کی آنکھ اب تو میرے لئے شراب کا پیالہ بن جا یعنی اے محبوب اب تو مجھے اپنا دیدار کرا دے تاکہ خمار کی یہ کیفیت ختم ہو سکے۔ شعر میں خمار، چشم اور پیمانہ کے الفاظ استعمال کر کے رعایتِ لفظی پیدا کی گئی ہے۔

شعر نمبر ۶: اس وقت بیتم کی نگہ کرتی ہے مشقِ دلبری — یہ آن غفلت کی نہیں فرزانہ ہو فرزانہ ہو

تشریح: ولی خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اب مجھ پر محبوب مہربان ہے اور اُس کی نگاہیں اپنی محبوبیت کو آزما رہی ہیں۔ لہٰذا یہ لمحہ غفلت اور مدہوشی کا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر تو غافل رہا تو عشق کے امتحان میں ناکام ہو جائے گا اور محبوب کی نظروں سے گر جائے گا۔ لہٰذا کامل ہوشمندی کے ساتھ محبوب کی آزمائش پر پورا اُترنے کی کوشش کر۔

شعر نمبر ۷: عالم میں تجھ کو اے ولی ہے فکرِ جمعیت اگر — ہر دم خیالِ یار سوں ہم خانہ ہو ہم خانہ ہو

تشریح: دنیا میں ہزاروں بکھیڑے انسان کو پریشان کئے رکھتے ہیں جس کی بنا پر کسی کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ ولی کہتے ہیں کہ اے دل اگر تجھے اس دنیا میں سکون اور اطمینان کی دولت چاہیے تو اس کے حصول کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ سب کچھ بھول بھال کر محبوب کے خیال میں گم ہو جا۔ یہ یکسوئی تجھے ہر طرح کی پریشانیوں سے بچائے گی۔

مرزا محمد رفیع سودا

سوانحی حالات

مرزا محمد رفیع نام اور سودا تخلص تھا۔ آپ کے والدِ گرامی مرزا محمد شفیع کابل کے ایک معروف تاجر تھے۔ گھوڑوں کی تجارت کے سلسلے میں شاہجہاں آباد آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ مرزا محمد رفیع سودا شاہجہاں آباد میں ہی پیدا ہوئے اُن کے سِن ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے البتہ ۱۷۱۳ء پر اکثر محققین کا اتفاق ہے۔ آپ کی والدہ اورنگ زیب عالمگیر کے ایک وزیر نعمت خان عالی کی صاحبزادی تھیں۔ سودا نے عربی، فارسی اور دیگر مروجہ علوم علوم کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی لڑکپن میں ہی والدہ کا انتقال ہو گیا اور جو ترکہ وراثت میں ملا وہ دوستوں کی رنگین صحبتوں اور بزم آرائیوں کی نذر ہو گیا۔ اُس کے بعد نوکر پیشہ ہو گئے اور امراء کی مصاحبت میں عمر گزاری۔ سودا کی شاعری کا چرچا جوانی میں ہی علمی و ادبی حلقوں میں ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد مغل بادشاہ شاہ عالم کے کلام کی اصلاح بھی کی اور اس طرح اُن کا شمار اساتذہ میں ہونے لگا۔ مخالفین اگرچہ انہیں مردِ کم علم کہا کرتے تھے مگر اکثر ناقدین نے اُن کے وسعتِ علم کا اعتراف کیا ہے۔ مگر یہ وہ دور تھا جب جاٹوں، روہیل کھنڈیوں، بیرونی حملہ آوروں اور مرہٹوں کے ہاتھوں شہر دہلی قتل و غارت گری انتشار اور افراتفری کا مرکز بن چکا تھا۔ اہل ثروت کے ساتھ اہل علم اور اہل فن کے لئے بھی عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا اور ہر کوئی اپنی عزت و ناموس کے تحفظ کے لئے دہلی کو خیر آباد کہہ رہا تھا۔ سودا کو بھی مجبوراً دہلی چھوڑنا پڑی اور ساٹھ سال کی عمر میں وہ فرخ آباد پہنچے جہاں دہلی کی طرح انھیں عزت و احترام سے نوازا گیا۔ مگر نواب فرخ آباد کے انتقال کے بعد انھیں پھر رختِ سفر باندھنا پڑا اور سودا لکھنؤ آ کر نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے نواب آصف الدولہ نے انھیں ملک الشعراء کا خطاب دیا اور چھ ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا، سودا نے آخری زندگی کے دن لکھنؤ میں بسر کیے۔ آخری عمر مالی آسودگی اور فارغ البالی سے گزری اور ۱۷۸۱ء میں انتقال کیا اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔

محاسنِ کلام

مرزا سودا نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے خاص طور پر غزل، قصیدہ، مرثیہ، ہجو اور شہر آشوب میں اپنی شاعرانہ عظمت اور قادر الکلامی کا لوہا منوایا۔ بعض نقاد انھیں صرف قصیدے کا مردِ میدان قرار دیتے ہوئے اُن کی غزل کو اہمیت نہیں دیتے۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ غزل پر بھی قصیدے کا رنگ چڑھا دیتے ہیں اور اُن کی غزل میں سادگی، سوز و گداز اور تغزل کا فقدان ہے یہ اعتراض دراصل اُن کی غزل کے میر کی غزل سے تقابل کا نتیجہ ہے ورنہ سودا کی غزل

اپنی انفرادیت کے اعتبار سے اُن کی وسعتِ نظری، ندرتِ بیاں اور مضامین کی رنگا رنگی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ سوداؔ نے ہندی الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے عربی اور فارسی تراکیب کا استعمال کر کے اردو شاعری میں نہ صرف گہرائی اور لطافت پیدا کی بلکہ اردو کے دامن کو وسعت اور فراخی کی صفات سے ہمکنار کیا۔

شگفتگی و معنیٰ آفرینی سوداؔ کی زندگی کا بیشتر حصّہ مالی آسودگی اور فارغ البالی میں گزرا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مزاج میں شوخی و شرارت، خوش مزاجی و خوش بیانی اور شگفتگی و بذلہ سنجی حد درجہ تھی اور ان کے کلام میں سوز و گداز کی کمی کا سبب بھی یہی ہے۔ دوسری طرف طبعی شگفتگی اور معنیٰ آفرینی کی بدولت اُن کی غزل میں قصیدے کا لب و لہجہ، قادر الکلامی اور قدرتِ فن کی صفات نمایاں ہو گئی ہیں۔

~ سوداؔ جو تیرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ	کیا جانیئے تُو نے اُسے کس آن میں دیکھا
~ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں	تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں
~ ٹوٹے تری نگاہ سے اگر دل حباب کا	پانی بھی پھر پئیں تو مزہ ہو شراب کا

خارجیت اور تمثیل نگاری سوداؔ کی شاعری کی ایک بڑی خوبی اس کی خارجیت اور تمثیل نگاری ہے۔ جو اُن کی آسودہ حال زندگی کا تقاضہ اور ردِّ عمل قرار دی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں محرومیوں کے شکار میرؔ کے ہاں داخلیت اور دلی کیفیات کی ترجمانی ہو ملتی ہے وہاں سوداؔ کے ہاں خارجیت، خیالی عشق اور تمثیل نگاری کے نہایت اعلیٰ اشعار ملتے ہیں اور یہی بنیادی فرق ہے جس کی بدولت کہا جاتا ہے کہ میرؔ کا کلام اگر آہ ہے تو سوداؔ کا کلام واہ ہے۔

~ اُس مرغِ ناتواں کی صیاد کچھ خبر ہے	جو چھوٹ کر قفس سے گلزار تک نہ پہنچا
~ فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں	دو دن کی زندگی میں بھلا کیا کرے کوئی
~ گل پھینکے ہے اوروں کی طرف، بلکہ ثمر بھی	اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

شوکتِ الفاظ سوداؔ کی شاعری کا لب و لہجہ، اس کی گھن گھرج اور بلند آہنگی کی بڑی وجہ اُن کی قدرتِ بیان کے ساتھ ساتھ اُن کے عربی اور فارسی کے بلند آہنگ الفاظ و ترکیب کے انتخاب کا سلیقہ ہے۔ اُن کی غزلیں، قصیدے اور ہجویں شوکتِ الفاظ کے مظہر ہیں اور پھر انھیں نئی تراکیب وضع کرنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ البتہ کبھی کبھی اُن کا حد سے بڑھا ہوا یہ شوق اُن کے شعری لب و لہجہ کو ضرور متاثر کرتا ہے۔

~ جوششِ دریائے خوں، ہنگامۂ سوز و فغاں۔	دیدۂ تر، سینۂ صد چاک سے کیا کیا ہوا

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں ۔۔۔ کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

گریاں بشکلِ شیشہ و خنداں بطرزِ جام ۔۔۔ اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں

دنیا کی بے ثباتی کے مضامین

سودا کا زمانہ انتہائی پُرآشوب اور بدحالی کا زمانہ تھا۔ مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ دہلی کی غارت گری کے نتیجے میں امراء و شرفا کی امارت و شرافت کی بساط الٹ چکی تھی۔ ہر کوئی اپنی عزت و ناموس کو خطرے میں محسوس کرتا تھا۔ اس عالمِ بیچارگی و بدحالی کو سودا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اجڑتی ہوئی، لٹتی ہوئی دنیا کے اس بے ثبات پہلو نے اُس کے حساس دل کو متاثر کیا اور اس طرح دنیا کی بے ثباتی اور حالات کی بے اعتباری کے مضامین اُن کی شاعری میں اعلیٰ نمونے بن گئے۔

۱۔ اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن ۔۔۔ جب آنکھ کھُلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

۲۔ تم کو معلوم ہے یاروچمن قدرت میں ۔۔۔ عمر گزری کہ ہے گردش سے سروکار مجھے

۳۔ ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ ۔۔۔ دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

سودا کی قصیدہ نگاری

سودا بلاشبہ قصیدے کے مردِ میدان تھے۔ اپنی طبعی مناسبت کی بدولت سودا کو اردو قصیدہ میں وہی مقام حاصل ہے جو فارسی قصیدہ میں خاقانی و انوری کو حاصل ہے۔ قصیدہ نگاری میں جس شکوہِ الفاظ و تراکیب اور شوکتِ بیاں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سودا کی کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھی یہی وجہ ہے کہ قصیدے کی پیچیدہ اور مشکل صنفِ سخن میں سودا کی طبع رسا نے جس حسن و خوبی اور کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے وہ اردو قصیدے میں اپنی مثال آپ ہے۔ بعد میں بھی ذوقؔ کے سوا کوئی شاعر آنکی قصیدہ گوئی کے مقام بلند تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں فرماتے ہیں۔

۱۔ سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک ۔۔۔ دیکھ کر باغ جہاں میں کرمِ عزّوجل

۲۔ واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ ۔۔۔ آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل!

۳۔ عکسِ گلبن یہ زمین پر ہے کہ جس کے آگے ۔۔۔ کارِ نقاشیِ مانی ہے دوُم وہ اوّل

جذبات نگاری اور روایتی مضامین

جہاں تک زبان و فن کا تعلق ہے سوداؔ کی قدرت مسلّمہ ہی نہیں بلکہ اردو شاعری میں بے مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جذبات نگاری اور روایتی مضامین میں بھی یکتا نظر آتے ہیں۔ غزل کے اعتبار سے اگرچہ سودا کا اپنا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے۔ پھر بھی اُن کے اشعار میں کبھی کبھی روایتی مضامین کچھ اس حسن و خوبی سے ڈھل جاتے ہیں کہ داد دیئے بغیر چارہ نظر نہیں آتا۔

۱۔ کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ۔۔۔ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

۲۔ سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ ۔۔۔ کیا جانیے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

۶ قیس اور فرہاد و وامق پر جو گذرا سو سنا ۔ مجھ پر دیکھو اس بتِ بے باک سے کیا کیا ہوا

سودا کی قادر الکلامی سودا اردو کے دورِ اوّل کے ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ انھیں جہاں الفاظ و تراکیب کے حسنِ انتخاب کا ملکہ حاصل ہے وہاں زبان و بیان کے تمام قرینوں پر بھی پوری دسترس حاصل ہے۔ اُن کے قصائد اُن کی فنی پختگی اور قادر الکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اُن کے قصائد حسنِ لفظی اور حسنِ معانی کی لطافتوں کا خوبصورت امتزاج ہیں۔ ایک قصیدے سے نمونہ ملاحظہ ہو۔

۱ کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی ۔ کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی

۲ ہے نرگسِ شہلانے دیا آنکھ کو کاجل ! ۔ برگِ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

۳ کیا ساغرِ رنگین کو کیا جلد مہیا ۔ نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی

۴ میں نے درِ سخن کو دیا ہنگ رنگ ڈھنگ ۔ تھا ورنہ اس رقم میں کب اس انگ انگ ڈھنگ

۵ یاد و مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک ۔ میں کتاں بلبل و پروانہ یہ ہم چاروں ایک

نعتیہ قصیدہ

تعارف سودا بہت اچھے غزل گو بھی تھے لیکن اُن کا اختصاص اردو قصیدے کی وجہ سے ہے۔ مرزا سودا کے چالیس سے زائد قصائد ملتے ہیں جو کسی بھی دوسرے اردو قصیدہ گو شاعر کے قصیدوں سے زیادہ ہیں۔ صرف قصائد ہی نہیں بلکہ سودا کے ممدوحین کی تعداد بھی زیادہ ہے سودا مختلف درباروں سے وابستہ رہے لیکن انہوں نے مختلف امراء کے علاوہ مذہبی شخصیات کی شان میں بھی قصیدے لکھے۔ زیرِ نظر قصیدہ نعتیہ قصیدہ ہے۔ یعنی قصیدے کے فنی اجزا کو برقرار رکھتے ہوئے آنحضرتؐ کی نعت کہی گئی ہے اور اس سے سودا کے عشقِ رسولؐ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نصاب میں قصیدے کے منتخب حصے شامل کئے گئے ہیں لیکن ان منتخب حصوں میں بھی قصیدے کے تمام فنی اجزا یعنی مطلع، تشبیب، گریز یا مخلص، مدح اور دعا و مقطع موجود ہیں۔

حلِ لغات ثابت۔ مکمل، مضبوط، پائیدار، مستند، مستقل ؛ تمغا۔ عزت کا نشان، باعث فخر ؛ زنار۔ وہ دھاگا جو ہندو لوگ اپنے گلے میں ڈالتے ہیں ؛ سلیمانی۔ ایک پتھر جس میں سفید و سیاہ دونوں رنگ ہوتے ہیں ؛ جوہر۔ ہنر، لیاقت، کمال ؛ ننگ۔ شرمندہ بدنامی ؛ زر۔ سونا، دولت ؛ پریشانی۔ بکھرنا ؛ بیش۔ زیادہ ؛ مساوی۔ برابر ؛ کلفت۔ حیب تکلیف ؛ مرد۔ بہادر اور شریف آدمی ؛ مرغ۔ پرندہ ؛ ناسزا۔ نامناسب، نازیبا ؛ بدگو

برائیاں کرنے والا ؛ دہر۔ زمانہ ، دنیا ؛ تیرہ روزی ۔ بدبختی ، بدقسمتی ؛ عجب ۔ انوکھا ، نادر ، تعجب کی بات ؛ بال ۔ پر ؛ ہما ۔ ایک تصوراتی پرندہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جس کے سر پر سے یہ پرندہ گزر جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے ؛ مگس رانی ۔ پنکھا ہلانے کی خدمت ، مکھیاں اڑانے سے متعلق خدمت ؛ عدم ۔ نیستی ، ناپائیداری ، ختم ہونا ؛ روسیاہی ۔ تیرگی ، کالک ، تاریکی ؛ بدنامی ۔ بدقسمتی ؛ جمعیت ، اطمینان ۔ تسلی ؛ کار ۔ کام ؛ بستہ ۔ بندھا ہوا ؛ کاہیدہ ۔ کمزور ، لاغر ، دُبلا ؛ امل ۔ امید ، توقع ؛ نمط ۔ طریقہ ، ڈھنگ ، طرح ؛ صعب ۔ تکلیف ، ناگواری ؛ صنم ۔ بت ؛ زہے ۔ کلمۂ تحسین جیسے شاباش وغیرہ ؛ ملک ۔ فرشتے ؛ شفیع ۔ شفاعت کرنے والا ۔ گناہوں کی بخشش کے لئے سفارش کرنے والا ؛ لعل رمانی ۔ انار جیسے رنگ کا قیمتی پتھر ؛ شبان ۔ چرواہے ؛ گرگ ۔ بھیڑیا ؛ معمور ۔ بھرا ہوا ؛ معاذاللہ ۔ اللہ معاف کرے ؛ مردود ۔ رد کیا ہوا ، راندۂ درگاہ ؛ مہر ۔ سورج ؛ الوہیت ۔ خدا سے تعلق رکھنے والی چیز ، خدائی شان ؛ کنعان ۔ فلسطین کے ایک علاقے کا نام جہاں حضرت یوسفؑ پیدا ہوئے تھے ؛ لاریب ۔ قرآنی لفظ معنی ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ، بلاشبہ ؛ حدیث من رانی ۔ آنحضرتؐ کی ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اُس نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ؛ ثانی ۔ دوسرا ، برابر کا ، مثال ، نظیر ؛ استغفار ۔ مغفرت چاہنا ، بخشش کے لئے دُعا ؛

شعر نمبر ۱ ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی — نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

تشریح قصیدے کے مطلع میں سودا کہتے ہیں کہ اصل چیز استقلال اور پائیداری ہے ۔ بالفرض ایک آدمی کفر اور اپنے غلط عقائد پر بھی مستقل مزاجی کے ساتھ جما ہوا ہے تو یہ بات اُس کے لئے بجائے خود عزت کا نشان ہے اور یہ کافر ایک غیر مستقل مزاج مسلمان سے بہتر ہے ۔ سودا کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ زنار یعنی ہندوؤں کا گلے میں پہننے والا دھاگہ شیخ یعنی مسلمانوں کی تسبیح میں بھی موجود ہے ۔ یعنی یہی دھاگہ ایک جگہ علامتِ کفر ہے اور دوسری جگہ اسلام کا نشان ۔ گویا کسی مذہب اور موقف پر استقلال کے ساتھ جما رہنا اصل حقیقت ہے ۔ اسی مضمون کو مرزا غالب نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شعر نمبر ۲ ہنر پیدا کر اول ترک کیجو تب لباس اپنا — نہ ہو جوں تیغ بے جوہر دگر ننگ عریانی

تشریح سودا کہتے ہیں کہ پہلے اپنے اندر کوئی کمال ، لیاقت اور جوہر پیدا کر ۔ اس کے بعد لوگوں کے سامنے نمایاں ہو ۔ تاکہ تمہارے کمال کے سبب تمہاری عزت و توقیر کر سکیں ۔ اگر تم بغیر کوئی کمال حاصل کئے لوگوں کے سامنے آؤ گے تو تمہاری مثال اُس زنگ آلود تلوار جیسی ہو گی جس کے

لئے نیام سے باہر آنا شرمندگی اور ندامت کا سبب بنتا ہے۔ یعنی کسی کمال کے بغیر لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرنا آخر کار ذلت و رسوائی کا سبب بنتا ہے۔

شعر نمبر ۳: فراہم زر کا کرنا باعث اندوہ دل ہووے — نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی

تشریح: سودا کا خیال ہے کہ اگر ایک آدمی مات دن دولت جمع کرنا رہے تو یہ بات بالآخر اس کے لئے غم کا باعث بنے گی۔ جیسا کہ ایک غنچہ بے شمار پتیاں اکٹھی کرتا ہے اُسکی خواہش ہوتی ہے کہ اس اجتماع سے وہ عزت و توقیر پائے لیکن آخر کار یہ ساری پتیاں مرجھا کر بکھر جاتی ہیں اور غنچے کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ اس شعر میں جمع اور پریشانی میں تضاد ہے جبکہ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ زر کے معنی سونا کے بھی ہیں جو دولت مندی کی علامت ہے اور زر، اُس زرد زیرے کو بھی کہا جاتا ہے جو پھول میں ہوتا ہے اور جسے زرِ گل کہا جاتا ہے گویا سودا کے نزدیک لوگ اس لئے پریشانیاں اُٹھاتے ہیں کہ وہ دولت جمع کرتے ہیں اور پھول اس لئے بکھرتے ہیں کہ ان کے اندر زرِ گل ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۴: خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی — نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں شاہوں کی پیشانی

تشریح: سودا کہتے ہیں کہ اہل دولت کے گرد بالعموم جھوٹی تعریفیں کرنے والے خوشامدی جمع ہو جاتے ہیں اور خوشامدی لوگ ہمیشہ دوں فطرت اور کمینے ہوتے ہیں۔ بلند طبع اور عالی ہمت لوگ ایسا نہیں کرتے۔ دراصل وہ طبعاً ایسا کر ہی نہیں سکتے مثلاً کہکشاں کو دیکھیئے کہ چونکہ وہ بہت بلند ہے لہذا بادشاہوں تک کی پیشانی پر لگا ہوا گرد و غبار تک صاف کرنے کے لئے بھی اپنی آستین کو آلودہ نہیں کرتی یعنی عالی طبع لوگوں سے معمولی خوشامد کی توقع بھی نہیں رکھنا چاہئے۔

شعر نمبر ۵: عروجِ دستِ ہمت کو نہیں ہے فکر بیش و کم — صدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زرافشانی

تشریح: اگر ایک انسان بلند ہمت ہے تو اُسے صلے میں زیادہ اور کم ملنے کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اِن چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ خود کو ان میں ملوث کرتا ہے مثال کے طور پر سورج کو دیکھیں چونکہ وہ بلند ہمت ہے لہذا بہتر اور کمتر میں امتیاز کئے بغیر اپنی سنہری دھوپ اور روشنی سے سب کو فیض یاب کرتا ہے اگر سورج دوں ہمت ہوتا اور اُسے کم یا زیادہ صلے کی پرواہ ہوتی تو یقیناً وہ اپنی روشنی اور حرارت میں اعلیٰ و کمتر کا فرق قائم رکھتا۔

شعر نمبر ۶: کرے ہے کلفتِ ایام ضائع قدر مردوں کی — ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی

تشریح: مرزا سودا کہتے ہیں کہ گردشِ ایام اور دنوں کے الٹ پھیر کی وجہ سے انسان جس مصیبت اور تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے اس سے اس کی قدر و قیمت میں فرق آجاتا ہے اور لوگ اسے حقیر و ذلیل سمجھنے لگتے ہیں۔ سودا نے یہ عام معاشرتی سچائی ایک مثال کے ذریعے واضح کی ہے۔ وہ

کہتے ہیں کہ تلوار خواہ کتنی ہی اچھی ہو لیکن اگر زنگ آلود ہو جائے تو پھر اِسے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کتنے معرکے سر کئے؟ کتنے سروں کو تن سے جدا کیا؟ یہ کہاں بنی اور کس قسم کے فولاد سے تیار ہوئی؟ غرض ایسی تلوار اپنی تمام شناختیں کھو دیتی ہے۔ اسی طرح مصیبت زدہ شخص بھی اپنی عزت و حرمت کھو بیٹھتا ہے۔

شعر نمبر ۷:۔ اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا۔ ہوئی ہے فیضِ تنہائی سے عمرِ خضر طولانی

تشریح: مرزا سودا مشورہ دیتے ہیں کہ اگر انسان اِس دنیا میں بہت لمبی عمر پانا چاہتا ہے تو اُسے تنہا جینا چاہیے کیونکہ حضرت خضرؑ کو بھی اِسی لئے لمبی عمر ملی ہے کہ وہ اپنی زندگی تنہا گزار رہے ہیں۔ بظاہر تو یہ محض ایک شاعرانہ نکتہ ہے لیکن غور کیا جائے تو سودا کے اس شعر کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ انسان جتنے لوگوں میں گھرا ہوا ہو اور اس کے تعلقات و روابط کا دائرہ جس قدر وسیع ہو اُسے اُسی قدر غم اٹھانے پڑتے ہیں اور یہ بات طے شدہ ہے کہ غم انسان کے اعضاء کو کمزور کرتا اور اُنکی عمر کم کر دیتا ہے۔ کوئی شخص جس قدر تنہا ہو گا اُس کے غم اتنے ہی کم ہوں گے اور وہ نسبتاً طویل عمر پائے گا۔

شعر نمبر ۸:۔ اذیت وصل میں دونی جدائی سے ہے عاشق کو۔ بہت رہتا ہے نالاں فصلِ گل میں مرغِ بستانی

تشریح: سودا کہتے ہیں کہ عاشقوں کو ہجر میں تو تکلیف ہوتی ہی ہے لیکن ہجر کے مقابلے میں وصل میں عاشقوں کی تکلیف دو گنا ہو جاتی ہے اور انہیں زیادہ مصیبت خیز صورتِ حال سے گزرنا پڑتا ہے۔ سودا اپنے اس دعوے کے ثبوت میں گلستان میں رہنے والے پرندے کی کیفیت پیش کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اس پرندے کو موسمِ بہار میں زیادہ تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس موسم میں پھولوں سے محبت کرنے والے پرندے کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے اس لئے کہ اس کی بے تابی اور اضطراب بڑھ جاتا ہے۔

شعر نمبر ۹:۔ برنگِ کوہ رہ خاموش حرفِ ناسزا سن کر۔ کہ تا بدگو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی

تشریح: سودا ایک اخلاقی مسئلہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گالی کے جواب میں گالی دینا بہت آسان ہے۔ لیکن زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہیں برے لفظوں میں یاد کرتا ہے تو غصہ کھانے کی بجائے پہاڑ کی صورت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی جائے۔ اس صبر کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ خود مکافاتِ عمل اور اللہ تعالیٰ کے نظام کا شکار ہو کر مشکلات و مصائب میں مبتلا ہو گا اور تم بھی منتقم مزاج اور کم ظرف کہلانے سے بچ جاؤ گے۔

شعر نمبر ۱۰:۔ کرے ہے زینت ظالموں پر تیرہ روزی کر۔ کہ زیبِ ترکِ چشمِ یار سرمہ ہے صفاہانی

تشریح: سودا پہلے شعر کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ قدرت نے ایسا انتظام کر رکھا

ہے کہ ظلم کرنے والا بالآخر اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ بدنام و رسوا ہوتا ہے اور اس کا چہرہ کالا ہو جاتا ہے۔ واضح ہو کہ چہرے کا سیاہ ہونا بجائے خود بدنامی، رسوائی اور سزا کا استعارہ ہے۔ بعض مقامات پر اب بھی مجرموں کے لئے بدترین سزا ہوتی ہے کہ اُن کا منہ کالا کر کے انہیں شہر میں گھمایا جاتا ہے۔ بہرحال سودا کہتے ہیں کہ قدرت کے اس مکافاتی نظام کا ثبوت یہ ہے کہ محبوب کی قاتل و شوخ آنکھیں عاشقوں پر ظلم ڈھاتی ہیں نتیجتہً انہیں سر سے سیاہ کر دیا جاتا ہے اور یوں وہ اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔ اس شعر میں صنعتِ حسن تعلیل ہے۔

شعر نمبر ۱۱: طلوعِ مہر ہو پامال حسرت آسمان اوپر ‏ ‏ ‏ لکھوں گا پھر غزل گر اس زمیں میں مطلع ثانی

تشریح سودا شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر میں اس قصیدے کی زمین یعنی ردیف، قافیے اور بحر کی پابندی کرتے ہوئے غزل کے لئے دوسرا مطلع کہوں تو آسمان پر سورج کا نکلنا حسرتوں اور پوری نہ ہونے والی تمناؤں کی وجہ سے روندا جائے۔ طلوعِ مہر کے لئے پامال ہونے کا خیال غالباً اس لئے نظم کیا گیا کہ اپنے تمام کر و فر کے باوجود سورج کے لئے ایک بار طلوع ہونے کے بعد دوسری دفعہ طلوع ہونا ناممکن ہے جبکہ شاعر اپنے قصیدے میں سنگلاخ زمین ہونے کے باوجود دوسرا مطلع لانے پر قادر ہے۔

شعر نمبر ۱۲: عجب ناداں ہیں جن کو ہے عجب تاجِ سلطانی ‏ ‏ ‏ فلک بالِ ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

تشریح مرزا سودا قصیدے میں شامل غزل کے قطع میں کہتے ہیں کہ وہ لوگ انتہائی احمق اور اسرار و رموزِ حیات سے بالکل بے بہرہ ہیں جن کے نزدیک بادشاہی تخت و تاج اور اُن کا حصول کوئی انوکھا کارنامہ ہے۔ یعنی سودا کے نزدیک یہ ایسی بات نہیں ہے جس پر حیرت کا اظہار کیا جائے۔ اس لئے کہ ہم اپنے گرد و پیش میں دن رات دیکھتے ہیں کہ آسمان یعنی تقدیر ذرا سی دیر میں بڑے بڑے انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ مثلاً ہما کے پر جو بادشاہوں کے لائق ہوتے ہیں اور جن کا اصل مقام تاجِ شاہی ہے، ایک لمحے میں مکھیاں اڑانے کی نہایت ذلت آمیز خدمت پر مامور کر دیئے جاتے ہیں۔ یعنی قسمت کی خرابی سے اعلیٰ لوگ ادنیٰ اور ادنیٰ اعلیٰ ہو جاتے ہیں اور اس پر حیرت کے اظہار کا کوئی موقع نہیں۔

شعر نمبر ۱۳: نہیں معلوم اُس نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا ‏ ‏ ‏ کہ چشم نقشِ پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی

تشریح حیرت کا لازمی نتیجہ انسان کا ساکت و صامت اور بے حرکت ہو جاتا ہے۔ انسان کوئی انتہائی حیران کن منظر دیکھ لے تو آنکھوں کی پتلی تک حرکت کرنے سے عاجز آجاتی ہے اور زمین پر لگنے والے قدموں کا نشان بے حرکت ہے یعنی حیران ہے اور حیران بھی ایسا کہ جب تک وہ مٹ نہ جائے اُس وقت تک اس کی حیرت ختم نہیں ہوتی۔ آخر کیوں؟ اس نے کونسا ایسا منظر دیکھ لیا ہے؟ سودا

کہتے ہیں کہ آج تک نہ جانے کیسی کیسی ہستیاں خاک میں مل گئیں اور خاک میں ملنے سے مراد مرنا، تباہ برباد ہونا اور ذلیل و خوار ہونا ہے۔ لہٰذا یہ نقشِ کف پا ان عظیم الشان لوگوں کی ذلت و خواری اور تباہی و موت کا مشاہدہ کر کے حیران ہے۔

شعر نمبر ۱۴: ہماری آہ تیرا دل نہ نرماوے تو یا قسمت ۔ وگرنہ دیکھ آئینے کہ پتھر ہو گئے پانی

تشریح: اے محبوب اگر ہماری آہ و فریاد اور نالہ و زاری سے تیرا دل نرم نہیں ہوتا اور تو ہم پر مہربانی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تو ہم اپنی آہوں کی نارسائی اور تیری سنگدلی کا شکوہ نہیں کریں گے بلکہ اسے اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لیں گے۔ ہم سمجھیں گے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ تو ہم پر مہربان نہ ہو ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر تو آئینہ دیکھے تو تجھے پتہ چل جائے گا کہ یہ پتھر تھا جو ہماری آہوں کی تاثیر سے پگھل گیا اور صاف و شفاف ہو کر آئینہ بن گیا۔ یعنی محبوب کا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے کہ آہوں سے پتھر تو پگھل گیا لیکن محبوب کا دل نرم نہ ہوا۔ شعر میں نرم ہونا، آئینہ، پتھر اور پانی وغیرہ میں تضاد و رعایتِ لفظی ہے۔

شعر نمبر ۱۵: تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا ۔ کہ ہے جمعیتِ خاطر مجھے اُن کی پریشانی

تشریح: اے محبوب میں تیری زلفوں کے سامنے اپنی بدبختی اور بدقسمتی کا احوال بیان نہیں کر سکتا۔ بس میرے دل کو یہ اطمینان ہے کہ اگر تیری زلفوں نے میرے دل کو گرفتار کیا تو وہ بھی بکھری ہوئی ہیں۔ واضح رہے کہ زلفوں کی پریشانی اور بالوں کا بکھرنا بجائے خود مصیبت زدگی کی علامت ہے یعنی اگر میں تیری وجہ سے پریشان ہوں تو تجھے بھی آرام و سکون نہیں۔ غالب کہتے ہیں ۔

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا ۔ بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی دادیاں

شعر نمبر ۱۶: زمانے میں نہیں کھلتا ہے کار بستہ حیراں ہوں ۔ گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیونکر با آسانی

تشریح: مرزا سودا کہتے ہیں کہ میرے جس قدر کام رکے ہوئے ہیں اُن کے پورا ہونے کی امید نہیں اور اس سلسلے میں تھوڑی بہت قوت و طاقت رکھنے کے باوجود میری تمام کوششیں لاحاصل اور بے نتیجہ ہیں جبکہ میں اس بات پر حیران ہوں کہ مجھ سے تو اپنا فرض بھی ادا نہیں ہوتا اور صبا جیسی نازک شے نہایت آسانی سے غنچوں کو کھلا کر پھول بنا دیتی ہے۔ واضح ہو کہ اکثر شعرا غنچہ کو گرہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

شعر نمبر ۱۷: جنوں کے ہاتھ سے سر تا قدم کا ہیدہ اتنا ہوں ۔ کہ اعضاء دیدۂ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی

تشریح: مرزا سودا کہتے ہیں کہ عشق کی بدولت پیدا ہونے والی شدید دیوانگی کے باعث میں اس قدر دبلا پتلا ہو گیا ہوں کہ جنوں کے باعث مجھے آوارہ گردی اور صحرا نوردی سے روکنے

کہنے جس زنجیر سے باندھا گیا ہے، اگر اُس کی مختلف کڑیوں کو آنکھیں فرض کر لیا جائے تو میرے مختلف اعضاء اُن میں پلکوں کی صورت نظر آئیں گے۔ گویا مرزا سودا نے اپنے جسم کے مختلف اعضاء کو پلکوں سے تشبیہ دے کر اپنا دُبلا پن ظاہر کیا ہے۔

شعر نمبر ۱۸: بسنہ بختی میں اے سودا نہیں طولِ امل لازم   قلم خامے کے سر کٹواتے گی ایسی زباں دانی

تشریح: سودا خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے سودا تو اپنی گفتگو کو بڑھا رہا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہاری امیدوں اور تمناؤں کا سلسلہ دراز ہے۔ یعنی جو شخص جس قدر پانے اور حاصل کرنے کا خواہاں ہے اُسے اسی قدر تفصیل سے کام لے کر اپنا مدعا بیان کرنا پڑتا ہے اور اسی تفصیل سے اُس کی امنگوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سودا کہتے ہیں کہ بے شک یہ طولِ کلام حصولِ آرزو میں معاون ہو سکتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ قلم کو زبان درازی کی سزا ملتی ہے اور قلم کا سر کاٹ دیا جاتا ہے۔ یعنی اگر تم زیادہ گفتگو کرو گے تو تمہارا بھی سر قلم کر دیا جائے گا۔ اس شعر میں سر کٹنے کی قلم کا ذکر ہے جسے ضروری حد تک تراش کر قطع کر دیا جاتا ہے۔ اس عمل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر نے معنی آفرینی کی اور شعر میں حسنِ تعلیل کا حسن پیدا ہو گیا۔

شعر نمبر ۱۹: خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے   نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی

تشریح: سودا کہتے ہیں کہ اے سودا تو نے غزل چھیڑ رکھی ہے اور اس طرح حسین لوگوں سے ملنے کی راہ نکالی ہے تجھے چاہیے کہ تو اپنے اس انداز اور خوبصورت لوگوں سے ملنے کو ترک کر دے۔ اس لئے کہ ان ملاقاتوں اور تعلقات و روابط کے نتیجے میں آخر کار ندامت اور شرمندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

شعر نمبر ۲۰: نظر رکھنے سے حاصل اُس کی چشم و زلف کے اوپر   مگر بیمار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی

تشریح: اور ویسے بھی حسین و خوبصورت لوگوں کی آنکھوں اور زلفوں کا عاشق ہو کر اور انھیں اپنی توجہ کا مرکز بنا کر انسان کو کیا ملتا ہے؟ سوائے اس کے کہ انسان بیمار ہو جائے یا تکلیف اور مصیبت میں مبتلا ہو۔ یہ شعر لف و نشر مرتب کی اچھی مثال ہے

شعر نمبر ۲۱: نکال اس کفر کو دل سے کہ اب یہ وقت آیا ہے   برہمن کو صنم کرتا ہے تلقینِ مسلمانی

تشریح: مرزا سودا کہتے ہیں کہ عشق و عاشقی اور حسن پرستی کی باتیں دراصل کفر کی باتیں ہیں اور تمہیں چاہیے کہ اب انھیں اپنے دل سے نکال باہر کرے اس لئے کہ آج کل تو بطور خاص ایسا وقت آ گیا ہے کہ برہمن یعنی کافروں اور ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کو خود اُن کے اپنے بت مسلمان ہونے کی تلقین کرنے لگے ہیں یعنی کفر کے لئے کہیں بھی جگہ باقی نہیں رہی اور کافروں کے بت خود اسلام کی حقانیت اور سچائی بیان کرنے لگے ہیں۔

شعر نمبر ۲۲: رہے ہے دین محمدؐ ہمیر دی میں اس کی جو بودیں   رہے ہے خاکِ قدم سے اُس کی چشمِ عرش نورانی

تشریح: مرزا سودا دینِ اسلام کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایسا دین ہے کہ جو شخص بھی اس کا مقلد اور پیروکار ہوگا اور جو بھی اسے قبول کرے گا، اُس کے قدموں کی مٹی سے عرش کی آنکھیں روشن ہوں گی۔ یعنی نہ صرف خاکی ہونے کے باوجود اُسے افلاک اور عرش معلٰی کی معراج حاصل ہو گی بلکہ افلاک اور عرش اسی کی خاکِ پا کو اپنی آنکھوں کے لئے سُرمہ تصور کریں گے۔ یہ واضح طور پر معراج النبیؐ کی طرف اشارہ ہے۔

شعر نمبر ۲۳: ملک سجدہ نہ کرتے آدمِ خاکی کو گر اس کی — امانت دار نورِ احمدی ہوتی نہ پیشانی

تشریح: مرزا سودا قرآن مجید میں مذکورہ ایک واقعہ کا حوالہ دیتے ہوتے کہتے ہیں کہ بے شک اللہ کے حکم پر ابلیس کے سوا تمام فرشتوں نے انسان کو سجدہ کیا اور اس کی عظمت کو تسلیم کیا لیکن کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ فرشتوں نے یہ سجدہ کیوں کیا؟ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ فرشتے نور سے اور انسان مٹی سے بنا ہوا ہے اور سجدہ کرنے کے لائق نہیں ہے۔ دراصل ان فرشتوں نے انسان کی پیشانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ مبارک دیکھ لیا تھا۔ یعنی فرشتوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ہستی جو وجہِ تخلیقِ کائنات ہے اور خدا کے بعد اس کائنات میں سب سے اعلیٰ وارفع اور بزرگ و برتر ہے، دنیا میں انسانی شکل و صورت میں جلوہ گر ہو گی۔ لہذا فرشتوں نے عام خاکی انسان کی بجائے آنحضرتؐ کے نور کو سجدہ کیا۔

شعر نمبر ۲۴: خیالِ خلق اس کا گر شفیع کا فراں ہووے — رکھیں بخشش کے سر منت یہودی اور نصرانی

تشریح: سودا کہتے ہیں کہ بے شک قیامت کے دن آنحضرتؐ صرف مسلمانوں اور مومنوں کی شفاعت فرمائیں گے لیکن اگر مخلوقِ خدا کا خیال کرتے ہوئے وہ کافروں کے گناہ معاف کرنے کے لئے بھی بارگاہِ ایزدی میں سفارش کرنا چاہیں تو یقیناً یہودی اور نصرانی سب کے سب بخشے جائیں گے اور یہ لوگ جو آج اسلام قبول نہیں کرتے قیامت کے دن آپؐ کی شفاعت کے طلب گار ہوں گے۔

شعر نمبر ۲۵: موافق گر نہ کرتا عدل اس کا آب و آتش کو — تو کوئی سنگ سے بندھتی نہ شکلِ لعلِ رمانی

تشریح: سودا آنحضرتؐ کے عدل و انصاف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپؐ کے عدل نے آگ اور پانی کی مختلف طبائع اور کیفیات کو بھی اس طرح یکجا کر دیا کہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اگر آپؐ ایسا نہ کرتے تو بھلا دنیا میں انار جیسے رنگ کا پتھر کا وجود ہو سکتا تھا۔ واضح رہے کہ سودا نے لعل کے سُرخ رنگ کی مشابہت کی بنا پر آگ قرار دیا اور اس کی آب و تاب اور چمک، دمک کو پانی کہا اور یوں ایک اچھوتا

مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی۔

شعر نمبر ۲۶: ہو پلے ہے آشیاں میں باز کے بچہ کبوتر کا ۔ شباں نے گرگ کو گلے کی سونپی ہے نگہبانی

تشریح: عدل و انصاف سے متعلق مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب صورت یہ ہے کہ باز کے گھونسلے میں انتہائی کمزور پرندے کبوتر کے بچے پل رہے ہیں حالانکہ عام حالات میں باز کبوتر کو شکار کرتا اور کھا جاتا ہے لیکن اب کبوتر تو کبوتر اس کے بچے کو بھی باز سے کوئی خطرہ نہیں۔ اسی طرح بھیڑیئے جو بھیڑ بکریوں کو اپنی خوراک بناتے ہیں لیکن اب چرواہوں کو بھیڑیوں سے کوئی خطرہ نہیں بلکہ انہوں نے بھیڑیوں کو اپنے گلوں کی نگہبانی اور حفاظت پر مامور کر رکھا ہے اور یہ آنحضرتؐ کے عدل و انصاف کا فیضان ہے۔

واضح رہے کہ اگر کبوتر، باز، بھیڑ بکری اور بھیڑیوں سے مخصوص نوعیت کے جانور مراد لیئے جائیں تو سودا کی بات عام مشاہدے کے خلاف نظر آئے گی۔ لیکن اگر کبوتر اور بھیڑ سے کمزور انسان اور اقوام مراد لی جائیں اور باز اور بھیڑیئے قوی اور حاکموں کے پردے میں دیکھے جائیں تو سودا کی اس بات کو تاریخ کی بے شمار مثالوں کے پس منظر میں ثابت کیا جا سکتا ہے۔

شعر نمبر ۲۷: جہاں انصاف سے ہر گاہ اب معمور ہے اتنا ۔ تو اس کے آگے ہوگی عدل کی کیا کچھ فراوانی

تشریح: سودا کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو اس دنیا میں مبعوث ہوئے اور رحلت فرمائے صدیاں گزر گئیں، اس کے باوجود اُن کے عدل و انصاف اور اُن کے قائم کردہ نظام کی یہ صورت ہے کہ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جو انصاف سے خالی ہو۔ غور کیا جائے کہ جب آپ بہ نفسِ نفیس اس دنیا میں تشریف فرما تھے تو اُس وقت حق و انصاف کی کیا کیفیت ہوگی!

شعر نمبر ۲۸: ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اُس وقت دنیا میں ۔ وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

تشریح: مرزا سودا اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس زمانے میں آنحضرتؐ اس دنیا میں تشریف فرما تھے افسوس کہ اس دنیا میں اس وقت ہم موجود نہیں تھے اگر قسمت یاوری کرتی اور ہم بھی اس زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے تو آنحضرتؐ کے حسن و جمال کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کرتے۔

شعر نمبر ۲۹: جسے یہ صورت و سیرت کرامت حق نے کی ہووے ۔ بجا ہے کہیے ایسے کو اگر اب یوسفِ ثانی

تشریح: سودا کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت اور سیرت عطا کی تھی جو ہر اعتبار سے لائقِ مدح و ستائش ہے۔ ایسی صورت و سیرت کے حامل انسان کو بے شک حضرت یوسفؑ کا ثانی کہنا چاہیے۔ واضح رہے کہ روایات کے مطابق حضرتِ یوسفؑ دنیا کے حسین ترین انسان گزرے ہیں۔

شعر نمبر ۳۰: معاذ اللہ یہ کیا حرفِ بے موقع ہوا سرزد ۔ جو اس کو پھر کہوں تو ہوں میں مردودِ مسلمانی

تشریح: لیکن اس شعر میں مرزا سوداؔ کو خود اپنی تشبیہ کی لغویت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے خیال پر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کیا بے محل بات میرے منہ سے نکلی یہ ایسی بات ہے کہ اگر دوبارہ میری زبان سے ادا ہوئی تو میں اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاؤں گا اور میرا اسلام راندۂ درگاہ ہو کر ناقابلِ اعتبار ٹھہرے گا۔

شعر نمبر ۳۱: کدھر اب فہمِ ناقص لے گیا مجھ کو نہ یہ سمجھا ۔ کہ وہ مہرِ الوہیت ہے یہ ہے ماہِ کنعانی

تشریح: مرزا سوداؔ اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اپنی ناسمجھی اور کج فہمی کی بنا پر کتنی غلط بات کہہ گیا کہ میں نے آنحضرتؐ کو حضرت یوسفؑ سے تشبیہ دی بلکہ حضرت یوسفؑ کو اوّلیت دے کر آنحضرتؐ کو اُن کا ثانی قرار دیا۔ حالانکہ آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کے سورج کی مانند ہیں۔ جن کی ضیا باریاں پوری کائنات کے لئے ہیں اور حضرت یوسفؑ فلسطین کے علاقے کنعان کے چاند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی نبوت قیدِ مقام سے ماورا پوری کائنات کیلئے ہے۔ جبکہ حضرت یوسفؑ کی نبوت کا دائرہ صرف کنعان تک محدود تھا۔ ظاہر ہے کہ محدود کو لامحدود سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔

شعر نمبر ۳۲: جو صورت اس کی ہے لاریب وہ ہے صورتِ ایزد ۔ جو معنی اس میں ہیں بے شک وہ ہیں معنیٔ ربانی

تشریح: مرزا سوداؔ کہتے ہیں کہ بے شک اور بلاشبہ آپؐ کی صورت اللہ تعالیٰ کی صورت کے مطابق ہے اور آپؐ کی صفات اللہ تعالیٰ کی صفات جیسی ہیں۔ واضح ہو کہ اللہ کی صورت کے بارے میں قیاس ناممکن ہے لہٰذا سوداؔ کے پہلے مصرع میں تقابل کو سمجھنا بھی ناممکن ہے۔ البتہ دوسرے مصرع کے معانی کو اللہ تعالیٰ اور آنحضرتؐ کے صفاتی ناموں کی مماثلت کے پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔

شعر نمبر ۳۳: حدیثِ "من رآنی" دال ہے اس گفتگو پر ۔ کہ دیکھا جس نے اس کو اُن نے دیکھی شکلِ یزدانی

تشریح: مرزا سوداؔ گذشتہ شعر کے خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ صرف میں ہی آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ کے مماثل قرار نہیں دے رہا بلکہ خود آنحضرتؐ کی ایک حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور آنحضرتؐ کی صفات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

شعر نمبر ۳۴: غرض مشکل ہمیں ہوتی کہ پیدا کر کے ایسے کو ۔ خدا گر یہ نہ فرماتا نہیں کوئی مرا ثانی

تشریح: سوداؔ کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا احادیث کے پیشِ نظر اگر ہم اللہ تعالیٰ اور آنحضرتؐ کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی کوشش کرتے تو ہمیں سخت مشکل پیدا آتی اور یہیں ممکن تھا کہ ہم اسلام کے تقاضے پورے کرنے کی بجائے شرک میں مبتلا ہو جاتے اور آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ کے

مثل قرار دینے کے گناہ گار ٹھہرتے لیکن خود اللہ تعالیٰ نے ہماری مشکل آسان کر دی اور فرمایا کہ کائنات میں میرا ثانی نہیں ہے۔ گویا اس طرحِ آنحضرتؐ بھی اللہ تعالیٰ کے ثانی نہیں ٹھہرتے اور یوں ہم اللہ تعالیٰ اور آنحضرتؐ میں ایک حدِّ فاصل قائم کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

شعر نمبر ۵۲: بس آگے مت چل اے سوداؔ میں دیکھا فہم کو تیرا ۔ کر استغفار اس منہ سے اب ایسے کی ثناخوانی

تشریح قصیدے کے مقطع میں مرزا سوداؔ کہتے ہیں کہ اے سوداؔ تو بہت گنہگار ہے اور تیری عقل و فہم بھی ناقص ہے۔ لہٰذا تو اپنے قلم کو روک دے اور نعتیہ قصیدے کو ختم کر۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کہ تو نے گنہگار ہونے کے باوجود آنحضرتؐ جیسی مبارک ہستی کی تعریف میں قلم اٹھایا اور یہ تعریف اُس زبان سے کی جو ہزارہا آلودگیوں میں لتھڑی ہوئی ہے اور اس قابل نہیں کہ آنحضرتؐ کا ذکرِ مبارک کر سکے۔

ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد

تعارف قصیدے کے برعکس ہجو اصطلاحاً ایسی نظم کو کہا جاتا ہے جس میں کسی کی مذمت کی گئی ہو۔ اور جس طرح قصیدے کے لئے ایک ہیئت مخصوص ہے ہجو کیلئے کسی خاص ہیئت کی قید نہیں۔ ہجویں قصیدے کی ہیئت میں بھی کہی گئی ہیں جیسے کہ خود سوداؔ کی ہجو "تضحیکِ روزگار" اور "مثنوی ہیئت" میں بھی جیسے کہ زیرِ نظر ہجو مثنوی ہیئت میں ہے۔ ہجو مخمس، مسدس اور مثلث فارم میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

سوداؔ کو قصیدے کی طرح ہجو کہنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ گو بعد ازاں انشاؔ مصحفیؔ کی معرکہ آرائیوں نے خاص شہرت حاصل کی اور ان ادبی معرکوں کے ضمن میں بے شمار ہجویات بھی کہی گئیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی شاعر اس معاملے میں بھی سوداؔ پر گوئے سبقت نہ لے جا سکا۔ دراصل قصیدے کی طرح مرزا کا مزاج ہجو سے بھی مناسبت رکھتا تھا۔ ذرا کسی سے مناقشہ ہوا اُدھر مرزا سوداؔ نے غنچے کو کاغذ قلم لانے کا حکم دیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ہجو مکمل ہو گئی۔ یہی سبب ہے کہ کلیاتِ سوداؔ میں ہجویات بھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔

حل لغات نسق۔ انتظام، بندوبست، ترتیب۔ ہیہات۔ افسوس کا کلمہ، ہائے۔ دزد۔ چور۔ ککڑی۔ موسم گرما کا ایک پھل جو بہت ہی سستا ہوتا ہے، تر۔ چوٹّا۔ چور، اٹھائی گیرا، اچکا۔ جھمکا۔ بھیڑ، انبوہ، جمگھٹا۔ ٹھگ۔ دغاباز، مکار، فریبی۔ کوتوال۔ کوتوال، پولیس کا افسر۔ آنٹ سانٹ۔ جوڑ توڑ۔ دوستی، میل جول، سازش۔ نرسنگیا۔ ایک قسم کا بجانے کا سینگ، اعلان کرنا۔ نظر باز۔ چالاک، تاڑنے والا، مردم شناس۔ چترا۔

ہوشیار ۔ چالاک، مکار ؛ نپٹ ۔ سراسر، بالکل ؛ دل خواہ ۔ پسندیدہ ؛ مشخص ۔ تشخیص کیا گیا، معین، جانچا گیا، مقرر کیا گیا ؛ تکرار ۔ بحث، جھگڑا، حجت ؛ دوشالہ ۔ شالی چادر، جوڑا ؛ گھات ۔ داؤں، دھوکا ؛ ٹک ۔ ذرا، تھوڑی سی ؛ مآل ۔ انجام، نتیجہ ؛ زہے ۔ کلمۂ تحسین لیکن یہاں طنز کے طور پر استعمال ہوا ہے ؛ روزِ محشر ۔ قیامت کا دن ؛ نرسنگی ۔ سینگ کی قسم کا باجا بجانے والا، رات بھر اعلان کر کے لوگوں کو ہوشیار کرنے والا ؛ قال وقیل ۔ بات چیت، بحث وتکرار ؛ صور اسرافیل ۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق قیامت سے پہلے ایک فرشتہ اسرافیل ایک خاص آلہ بجائے گا جس کی آواز بہت ڈراؤنی ہوگی ۔ اس آواز کے ساتھ ہی قیامت برپا ہو جائے گی ؛ بشر ۔ انسان ؛ کوٹھی ۔ دکان، گودام ؛ پھوٹے ۔ نقب لگے یعنی چوری ہو ؛ بھانت ۔ ڈول، طریقہ، رسم ۔ طور ؛ سرہنگ ۔ فوج کا سردار، پہلوان ؛ ہنکارنا ۔ غل مچانا ؛ اندھیاری ۔ تاریکی ؛ میخ ۔ کیل، نقب ؛ ناچار ۔ بے بس، مجبور ؛ خلل ۔ بگاڑ، خرابی، رخنہ، فتور ؛ چور محل ۔ وہ عورت جو عقد و نکاح کے بغیر داشتہ بنا کر رکھی جائے ؛ مفسد ۔ فساد کرنے والے ؛ چرخ ۔ آسمان ؛ لایعنی ۔ بے موقع، بے مطلب ؛

شعر نمبر ۱: کیا ہوا یارو وہ نسق بیہات ۔۔۔ لیموں کے چور کا کٹے تھا ہات

تشریح مرزا سودا شیدی فولاد خان کوتوالِ دہلی کی ہجو کے مطلع میں کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں دہلی کے انتظام و بندوبست کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص لیموں جیسی حقیر اور معمولی شے بھی چراتا تھا تو اسلامی تعزیرات کے تحت اسے سزا دی جاتی اور چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے لیکن آہ! افسوس کہ اب وہ انتظام و انصرام نہیں رہا۔

شعر نمبر ۲: باندھا جاوے تھا چور پگڑی کا ۔۔۔ مارا جاوے تھا دزد ککڑی کا

تشریح ایک زمانہ تھا کہ اگر کوئی شخص محض پگڑی چراتا تو وہ فوراً گرفتار ہو جاتا تھا اور اگر کوئی شخص ککڑی جیسی معمولی چیز کا چور قرار پاتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی ۔ پگڑی کے ساتھ باندھے جانے کی رعایت پر لطف ہے ۔

شعر نمبر ۳: شہر میں کیا رہے تھا امن و امان ۔۔۔ کیسے کرتی تھی خلق خوش گذران

تشریح سودا کہتے ہیں کہ جب ایسا انتظام و انصرام تھا تب شہر میں ہر طرف امن و امان کی صورتِ حال موجود تھی اور مخلوق خدا یعنی دہلی شہر کے باسی بے فکری و فراغت سے اپنی زندگی بسر کرتے تھے ۔

شعر نمبر ۴: تھانہ رشوت سے کوتوال کو کام ۔۔۔ شہر میں تھا نہ چوٹے کا نام

تشریح | وہ زمانہ ایسا تھا کہ پولیس کا کوتوال رشوت نہیں لیتا تھا اور نہایت دیانتداری سے اپنے فرائض کی بجا آوری کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پورے شہر میں چور تو چور، چور کا نام تک نہیں پایا جاتا تھا۔

شعر نمبر ۵:- اب جہاں دیکھو واں جھمکا ہے — چور ہے، ٹھگ ہے اور اچکا ہے

تشریح | لیکن اب ایسا دور آگیا ہے کہ جس طرف دیکھئے چوروں اور اٹھائی گیروں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے اور شہر دہلی کے جس باشندے کو بھی دیکھیے وہی چور، دغا باز، فریب دینے والا اور اچکا ہے۔

شعر نمبر ۶:- کس طرح نہ ہو شہر کا یہ حال — شیدی فولاد اب جو ہے کتوال

تشریح | سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر شہر میں یہ صورت حال کیوں پیدا ہو گئی ہے اور ہر طرف چوروں کا راج کیوں ہو گیا ہے۔ سودا اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسا اس لئے ہوا ہے کہ شیدی فولاد خاں کو اس شہر کا پولیس افسر مقرر کر دیا گیا ہے۔

شعر نمبر ۷:- ٹھگ نہ تنہا چڑھے ہیں اس کی آنٹ — مل رہی ہے اچکوں سے بھی سانٹ

تشریح | شیدی فولاد ایسا پولیس افسر ہے جس کی صرف ٹھگوں اور دغا بازوں ہی سے دوستی نہیں ہے بلکہ چوروں اور اچکوں سے بھی اس کا میل جول، یارانہ اور گٹھ جوڑ ہے۔

شعر نمبر ۸:- سر پر یہ دیکھیں جس کے اچھی شال — گویا وہ ان کے باپ کا ہے مال

تشریح | اسی وجہ سے چوروں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ یہ اگر کسی کے سر پر اچھی چادر تک دیکھ لیتے ہیں تو اسے چرانے سے نہیں چوکتے اور اس کو اپنے باپ کا مال یعنی موروثی حق سمجھ کر چھین لیتے ہیں۔

شعر نمبر ۹:- گشت جب اس کا پھرتا آتا ہے — یہی نرسنگیا بجاتا ہے

۱۰:- سن لو چورو یہ مختصر قصہ ! — صبح کو بھیج دیجیو حصہ

تشریح | جب شیدی فولاد اپنے ساتھیوں کے ساتھ رات کو گشت پر نکلتا ہے تو اس کے ساتھ سینگ سے بنا ہوا باجا بجا کر لوگوں کو خبردار ہوشیار کرنے والا شخص یہی اعلان کرتا ہے کہ اے چورو! زیادہ تفصیل میں کیا جانا بس اتنا سمجھ لو کہ اب رات کو تمہیں لوگوں کے گھروں میں چوری کرنے اور انہیں لوٹنے کی پوری چھٹی ہے۔ لیکن اس لوٹ کے مال میں سے صبح ہمارا حصہ خود بخود بھیج دینا۔ یعنی شیدی فولاد اور اس کے ساتھی شہریوں کی حفاظت کرنے کے بجائے چوروں کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور انہیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کرتے ہیں اور گویا چوروں کا کاروبار پولیس کی شراکت سے چل رہا ہے۔

شعر نمبر ۱۱:- جو نظر باز اس کا چترا ہے — خوب دیکھو تو جیب کترا ہے

تشریح مرزا سودا کہتے ہیں کہ شیدی فولاد نے اپنے معاونین کے طور پر جو نہایت چالاک اور عقلمند لوگ چوروں کو تاڑتے، پکڑنے اور قرار واقعی سزا دینے کے لئے رکھے ہیں، دراصل وہ خود لوگوں کی جیب کاٹتے اور انہیں اُن کے مال سے محروم کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔

شعر نمبر ۱۲ تا ۲۳

۱۲۔ ایک دن اس نے سب سے طنز کی راہ	کہا تم ہو مرے تپٹ دل خواہ
۲۳۔ چیز میری جو اب چراؤ تم !	چوک میں بیچنے نہ جاؤ تم !
قیمت اس کی جو کچھ مشخص ہو	اتنے کو تم اسے مجھی کو دو
ایک ان میں سے یہ سخن سن کر	لگا کہنے کہ اس سے کیا بہتر
کیا جب آپ تم نے یہ انصاف	میں بھی کرتا ہوں عرض رکھیے معاف
آپ کے سر پہ یہ جو پگڑی ہے	دو خریدار اس کے ہیں در پے
دس روپے وہ مجھے دلاتے ہیں	کہیے اب آپ کیا لگاتے ہیں
دوسرے نے کہا کہ میں ہوں غلام	نہیں ہوں جس سے ہووے ایسا کام
پگڑی آقا رکھے نہ سر سے اتار	اور قیمت کی اس کی ہو تکرار
پر دو شالے کے تئیں لگا کر گھات	آج جاگا کیا ہوں ساری رات
میری محنت پر ٹک نظر کیجے	آگے جو دل میں آوے سو دیجے
غرض اس گفتگو سے ہے یہ مآل	واہ وا واہ رے زہے کتوال

تشریح شہر میں چوروں کا یہ حال ہے اور یہ اس قدر کھل کھیل رہے ہیں کہ ایک دن شیدی فولاد نے طنز کے طور پر اپنے ان چور ساتھیوں کو کہا کہ بے شک تم ہر اعتبار سے میرے معتمد ہو اور میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ لیکن اگر آج کے بعد تم نے میری کوئی چیز چرائی تو تم اسے بازار میں فروخت کرنے نہ جانا بلکہ اس کی جو بھی قیمت مقرر و متعین ہو وہ مجھ سے ہی لے لینا اور چیز مجھے لوٹا دینا۔ جب شیدی فولاد نے یہ بات کہی تو اس کے جواب میں اُس کا ایک چور ساتھی بولا کہ جناب اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ اور جب آپ نے بغیر کسی تذبذب کے سیدھی اور سچی بات کہہ دی ہے تو پھر ذرا ٹھنڈے دل سے میری بات بھی سُن لیں اور وہ یہ کہ آپ نے اس وقت اپنے سر پر جو پگڑی باندھ رکھی ہے اسے دو آدمی خریدنے پر آمادہ ہیں اور وہ مجھے اس پگڑی کے دس روپے دیتے ہیں آپ بتلایئے کہ آپ اس پگڑی کی کیا رقم دیں گے۔ اس کے بعد دوسرا شخص کہنے لگا کہ بے شک میں آپ کا نوکر اور خدمتگار ہوں اور میں اتنا نمک حرام بھی نہیں ہوں کہ آپ کو نقصان پہنچاؤں۔ یہ اچھا نہیں ہے کہ آپ اپنی پگڑی سر سے بھی نہ اتاریں اور ہم اس کی قیمت طے کرنے کے بارے میں بحث مباحثہ شروع کر دیں۔ البتہ آپ کی قیمتی شالی چادر کو چرانے کے لئے میں رات

بھرتا کتنا ہوں اور اسی وجہ سے رات بھر سو بھی نہیں سکا۔ لہذا آپ میری محنت پر نظر کریں۔ یعنی اس محنت کے عوض مناسب معاوضہ ادا کریں۔ البتہ میری اس گزارش کے بعد آپ کامل اختیار رکھتے ہیں جو چاہیے کیجئے مراد یہ ہے کہ دوسری صورت میں میں یہ چادر چھوڑ دوں گا۔

سوداؔ یہ سارا مکالمہ نقل کر کے کہتے ہیں کہ اس گفتگو سے اندازہ کر لیجئے کہ کوتوال کے انتظام و انصرام کی کیا کیفیت ہے۔ یعنی عام لوگ تو در کنار خود کوتوال کی روزمرہ استعمال کی چیزیں بھی چوروں سے محفوظ نہیں۔

شعر نمبر ۲۴ ؎ شہر کے بیچ کیا کہوں میں اب — روزِ محشر کی دھوم ہے ہر شب
تا ۲۶ ؎ شب ہے ترسنگیوں کی قال و قیل — گویا پھنکتی ہے صورِ اسرافیل
کتے آہٹ سے انکی بھونکیں ہیں — مردے خوابِ عدم سے چونکیں ہیں

تشریح: مرزا سوداؔ کہتے ہیں کہ میں کیا بتاؤں! آجکل شہر کی یہ حالت ہے۔ بس اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اہل شہر کے لئے ہر رات قیامت سے کم نہیں۔ قیامت کا قرینہ یہ ہے کہ جس طرح قیامت سے پہلے اسرافیلؑ صور پھونکیں گے اس طرح آجکل تبدیلی فولاد کے معادنین سینگ سے بنا ہوا ساز بجاتے ہیں اور جس طرح صور پھونکنے کے ساتھ ہی قیامت آجائے گی اسی طرح ترسنگیا بجتے ہی اہل شہر پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے اور چور چکار ان کا آرام و سکون غارت کر دیتے ہیں۔ سوداؔ کہتے ہیں کہ ترسنگیا کی آواز اور گشت کرنے والوں کے قدموں کی آہٹ سے کتے بھونکنے لگتے ہیں اور مردے جو قبر میں گہری نیند سو رہے ہیں، جاگ جاتے ہیں۔

شعر نمبر ۲۷ ؎ آنکھ تو کس بشر کی لاگے ہے — چوروں کے ڈر سے فتنہ جاگے ہے

تشریح: ایسی صورتِ حال میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی سو سکے۔ البتہ چوروں کے خوف سے مختلف فتنے جاگ اُٹھتے ہیں۔

شعر نمبر ۲۸ ؎ لاکھ بندوق رات کو چھوٹے — کوٹھی پر سا ہوکار کی پھوٹے

تشریح: سوداؔ کہتے ہیں کہ گو رات بھر لاکھوں دفعہ چوروں کو ڈرانے کے لئے بندوقیں چلائی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود تاجر پیشہ طبقے کے گوداموں اور دکانوں میں چوری ضرور ہوتی ہے۔ یعنی بندوقیں دغنے سے چور نہیں ڈرتے اور نہ اُن پر کوئی اثر ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۲۹ ؎ شام سے صبح تک یہی ہے شور — دوڑیو گٹھڑی لے چلا ہے چور

تشریح: شام سے صبح تک یعنی تمام رات دہلی میں یہی شور رہتا ہے کہ اُٹھو جاگو دوڑو بھاگو اور چوروں کو پکڑو جو چوری کا مال لئے بھاگے جا رہے ہیں۔

شعر نمبر ۳۰ ؎ مال صندوق میں رہے کس بھانت — تن کے کپڑوں پر چوروں کا ہے دانت

تشریح سودا کہتے ہیں کہ صندوقوں میں چھپا ہوا مال جو بہر حال انسانی جسم سے جدا اور علیحدہ ہے، اُسے چوروں سے کیونکہ محفوظ رکھا جا سکتا ہے جبکہ پہنے ہوئے کپڑوں پر بھی چوروں کی نظر ہے اور وہ ان اشیاء کو بھی چرانے کے لئے بے تاب ہیں جن کی چوری عام حالات میں ممکن نہیں ہوتی ہے۔

شعر نمبر ۳۱: اب تو دزدی کا کچھ نہیں ہے ڈھنگ — کہتے پھرتے ہیں چور ہو سرہنگ

تشریح سودا کہتے ہیں کہ اب تو وہ دور آگیا ہے کہ چوری کا کوئی ڈھنگ، طریقہ اور طور نہیں رہا۔ اس لئے کہ پہلے چور گھروں میں چوری چھپے داخل ہوتے تھے اور موقع پاکر چوری کرتے تھے۔ لیکن اب تو چور فوج کے سرداروں اور پہلوانوں کی طرح علانیہ پھرتے ہیں اور انھیں کوئی پوچھنے والا کوئی نہیں۔

شعر نمبر ۳۲: رات جو اپنے گھر میں کھنکارے — چور دروازے پر یہ ہنکارے
۳۳: ہوگی کب تک بجا خبرداری — چور جاتے رہے کر اندھیاری

تشریح اگر کوئی شخص رات کو اپنے گھر میں کھنکارتا ہے یعنی معمولی سی آواز پیدا کرتا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ جاگ رہا ہے تو چور بیانگِ دہل اور بے خوفی سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ آخر تم کب تک رکھوالی کرو گے اور کب تک جاگو گے۔ آخر ایک دن ضرور تمہارے گھر میں نقب لگے گی اس لئے کہ دنیا سے نہ تو تاریک راتیں ختم ہونے کی کوئی صورت ہے اور نہ ہی چوروں کا خاتمہ ممکن ہے۔

شعر نمبر ۳۴: نہ عبادت کو جاگتا ہے شیخ! — ڈر یہی چور آ نہ مارے میخ!

تشریح مرزا کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آج کل راتوں کو جاگتا اور عبادت کرتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ واقعتاً عبادت کے خیال سے جاگ رہا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس خوف سے جاگتا ہے کہ کہیں رات کو سوتے میں کوئی چور نہ آجائے اور چونکہ چوروں کے خوف سے جاگنا پڑتا ہے لہٰذا وہ سوچتا ہے کہ چلو عبادت ہی کرلی جائے۔ شعر میں صنعتِ حسن تعلیل ہے۔

شعر نمبر ۳۵: خلق جب دیکھ کرکے یہ بیداد — کرتے ہیں کوتوال سے فریاد!
تا ۴۱: بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار — گرم ہے چوٹٹوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول — میری پگڑی کا میرے سر پر مول
یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور — دیکھو تو ٹک کہاں کہاں ہے چور
مٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل — ہے امیروں کے گھر میں چور محل
دیکھیے گر بتاں کو بھی بخدا — ہاتھ میں ہے انھوں کے دزد حنا
کس کو ماروں میں کس دوں گالی! — چوری کرنے سے کون ہے خالی

تشریح جب چوروں کے مظالم سے تنگ آکر لوگ کوتوال سے فریاد کرتے ہیں اور ایسے واقعات کے سدِ باب کی درخواست کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ آج کل شہر میں چوروں کی بھرمار ہے اور ان کا کاروبار خوب چمک رہا ہے اور میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح ان کے سامنے بے بس ہوں۔ کوتوال کہتا ہے کہ میں لوگوں کو کیا تحفظ فراہم کروں جبکہ میری اپنی یہ حالت ہے کہ چور ڈنکے کی چوٹ اور علانیہ میرے سامنے میری پگڑی کی قیمت طے کرتے ہیں یعنی میں خود بھی چوروں کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ اور چوروں کی دیدہ دلیری کی حد یہ ہے کہ وہ میری چیزیں تک نہیں چھوڑتے۔ شیدی فولاد کہتا ہے کہ بھلا میں چوروں کا کیسے سدِ باب کر سکتا ہوں۔ آپ خود غور کریں کہ دنیا میں وہ کونسی جگہ ہے جہاں چور موجود نہیں۔ بھلا میں ایک معمولی پولیس افسر اس خرابی کا کیا علاج کر سکتا ہوں جبکہ خود امراء اور ارکانِ سلطنت نے اپنے گھروں میں چور محل یعنی داشتا ئیں رکھی ہوئی ہیں واضح ہو کہ مرزا سودا نے چور محل میں لفظ چور سے فائدہ اٹھا کر مضمون آفرینی کی ہے۔

شیدی فولاد اپنا عذر پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر آپ خوبصورت لوگوں کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ ان کے ہاتھ میں بھی حنا کا چور موجود ہے واضح ہو کہ ہاتھ پر مہندی لگانے کے باوجود بعض جگہوں پر مہندی کا رنگ نہیں چڑھتا۔ اس مقام کو دزدِ حنا یعنی حنا کا چور کہا جاتا ہے۔ ہاتھ میں چور ہونا کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ خوبصورت لوگوں نے چوروں کو اپنے بس میں کر رکھا ہے اور چور یہ سارے کام ان کی مرضی سے کرتے ہیں۔ یہاں پر سودا نے محض دزد کے لفظ سے فائدہ اٹھا کر خیال آفرینی کی ہے۔ اس شعر میں صنعتِ ایہام موجود ہے۔

شعر نمبر ۴۲: چڑھ کے جب مفسدوں پہ جاتا ہوں وقت پر میں بھی جی چراتا ہوں

تشریح شیدی فولاد کہتا ہے کہ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ دہلی میں اس وقت کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں جو کسی نہ کسی صورت میں چور نہ ہو۔ ایسی صورت میں بھلا میں کسے موردِ الزام ٹھہراؤں اور کسے سزا دوں۔ وہ اپنی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ مثلاً مجھے دیکھیے جب میں کسی فساد برپا کرنے والے شخص کو گرفتار کرنے جاتا ہوں تو عین وقت پر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اپنے فرض کی ادائیگی سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

شعر نمبر ۴۳: مرتبہ دزدی کا اس قدر ہے بلند چرخ کے گھر پہ کہکشاں کی کمند

تشریح چوری اور چوروں کا مقام اِس قدر اونچا ہے کہ اب تو آسمان بھی اس سے محفوظ نہیں اور اِس پر بھی کہکشاں نے کمند ڈال رکھی ہے تاکہ اس کے ذریعے آسمان تک پہنچے اور چوری کرے گویا سودا کے نزدیک کہکشاں بھی چور ہے۔

شعر نمبر ۴۴: یہ جو سودا بکے ہے لایعنی آپ کرتا ہے دزدیٔ معنی

تشریح سوداؔ مثنوی کے مقطع میں شیدی فولاد سے کہلواتے ہیں کہ اور تو اور یہ جو حضرتِ سوداؔ خواہ مخواہ بولے چلے جا رہے ہیں اور میرے سر اُلٹے سیدھے الزام تھوپ رہے ہیں یہ خود بھی چور ہیں اور دوسرے شعراء کے معنی چرا چرا کر شاعری کرتے ہیں ۔

خواجہ میر درد

سوانحی حالات آپ کا نام سید خواجہ میر اور تخلص دردؔ تھا۔ آپ کے والدِ گرامی خواجہ محمد ناصر عندلیب بھی صاحبِ دیوان اور اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ اُن کا دیوان "نالۂ عندلیب" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ خواجہ میر درد ۱۷۲۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے آپ نجیب الطرفین سید ہیں والدہ کی طرف سے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت غوث اعظمؒ سے اور والد کی طرف سے خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سے ملتا ہے۔ دردؔ کے والد اوائل عمر میں شاہی منصب دار مقرر ہوئے تھے مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد خانقاہ نشینی اختیار کر لی اور شاہ سوار اور گلشن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ دردؔ نے ایسے متقی باپ کے پاکیزہ گھر میں تحصیلِ علم کی منزلیں طے کیں۔ قرآن، تفسیر، فقہ، فلسفہ، منطق اور تصوف کے علوم حاصل کئے۔ علم موسیقی میں دسترس پیدا کی اور پھر اپنی جاگیر کے کاموں کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ مصحفیؔ کے بقول دردؔ سپاہی پیشہ تھے مگر والد کے حکم سے نوکری چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ جوانی میں ہی والد کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور پھر محض انتیس برس کی عمر میں گوشہ نشین ہو گئے اور اپنے معمولات کو اپنی خانقاہ تک محدود کر لیا۔ دردؔ کا زمانہ ۱۷۲۱ء سے ۱۷۸۵ء تک محیط ہے اس عرصہ کی سیاسی ابتری، معاشرتی بدحالی اور دہلی کی بار بار کی تباہی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ نے دہلی کو تاراج کیا پھر مرہٹوں اور جاٹوں نے اسے اپنی تباہ کاریوں کا مرکز بنائے رکھا اور پھر ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یوں عوام الناس میں عدم تحفظ کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا ۔ امراء و شرفا کے ساتھ ساتھ بیشتر نامی شعراء بھی دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ چلے گئے مگر دردؔ نے ان کڑے حالات میں بھی اپنی خانقاہ اور دہلی سے جدا ہونا پسند نہ کیا۔ بالآخر ۱۷۸۵ء میں استقامت کے اس پیکر نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور دہلی میں دفن ہوئے ۔

محاسنِ کلام

اردو شاعری میں خواجہ میر درد کی یادگار غزلیات و رباعیات کا ایک مختصر سا دیوان ہے جو ہر دور میں مقبول و محترم خیال کیا گیا۔ درد کو اپنے منفرد شعری اسلوب اور جداگانہ اندازِ فکر کی بدولت اردو کے چند بڑے شعراء میں شمار کیا جاتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ درد سے اردو میں صوفیانہ شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے صوفیانہ خیالات کو انسانی محبت اور دنیا کی بے ثباتی کے حوالے سے اپنے اشعار میں کچھ اس حسن و خوبی سے سمویا ہے کہ یہ انہی کا حصہ ہے۔ درد کی زبان کی شستگی اور بیان کی سادگی اور سلاست ہر دور کے شعراء کے لئے باعثِ رشک رہی ہے۔

صوفیانہ شاعری

درد ایک باعمل صوفی تھے تصوف اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ ایک صوفی کے بیٹے تھے بلکہ خود بھی تصوف کے تمام اسرار و رموز سے عملی سطح پر کماحقہ، آگاہ تھے۔ اسی لئے اُن کی شاعری صوفیانہ خیالات اور سلوک کے مختلف مراحل کے ذکر سے لبریز ہے اور وہ کائنات کے ذرے ذرے میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو جاری و ساری دیکھتے ہیں۔

۱۔ جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا	تُو ہی آیا نظر جدھر دیکھا!
۲۔ ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے	میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے!
۳۔ مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا	ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی تو صاحبِ خانہ تھا

دنیا کی بے ثباتی کے مضامین

درد کا زمانہ مصائب و آلام، سیاسی انتشار اور معاشرتی بدحالی کا زمانہ تھا۔ ہر کوئی انفرادی غم اور اجتماعی تباہ حالی سے دوچار تھا چنانچہ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا احساس درد کے حساس دل و دماغ پر محیط ہو جانا فطری سی بات تھی پھر دہلی کا سہاگ اجڑتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لہذا دنیا کی ناثباتی کے مضامین اُن کے کلام میں جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔

۱۔ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے
۲۔ وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
۳۔ ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ!	جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
۴۔ دیدوا دید جو ہو جائے غنیمت سمجھو!	جوں شرر ورنہ ہم اے اہلِ نظر جاتے ہیں

دردؔ کا ناصحانہ انداز

دردؔ جہاں انسانی عظمت اور مساوات کے علمبردار ہیں اور اس کا والہانہ اظہار پُرتاثیر ناصحانہ انداز میں کرتے ہیں وہاں اپنی خاندانی روایت اور سجادہ نشینی کی رُو سے اصلاحِ انسانی کے بلند منصب پر بھی فائز ہیں اور وہ اس منصب کی ذمہ داریاں پوری طرح نبھاتے بھی ہیں چنانچہ اُن کا مختصر دیوان اُن کے ناصحانہ اندازِ فکر کا ترجمان ہے۔

۱۔ تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

۲۔ دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو — ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

۳۔ مت عبادت پہ پھولیو زاہد — سب طفیلِ گناہِ آدم ہے!

روایتی مضامین اور خارجیت

دردؔ کی شاعری میں دیگر اوصاف کے ساتھ ساتھ روایت کا ایک تسلسل بھی ملتا ہے انہوں نے غزل کے روایتی مضامین اور خارجی اندازِ فکر کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اُن کی یہ خارجیت بعض اوقات عشقِ مجازی کے نہایت عمدہ مضامین پیدا کرتی ہے۔

۱۔ نہ ملیں گے اگر کہے گا تو! — تیری خاطر ہمیں مقدم ہے

۲۔ شام بھی ہو چکی کہیں اب تو — آشتابی کر رات جاتی ہے

۳۔ بتوں کے جبر اُٹھائے ہزار ہا ہم نے — جو اس پہ بھی نہ ملیں اختیار رکھتے ہیں

۴۔ جوشِ جنون کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں — گل سے بھی ہوسکی نہ گریباں کی احتیاط

دردمندی اور سوز و گداز

خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں سوز و گداز اور دردمندی کا لہجہ اپنے بھرپور تاثر کے ساتھ موجود ہے یہ دردمندی کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی عصری مصائب و آلام کا ردِ عمل ہے۔ اسی لئے اُن کا ہر شعر قاری کے قلب و نظر میں دردمندی اور گداز کی لہریں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

۱۔ دلِ پُر چاک ہے گل خنداں! — شادی و غم جہاں میں توام ہے

۲۔ فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلوگیری! — یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں

۳۔ خارِ مژہ پڑے ہیں میری خاک میں ملے — اے دشت اپنے کیجیو داماں کی احتیاط

موسیقی کا دلنواز آہنگ

دردؔ کو فنِ موسیقی سے خاص لگاؤ تھا اس فن میں دسترس کے باعث دردؔ کی کئی غزلوں میں موسیقی اور نغمے کی دلنواز کیفیت اپنے بھرپور تاثر کے ساتھ موجود ہے۔ خاص طور پر اُن کی چھوٹی بحر کی غزلیں اپنے موسیقی کے اس خوشگوار آہنگ کی بدولت بہت مقبول ہوئیں۔

۱۔ سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا!
۲۔ دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں — کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
۳۔ اپنے نزدیک باغ میں تجھ بن — جو شجر ہے سو نخلِ ماتم ہے

روزمرّہ اور بول چال کا انداز دردؔ نے اپنی شاعری میں ایسی روزمرّہ کی زبان استعمال کی ہے جس سے بعض اوقات گفتگو اور بول چال کا سا احساس ہوتا ہے۔ دردؔ کے شیریں لہجے اور سلیس انداز نے اُن کے اشعار کو قبولِ عام کا درجہ عطا کیا ہے۔

۱۔ حالِ مجھ غم زدہ کا جس تس نے — جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا!
۲۔ تو بھی نہ اگر ملا کرے گا! — عاشق پھر جی کے کیا کرے گا!
۳۔ ہم کہتے نہ تھے دردؔ میاں چھوڑیے باتیں — پائی نا سزا اور دغا کیجے اُس سے

غزلیاتِ خواجہ میر درد

غزل نمبر ۱

حلِ لغات عہد۔ زمانہ : آگے۔ پہلے : حضور۔ سامنے، مقابل : صریحاً۔ صاف، واضح طور پر، علانیہ، کھلم کھلا۔ ظاہرا : مذکور۔ ذکر : ناسور۔ پرانے زخم کا سوراخ جس سے پیپ نکلتی رہے، ایسا زخم جو کبھی اچھا نہ ہو سکے : محتسب۔ احتساب کرنے والا، خلاف شریعت باتوں پر روک ٹوک کرنے والا۔

شعر نمبر ۱: قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا — پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

تشریح میر دردؔ کہتے ہیں کہ کسی محبوب کے ہاتھوں عاشق پر مظالم اور اس کے قتل کا امکان ہمیشہ رہا ہے اور یقیناً یہ سب کچھ کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے لیکن اے محبوب ہم دیکھتے ہیں کہ تم سے پہلے اس رسم کا یعنی عاشقوں کو قتل کرنے کی رسم کا آغاز کسی نے نہیں کیا۔ یہ تم ہو جو اپنے عشاق کو بے دریغ قتل کرتے ہو۔

شعر نمبر ۲: رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور — شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

تشریح دردؔ کہتے ہیں کہ اے محبوب رات جب تمہاری مجلس آراستہ تھی اور تمہارے حسن کے شعلے بھڑک رہے تھے تو ہم نے شمع کی کیفیت بھی دیکھی۔ بظاہر جلنے اور پُرنور ہونے کے باوجود تمہارے سامنے اُس کے چہرے پر روشنی نظر نہیں آتی تھی یعنی تمہاری آتشِ حُسن کے مقابل شمع کا نور

ماند پڑا ہوا تھا۔ درد نے اپنے اس شعر میں جو مضمون باندھا ہے۔ اُسے کئی مشہور شعرا نے نظم کیا ہے۔ مثلاً ایک شعر میر سے منسوب ہے گو کہ میر کے کلیات اور دواوین میں نہیں ملتا۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو ہم نے دیکھا میر
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اسی طرح داغ دہلوی کہتے ہیں۔

رُخِ روشن کے آگے رکھ کے شمع وہ یہ کہتے ہیں
اِدھر آتا ہے یا دیکھیں اُدھر پروانہ جاتا ہے

شعر نمبر ۳۳: ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں جو پہنچا تو کہا "خیر یہ مذکور نہ تھا"

تشریح: اس شعر میں درد محبوب کی اُس نفسیاتی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اوّل تو وہ اپنے عاشق کا ذکر کرتا ہی نہیں اور اگر کسی طرح ذکر آ بھی جائے تو وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے جیسے اُسے اپنے عاشق سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ دراصل اِسطرح محبوب عاشق سے بے رُخی اور لاتعلقی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

اِس شعر میں عاشق کی اِس نفسی کیفیت کو بھی سامنے لایا گیا ہے جس کے باعث وہ سمجھتا ہے کہ محبوب ہمہ وقت کسی نہ کسی طرح عاشق ہی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ دراصل درد ایک مجلس کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں محبوب کی اس مجلس میں گیا تو اہلِ محفل میرا ہی ذکر کر رہے تھے لیکن جیسے ہی میں وہاں پہنچا تو محبوب بولا کہ خیر چھوڑیئے یہ موضوع ایسا نہیں جس پر بات کی جائے لہٰذا کوئی اور بات کیجئے۔ مرزا غالب نے اس مضمون کو ذرا وسعت دے کر پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

البتہ درد کے شعر میں جس طرح محبوب اور عاشق دونوں کی نفسی کیفیت کی وضاحت ہو رہی ہے وہ بات غالب کے شعر میں نہیں ہے۔

شعر نمبر ۳۴: باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

تشریح: درد کہتے ہیں کہ انسان کی عظمت اور مرتبہ دیکھیئے کہ ظاہری وسائل نہ ہونے کے باوجود وہ اُس مقام رفیع تک پہنچا جہاں بال و پر رکھنے کے باوجود فرشتے بھی نہ پہنچ سکے۔

اِس شعر میں درد نے ایک ایسی غیر واضح تلمیح برتی ہے جس کے دو مصداق ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ قرآن شریف کے مطابق تخلیقِ آدم کے وقت فرشتوں نے انسان کو سجدہ کیا۔ جبکہ کوئی

فرشتہ اپنی تمام تر بزرگی اور پاکیزگی کے باوجود مسجودِ ملائک کے مرتبے پر فائز نہ ہو سکا۔ اس سے بھی فرشتوں پر انسان کی فضلیت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح واقعۂ معراج کو پیش نظر رکھیئے تو پتا چلے گا کہ آنحضرتؐ نے مکہ سے بیت المقدس اور پھر سدرۃ المنتہیٰ تک کا سفر حضرت جبرئیلؑ کی معیت ہی طے کیا۔ لیکن سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچنے کے بعد جبرئیل جیسے عظیم المرتبت اور مقرب فرشتے نے بھی یہ کہہ کر آگے جانے سے معذرت کر لی کہ اگر میں نے ایک قدم بھی بڑھایا تو میرے پر جل جائیں گے جبکہ آنحضرتؐ اس سے بھی آگے تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ سے اس قدر قریب ہوئے کہ قرآن کے مطابق صرف قاب قوسین یعنی دو کمان یا دو ہاتھوں کا فاصلہ باقی رہ گیا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان فرشتوں سے کس قدر افضل ہے اور یہی بات دردؔ سمجھانا چاہتے ہیں۔

شعر نمبر ۵: پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا ۔۔۔ کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

تشریح دردؔ کہتے ہیں کہ اے محبوب تُو ذرا خود ہی غور کر اور بتا کہ ہم تیری محبت کے طفیل ملنے والے غم کی اس سے زیادہ اور کیا پرورش و نگہداشت کرتے اور اسے اس سے زیادہ کیا عزیز جانتے کہ ہمارے جگر کا ایک ایک داغ ایسے زخم کی شکل اختیار کر گیا ہے جسے ناسور کہنا چاہیے اور جس کے علاج کی کوئی صورت نہیں۔ یعنی اب تیری محبت میں ملنے والے زخموں اور داغوں کا کوئی علاج نہیں رہا۔

شعر نمبر ۶: محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں ۔۔۔ دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

تشریح اے حساب لینے والے اور اے ہر نیک و بد پر ٹوکنے اور ڈانٹنے والے آج تُو شراب خانے آیا اور تُو نے شراب پینے والوں کا محاسبہ شروع کر دیا اور وہ بھی اس انداز میں کہ ان بیچاروں کے دل شراب کے پیالے کی طرح ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ واضح رہے کہ شعراء کے نزدیک دل توڑنا بجائے خود ایک بڑا گناہ ہے یعنی محتسب نے ایک بُرائی ختم کرنے کے لئے دوسری اور زیادہ بڑی بُرائی کی اور یوں اس کے عمل کا حقیقی مفہوم بے معنی ہو کر رہ گیا۔

شعر نمبر ۷: دردؔ کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانا ۔۔۔ اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

تشریح دردؔ غزل کے مقطع میں کہتے ہیں کہ اے محبوب دردؔ تجھے ملنے آیا تھا لیکن تو نے اس بات کا بُرا منایا اور تو دردؔ سے ناراض ہو گیا۔ حالانکہ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ دردؔ تو صرف تجھے دیکھنے اور تیرا دیدار کرنے آیا تھا اور اس کے علاوہ دردؔ کا کوئی مقصد نہ تھا۔

غزل نمبر ۲

حل لغات دل گرفتہ۔ غمگین، مایوس : یگانہ۔ بے مثل، منفرد، وا ہونا، کھلنا : ملامت۔ پھٹکار، ڈانٹ، دھتکار : سرو چراغاں۔ ایک قسم کا روشنی کا جھاڑ جو سرو کے درخت کی طرح ہوتا ہے : تغافل۔ غفلت کرنا، جان بوجھ کر نظر انداز کرنا۔

شعر نمبر ۱: تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا ! برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

تشریح درد کہتے ہیں کہ اس دنیا میں انسان کے ارد گرد بے شمار مظاہر بکھرے پڑے ہیں اور ان میں موجود بے شمار تضادات کے باوجود ایک بات مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان مظاہر میں اللہ تعالیٰ کی ذات جلوہ فرما ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر آنکھ اور ہر انسان اس لائق نہیں ہوتا کہ قدرتِ خداوندی کا مشاہدہ کر سکے اس لئے کہ یہ بات بہت مشکل ہے۔ لیکن دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اگر انسان ان مظاہر کو دیکھتا ہے اور ان کے صانع اور خالق کو نہ پہچان سکے تو اس دنیا کو دیکھنا اور نہ دیکھنا برابر ہے۔

اقبال کہتے ہیں۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر ہر رہگزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا

شعر نمبر ۲: مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

تشریح میرا دل ایسے مایوس اور غمگین غنچے کی مانند ہے جس کو آج تک کوئی شخص شگفتہ نہیں دیکھ سکا۔ یعنی میں اس قدر غمزدہ ہوں کہ میری پوری زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی عیش و عشرت اور مسرت و شادمانی کا نہیں آیا۔ پر لطف بات یہ ہے کہ شاعر غنچے اور دل گرفتہ الفاظ کو ایک ساتھ لایا ہے۔ غنچہ ایسے پھول کو کہا جاتا ہے جو ابھی کھلا نہ ہو اور اس کی کیفیت ایسے انسان سے مشابہ ہوتی ہے جس نے ہاتھوں میں دل تھام رکھا ہو شعر میں "وا ہونا" کی شمولیت مستزاد ہے۔

شعر نمبر ۳: یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں ! کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

تشریح درد کہتے ہیں کہ اے اللہ تو ہمارا خالق ہے اور ہم تیری تخلیق۔ جس کی وجہ سے تیرے اور ہمارے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم ہے۔ پھر تو ہمیں اس قدر عزیز رکھتا ہے کہ

اگر ہم تجھے ایک دفعہ یاد کریں تو تو ہمیں دس دفعہ یاد کرتا ہے۔ اس کے باوجود تو ہم سے اجنبی ہے نہ ہم تجھے محسوس کر سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں۔ اے خدا تعلق و بے تعلقی کا یہ ایسا منفرد و بے مثال انداز ہے کہ اس خصوصیت کی حامل کوئی دوسری ہستی اس دنیا میں نہیں دیکھی۔ باقی سب یا تو ہمارے لئے اجنبی ہیں یا تعلق دار۔ لیکن تو واحد ہستی ہے جو اجنبی بھی ہے اور تعلق دار بھی۔ اس شعر میں یگانہ دو مختلف سطحوں پر معانی دیتا ہے۔

شعر نمبر ۴: اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں — تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

تشریح: اے محبوب ہم تجھ پر عاشق ہوئے اور اس جرم کی سزا کے طور پر نجانے کیا کیا ہمارا مقدر ہو گیا۔ تیرے ہجر میں ہم نے اذیتیں برداشت کیں۔ ہزاروں مشکلات و مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ہر طرف سے لعنت اور پھٹکار کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی وہ کونسی بلا تھی جو تیرے عشق میں ہم پر نازل نہ ہوئی لیکن ہم پھر بھی تیرے عشق میں ثابت قدم اگر رہے۔

شعر نمبر ۵: کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں — کبھو تو نے آ کر تماشا نہ دیکھا

تشریح: اے محبوب ہم نے تیرے عشق میں اپنے دل و جسم پر بے شمار زخم اور داغ کھائے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص ہمیں دیکھے تو داغوں کی کثرت کی وجہ سے وہ ہمارے جسم کو روشنی کا جھاڑ قرار دے گا۔ لیکن اس کے باوجود تو کبھی ان داغوں اور داغوں کے باعث ہماری کیفیت کا مشاہدہ کرنے نہیں آیا۔ شاعر کو اس مشاہدے کی خواہش غالباً اس لئے ہے کہ محبوب یہ کیفیت دیکھے گا تو اُسے اپنے مظالم کا احساس ہو گا اور وہ مہربان ہو جائے گا۔

شعر نمبر ۶: تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے — ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

تشریح: درد کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا یقیناً وہ تمہاری غفلت کی بنا پر پیش آیا۔ یعنی اگر تم ہم سے غفلت نہ برتتے اور ہمارے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرتے تو یقیناً ہم عشق و ہجر میں پیش آنے والے مظالم کا شکار نہ ہوتے۔ لیکن اے محبوب تو ہم پر مہربان نہ ہوا۔ چنانچہ یہ ستم برداشت کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہے۔

شعر نمبر ۷: حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم — کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

تشریح: درد کہتے ہیں کہ محبوب یعنی اللہ تعالیٰ کا چہرہ ہمارے خیال کے مطابق پردے میں تھا اور ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن مرنے کے بعد حقیقت معلوم ہوئی تو اندازہ ہوا کہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان خود ہمارا وجود اور ہمارا نفس ہی پردے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جب ہم اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ہمارا وجود ختم ہو گیا تو ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے

درمیان کوئی پردہ نہ رہا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم پر یہ حقیقت موت کے بعد منکشف ہوئی۔ علامہ اقبال اسی بات کو ذرا مختلف انداز میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

؎ میری ہستی ہی تھی مری نظر کا پردہ — اُٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر

؎ عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا — حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

؎ ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر — ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

شعر نمبر ۸: شب و روز اے درد درپے ہوں اُسکے — کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا!

تشریح درد کہتے ہیں کہ میں بھی کتنا سادہ ہوں؟ اس کا اندازہ اِس امر سے لگائیے کہ میں اِس دنیا میں اُس ہستی کو پانے کی جستجو کر رہا ہوں جسے آج تک نہ کوئی پا سکا، نہ کوئی دیکھ سکا اور نہ کوئی سمجھ سکا۔ پھر بھلا میں کیا پاؤں گا کیا دیکھوں اور کیا سمجھوں گا۔

غزل نمبر ۳

حلِ لغات نت۔ ہمیشہ، سدا: گلیم۔ چادر: خلل۔ خرابی، فتور، بگاڑ: بار۔ بوجھ: دوش۔ کاندھا: ناؤنوش۔ عیش و عشرت: بدرغہ، رہنما: قضا۔ قسمت، تقدیر، موت: ڈہل۔ ڈھول، نقارہ: خروش۔ شور و غل: ملال۔ غم: شگفتہ۔ خوش و خرم: خرقہ۔ پیوند لگا ہوا لباس، گدڑی، درویشوں کا لباس: جامہ۔ پوشاک، لباس۔ قبا، پیراہن:

شعر نمبر ۱: اُسکی بہار حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے — فصلِ بہار جس کے ہاں ایک یہ گُل فروش ہے

تشریح درد کہتے ہیں کہ ہمارے دل میں اُس حسن کی بہار اور تر و تازگی کا پُر جوش عشق ہے جس کے سامنے حسن کے تمام مظاہر ہیچ ہیں۔ یہاں تک کہ موسم بہار بھی اُس کے سامنے ایک بے مایہ پھول بیچنے والے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ فصلِ بہار کی بے وقعتی ظاہر کرنے کے لئے اُسے گُل فروش کہا گیا ہے۔

شعر نمبر ۲: بخت سیہ برنگ شب نت ہی گلیم پوش ہے — شمع بھی اپنے ہاں اگر ہے تو سدا خموش ہے

تشریح میر درد کہتے ہیں کہ ہماری بدنصیبی ہمیشہ ہی سیاہ رنگ کی چادر اوڑھے رہتی ہے جس کی وجہ سے ہماری قسمت میں کوئی نور اور روشنی نہیں ہے۔ بالفرض ہمارے گھر میں کوئی شمع بھی ہے تو وہ بھی جلنے سے عاجز و قاصر ہے اور بجھی ہوئی ہے۔ یعنی روشنی کا یہ وسیلہ بھی روشنی نہیں دیتا۔ واضح ہو کہ سیاہ رنگ کی گلیم ماتم کی حالت میں اوڑھی جاتی ہے گویا اس طرح قسمت کو مصروفِ ماتم دکھایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جہاں ماتم ہوگا وہاں مسرت و شادمانی نہیں ہوگی۔

شعر نمبر ۳: خلوتِ دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل ۔ حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبالِ گوش ہے

تشریح درؔد کا خیال ہے کہ ہمارے دل کی تنہائی یعنی عشق نے ہمارے حواس میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے اور ہم مجنون و دیوانے ہو گئے ہیں ۔ جس کے باعث صورت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ حُسن جس سے آنکھوں کو محفوظ ہونا چاہیے تھا آنکھوں کے لئے مصیبت بن گیا ہے اور نغمہ جسے کانوں کے لئے خوش کن ہونا چاہیے تھا وہ کانوں کے لئے عذاب بن گیا ہے ۔ یعنی ان چیزوں سے محفوظ ہونے کی بجائے ہم تڑپ اُٹھتے ہیں اور درد و کرب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ مرزا غالبؔ نے بھی اپنے بہت سے اشعار میں عشق کو خلل دماغ قرار دیا ہے ۔

؎ عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس ۔ وصل زنگارِ رُخِ آئینۂ حسنِ یقین !

؎ بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

شعر نمبر ۴: ہو وے تو درمیاں سے آپ اپنے تئیں اٹھائیے ۔ بار نہیں ہے اور کچھ سر اُپی وبالِ دوش کا

تشریح درؔد کہتے ہیں کہ ہماری مصیبتوں اور پریشانیوں کا اور کوئی علاج نہیں ۔ اگر کوئی علاج ہے تو صرف یہ کہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر لیا جائے یعنی ہم مر گئے تو تمام خرخشے خود بخود ختم ہو جائیں گے یعنی نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری ۔ درؔد کہتے ہیں کہ زندگی کے تمام دُکھ جھیلے جا سکتے ہیں اور ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو طبیعت پہ گراں گزرے اور بوجھ ثابت ہو البتہ اپنا سر ہی کاندھوں کے لئے مصیبت نظر آتا ہے ۔ کہیں سر ٹکرا کر مر جائیں گے تو تمام عذاب ختم ہو جائیں گے ۔ غالبؔ کہتے ہے ۔

؎ شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش ۔ صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

شعر نمبر ۵: نالہ و آہ کیجئے خونِ جگر ہی پیجئے ۔ عہد شباب کہتے ہیں موسم نائے و نوش ہے

تشریح درؔد کا خیال ہے کہ انسان کی زندگی میں جوانی ایسا دور ہے جس میں عیش و عشرت ہونی چاہیے اور اس عمر میں انسان کو سرمست و سرشار رہنا چاہیے ۔ لیکن ہمارے مقدر میں نہ عیش و عشرت ہے نہ سرمست و سرشار رہنے کے مسائل ۔ ایک لے دے کر خونِ جگر ہے ۔ سو اس کو شراب سمجھ کر پینا چاہیے اور ہمہ وقت نالہ و فریاد اور آہ و زاری میں مصروف رہنا چاہیے ۔ اِس شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ درؔد کے نزدیک جوانی اس دورِ حیات کا نام ہے جس میں انسان رات دن محنت کر کے اور اپنے خونِ جگر کو کام میں لا کر نت نئے نقش ابھارتا اور سرمست و سرشار رہتا ہے اور یہ وہی بات ہے جسے اقبالؔ نے بہت بعد میں ان لفظوں میں پیش کیا ۔

ے ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام۔ سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

شعر نمبر ۶:۔ خیر تجھے جو چاہیے بدرقۂ جنوں نہ چھوڑ ہم نے جہاں کی سیر کی رہزنِ خلق ہوش ہے

تشریح | درد کہتے ہیں کہ اگر تجھے کوئی رہبرو رہنما چاہیے تو پھر جنون کو ترک نہ کر اور اس کا دامن تھام لے۔ اس لئے کہ اگر تم نے عقل کو اپنا رہنما بنایا تو یہ رہنمائی کرنے کی بجائے لوگوں کے ہوش و حواس اور اُن سے حقائق تک پہنچنے کی صلاحیت چھین لیتی ہے اور یہ بات ہم اس بناء پر کہہ رہے ہیں کہ ہم نے پوری دنیا کو دیکھا ہے اور ہمیں دنیا کا طویل تجربہ ہے۔

دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وہی رویہ ہے جو بعد ازاں اقبال کے ہاں عقل و عشق کی آویزش کی صورت میں نمایاں ہوا اور اقبال نے کھل کر عقل کی خامیوں اور نقائص کی وضاحت کی۔

شعر نمبر ۷:۔ بے خبروں کو پھر کہیں دستِ قضا چھیڑ تو۔ مثلِ دہل ہر ایک میں ورنہ بھرا خروش ہے

تشریح | اے تقدیر تو اُن لوگوں نہ چھیڑ جو خود فراموش ہیں اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہیں۔ بصورت دیگر تمہیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہ لوگ بظاہر خاموش اور ہر طرح کے گناہوں سے دور ہیں، ان میں بھی شور و غل بھرا ہوا ہے جس کی وجہ سے دنیا ان کی طرف متوجہ ہو گی۔

شعر نمبر ۸:۔ غیر ملال زاہدا کیا ہے طریقِ زہد میں دل ہو شگفتہ جس جگہ کوچہ مے فروش ہے

تشریح | اے عبادت کرنے والے خشک و بے کیف انسان! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تمہاری روایتی عبادت گزاری صرف اور صرف رنج و غم اور افسوس کا باعث بنتی ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ غالب نے بھی کہا ہے۔

ے واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

یا جس طرح اقبال نے ذرا مختلف انداز میں کیا ہے۔

ے میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

درد کہتے ہیں کہ تمہاری بے کیف زندگی رنج و ملال کے سوا کچھ نہیں جبکہ میخانے اور اُس گلی میں جہاں میخانہ واقع ہے، ایسی کیفیت موجود ہے جو پژمردہ دلوں کو پھول کی طرح کھلا دیتی اور مسرت و شادمانی سے سرشار کر دیتی ہے۔

شعر نمبر ۹:۔ اپنے تئیں تو کام کچھ خرقہ و جامہ سے نہیں۔ درد اگر لباس ہے دیدۂ عیب پوش

تشریح | درد مقطع میں کہتے ہیں کہ ہمیں گدڑی اور قبا و پوشاک سے کوئی تعلق نہیں یعنی ہم نہ تو فقیروں کی طرز کے پھٹے پرانے لباس کو پسند کرتے ہیں اور نہ امراء کا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے خیال میں اگر کسی چیز کو لباس کی حیثیت حاصل ہے تو وہ صرف نظر ہے جو لوگوں کے عیوب اور اُن کی خامیوں پر پردہ ڈالتی ہے۔ یعنی درد کے نزدیک زندگی گزارنے

کسے دو رویے ہیں ایک وہ جس میں انسان دوسرے کے عیوب کے بارے میں ٹوہ لگاتا اور انہیں منظرِ عام پر لاکر لوگوں کو رسوا کرتا ہے اور یہ ناپسندیدہ رویہ ہے ۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ انسانوں کی خامیوں پر پردہ ڈالا جائے اور ان کی عیب پوشی کی جائے ۔ یہ رویہ پسندیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ستار العیوب ہے اور قرونِ اوّل کے مسلمانوں کی بھی خصوصیت تھی ۔

میر تقی میر

سوانحی حالات میر تقی نام اور میرؔ تخلص کرتے تھے ۔ میر ۱۷۲۳ء میں آگرے میں پیدا ہوئے آپ کے والدِ گرامی میر محمد علی متقی اپنے زہد و تقویٰ اور پرہیز گاری کے سبب لوگوں میں علی متقی کے نام سے مشہور تھے ۔ میرؔ کی ابتدائی تربیت بھی اسی درویشانہ ماحول میں ہوئی ۔ ابھی دس برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور آپ اپنے منہ بولے چچا میر امان اللہ کے سایۂ شفقت میں آ گئے مگر ایک سال بعد چچا بھی فوت ہو گئے اس پر ستم یہ کہ ان کے سوتیلے بھائیوں نے انہیں گھر سے نکال دیا ۔ اس چھوٹی سی عمر میں بے یار و مددگار ہو جانے نے آپ کی جذباتی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے ۔ ناچار تلاشِ معاش میں آگرہ چھوڑ دہلی کا رخ کیا اور ماموں خان آرزو کے گھر بسیرا کیا مگر بھائیوں نے ماموں کو لکھا کہ "میرؔ فتنہ روزگار ہے اسے گھر میں پناہ نہ دیجئے گا" نتیجتاً خان آرزو کا گھر بھی چھوڑنا پڑا جس کا میرؔ کو بہت افسوس ہوا کیونکہ خان آرزو کا گھر دہلی میں علم و ادب کا گہوارہ تھا وہاں کی علمی صحبتوں اور شعری مجلسوں سے میرؔ کے ذوقِ شعری کی تربیت ہوتی تھی ۔ بہرحال میرؔ کو ایک عرصہ دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں پھر یہ وہ زمانہ تھا جب مرہٹوں اور جاٹوں نے دہلی میں غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا ۔ پھر کبھی احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تاراج کیا تو کبھی نادر شاہ نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ۔ اسی دورِ ابتلا میں میرؔ کی زندگی کا ایک بڑا عرصہ گزرا ۔ اس سیاسی انتشار، معاشرتی بدحالی اور معاشرتی بحران نے میر کے حساس ذہن پر دائمی اثرات مرتب کئے ۔ جب دہلی کے امراء و شرفاء ایک ایک کر کے دہلی سے کوچ کرنے لگے تو میرؔ کو بھی ناچار دہلی کو الوداع کہنا پڑا اور وہ ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ پہنچے ۔ نواب آصف الدولہ نے بہت آؤ بھگت کی اور دو سو روپے وظیفہ مقرر کیا ۔ مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد نواب اودھ سے کسی بات پر ناچاقی ہو گئی اور آپ گوشہ نشین ہو گئے آخر ۱۸۱۰ء میں داعیٔ اجل کے پیغام پر لبیک کہا اور لکھنؤ میں ہی مدفون ہوئے ۔

محاسنِ کلام

میر تقی میر کو اُن کی شاعرانہ عظمت کی بدولت بجا طور پر شاہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق "میر اردو شاعروں کے سرتاج ہیں۔ اگر دنیا کے ایسے شعراء کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا تو میر کا نام اس میں ضرور شامل ہوگا۔" میر نے غزل کے ساتھ ساتھ تقریباً سبھی اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی اور اپنے استادِ فن ہونے کا لوہا منوایا۔ اردو کے تقریباً سبھی بڑے شعراء نے اُن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے اور انھیں استاد مانا ہے مثلاً

- سودا تو اس زمین میں غزل در غزل ہی لکھ — ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف (سودا)
- ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا (غالب)
- نہ ہوا، پر نہ ہوا، میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا (ذوق)
- حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں — شاگرد میرزا کا، مقلد ہوں میر کا (حالی)
- شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرت — میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں (حسرت)

میر کو اپنے استادِ فن ہونے کا خود بھی پورا احساس تھا۔ جس کا اظہار اُن کے دیوان میں شاعرانہ تعلّی کی صورت میں جا بجا ملتا ہے جیسے وہ خود فرماتے ہیں۔

- سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا!

میر کی الم پرستی

میر کی شاعری اُن کے اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ انہوں نے اپنی ساری عمر معاشی کشمکش اور معاشرتی بدحالی میں گزار دی۔ انھیں زندگی بھر راحت و سکون نہ مل سکا۔ اس آشوبِ ذات کے ساتھ ساتھ اُن کے زمانے کی سیاسی ابتری اور غارت گری نے بھی اُن کی ذات پر گہرے نقوش چھوڑے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں آشوبِ ذات کے ساتھ آشوبِ زمانہ کی تلخی بھی نظر آتی ہے۔ انہی عوامل نے اُن کی شخصیت میں یاس و ناامیدی اور قنوطیت کو جنم دیا اور الم پرستی اُن کی شاعری کا خاصا بن گئی۔

۱۔ دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا!

۲۔ یا روئے یا رلایا اپنی تو یونہی گزری — کیا ذکر ہم صفیراں، یارانِ شادماں کا

۳۔ ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے — درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

۴۔ مصرعہ کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں — کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

سوز و گداز کا منفرد انداز

میرؔ کی ذات میں اُن کی ذاتی حرماں نصیبی، اُن کے زمانے کی سیاسی ابتری، معاشرتی بدحالی اور دنیا کی بے ثباتی نے سوز و گداز کو جنم دیا۔ اُن کی طبیعت نے ہر شخص کے غم کو اپنا دکھ بنایا اور یوں اُن کی حساس طبیعت کے زیرِ اثر نازک جذبات و محسوسات اُن کی شاعری میں سوز و گداز کی صورت میں نکھر کر سامنے آئے۔

۱۔ پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل ۔ تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
۲۔ اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا ۔ لوہو آتا ہے جب نہیں آتا
۳۔ آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے ۔ دردمندی میں گئی ساری جوانی اپنی
۴۔ ایک سب آگ ایک سب پانی ۔ دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں!

دنیا کی بے ثباتی کے مضامین

میرؔ کے کلام میں انسان کی ناپائیدار زندگی اور دنیا کی بے ثباتی کے مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جو اُن کے سیاسی خلفشار کا ردِ عمل ہیں۔ زندگی کے اس ناثبات اور ناپائیدار پہلو نے میر کی شاعری میں کہیں تصوف اور کہیں انسان کے حقیر ہونے کے احساس کو نمایاں کیا ہے۔

۱۔ شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی ۔ انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں
۲۔ سرسری تم جہان سے گزرے ۔ ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا!
۳۔ یہ توہم کا کارخانہ ہے ۔ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا!
۴۔ مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے ۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

ندرتِ بیان اور جدّتِ خیال

میرؔ زندگی کے تجربات کو اپنی ذات کی حساسیت اور تنوع کی بدولت نئے معنی اور اچھوتا انداز پہنا دیتے ہیں اور یوں اُن کے اشعار ندرتِ بیان کے خوبصورت مرقع اور جدّتِ خیال کی بلندی پروازی کے بے مثال نمونے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ کہا میں نے کتنا ہے گل کو ثبات ۔ کلی نے سن کر تبسّم کیا!
۲۔ شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے ۔ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
۳۔ اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے ۔ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
۴۔ تیرے فراق میں جیسے خیال مفلس کا ۔ گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

رمز و ایمائیت

غزل کی بنیادی خصوصیات میں رمز و ایما و اشاریت اور ایجاز و اختصار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ میرؔ کے کلام میں غزل کے یہ اوصاف بھرپور

انداز میں نمایاں نظر آتے ہیں اور ان صفات کی بدولت اُن کے ایسے اشعار میں ایک جہانِ معنی آباد نظر آتا ہے۔

۱؎ سب پر جس بار نے گرانی کی — اُس کو یہ ناتواں اٹھا لایا!
۲؎ صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا
۳؎ مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

بول چال کا انداز

میرؔ نے اپنے فن کی پختگی کی بدولت زندگی کے تجربات و مشاہدات کو جس خلوص سے اپنے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے اس سے اُن کے شعروں میں گفتگو کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غمگسار مشاورت کے انداز میں بیٹھے اپنی اپنی داستانِ غم بیان کر رہے ہوں۔

۱؎ فقیرانہ آئے صدا کر چلے! — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
۲؎ ہم فقیروں سے کج ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
۳؎ نازکی اُس کے لب کی کیا کہیئے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
۴؎ باتیں ہماری یاد رہیں گی، پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
جو کہتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

موسیقیت اور مترنم بحریں

میرؔ کے کلام کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں موسیقیت اور ترنم کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اُن کی لمبی بحروں والی غزلیں اپنے صوتی آہنگ اور ردیف کی تکرار کی وجہ سے ترنم کی عمدہ مثالیں ہیں۔

۱؎ چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم بادو باراں ہے
۲؎ پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
۳؎ الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

تشبیہ و استعارہ کا خوبصورت استعمال

میرؔ ایک استادِ فن تھے جنہوں نے اپنے کلام میں تمام شعری قرینوں کو نہایت فنی پختگی اور استادانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ اُن کا کلام جہاں صنائع و بدائع کے استعمال سے لفظی و معنی

خوبیوں سے آراستہ ہے وہاں تشبیہ و استعارہ کے استعمال کی بھی نہایت عمدہ مثالیں اُن کے دیوان میں جا بجا بکھری نظر آتی ہیں۔

۱۔ تیرے فراق میں جیسے خیال مفلس کا — گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری
۲۔ شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
۳۔ دیدنی ہے شکستگی دل کی — یہ عمارت غموں نے ڈھائی ہے
۴۔ دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

غزلیات

غزل نمبرا

حلِ لغات مستعار۔ ادھار لیا ہوا۔ ناصبور۔ بے صبر، بے قرار۔ تشور۔ قیامت۔ پرتوے۔ پرتو، عکس، سایہ، شعاع۔ بے حضور۔ غیر حاضر۔ منعم۔ مال دار، نعمت والا، سخی، آقا۔ قاقم۔ نیولے کی نرم و گداز پشم سے بننے والا قیمتی لباس۔ سنجاب۔ وہ کپڑا جس کے گرد گوٹ لگی ہو۔ عور۔ برہنہ، ننگا، عریاں۔ سپہر۔ آسمان۔ کاسہ۔ پیالہ، جام۔ کاسۂ سر۔ کھوپڑی جس کی شکل پیالے جیسی ہوتی ہے۔ یکسر۔ بالکل، تمام کا تمام۔ استخوان۔ ہڈی۔ شکست۔ ہار۔ ٹوٹ پھوٹ، ریزہ ریزہ۔ فہم۔ عقل۔

شعر نمبر ۱: تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا — خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

تشریح میر تقی میر ہمہ اوستی نقطۂ نظر کے مطابق کہتے ہیں کہ اس دنیا میں حسن کے جس قدر بھی مظاہر ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے نور سے مستعار لئے گئے ہیں یعنی اللہ کے نور ہی کے باعث حسن کے ہر مظہر کا وجود قائم ہے۔ میر کہتے ہیں کہ مثلاً سورج کا ایک ایک ذرہ اور ایک ایک شعاع میں اللہ ہی کا نور ظاہر ہو رہا ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور عنایت نہ ہو تو سورج ایک لمحے کے لئے بھی قائم نہ رہ سکے۔ واضح رہے کہ تصوف کے ہمہ اوستی نقطۂ نظر کے مطابق اس کائنات کی ایک ایک چیز میں اللہ تعالیٰ ہی جلوہ گر ہے۔

شعر نمبر ۲: ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا — پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

تشریح میرا بے صبر و بے قرار دل شور و غل اور ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھا اور اس کے ایک ایک نالے اور ایک ایک آہ پر حشر و قیامت کے ہنگامے کا گمان ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرا دل نہیں تڑپ رہا بلکہ قیامت برپا ہے۔

شعر نمبر ۳: پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

تشریح میرؔ کہتے ہیں کہ جب تک مجھے اپنی صلاحیتوں، خوبیوں، خامیوں، بے بسیوں اور حدود و قیود کا احساس نہیں تھا تو میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی قدرت کاملہ سے بھی مکمل طور پر بے خبر تھا۔ لیکن جیسے ہی مجھ پر اپنی ذات آئینہ ہوئی تو میں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا اور مجھے احساس ہوا کہ میں خود ہی حقیقت سے بہت دور تھا۔ میرؔ کا یہ شعر درج ذیل حدیث قدسی کا ترجمہ نظر آتا ہے ۔" من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"۔ واضح رہے کہ بعد ازاں حضرت علامہ اقبال کا تصور خودی بھی اس بنیادی حقیقت سے متعلق ہے ۔

شعر نمبر ۴:۔ آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم　　　یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

تشریح میرؔ کہتے ہیں کہ اے موسیٰؑ تمہارے دل میں عشق کی آگ نہیں بھڑک رہی تھی۔ اگر دل میں یہ آگ موجود ہوتی تو پھر معلوم ہوتا کہ آپ کو نہ تو کوہ طور پر جانے کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی وہاں اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خواہش کا اظہار کرنا پڑتا ۔ اس لئے کہ دل میں جلنے والی آگ کا ایک ایک شعلہ کوہ طور جیسے سینکڑوں پہاڑوں کے کھلیانوں کو جلا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔

اس شعر میں میرؔ ~~دد~~ (لکی ہر) در اصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو تجلی کوہ طور پر نظر آئی اور جس کی بنا پر کوہ طور جل گیا ۔ اس تجلی سے سینکڑوں گنا تجلی انسان کے دل میں موجود ہے اس لئے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی جلوہ گاہ ہے ۔

شعر نمبر ۵:۔ مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر　　　کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

تشریح میرؔ اپنے محبوب سے تخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رات بھی ہمیشہ کی طرح بزم آراستہ تھی لیکن رات صرف تو اس میں موجود نہ تھا اور صرف تمہاری عدم موجودگی کے باعث ہر چیز بے رونق ہو کر رہ گئی تھی ۔ مثلاً نہ تو بزم میں شمع روشن تھی اور نہ شمع کے گرد پروانے محو طواف تھے ۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ بزم کی تمام تر رنگینیاں صرف تمہارے وجود کی مرہون منت ہیں ۔ اگر تو موجود نہ ہو تو یہ رنگینیاں بھی برقرار نہیں رہ سکتیں ۔

شعر نمبر ۶:۔ منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا　　　اس رند کی بھی رات گزر گئی جو عور تھا

تشریح میرؔ کہتے ہیں کہ وہ لوگ جو امراء میں شمار ہوتے ہیں اور اعلیٰ کپڑے زیب تن کرتے ہیں، اُن کی زندگی بھی گزر جاتی ہے اور وہ لوگ جو فاقہ مست اور غریب و نادار ہوں اُن کا وقت بھی رک نہیں سکتا ۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ امراء کی زندگی قدرے سہولت سے گزرتی ہے جبکہ عریاں اور ننگے رہنے والے غریب غرباء کی زندگی قدرے مشکل سے گزرتی ہے ۔

شعر نمبر ۷ : ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

تشریح میرؔ آسمان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے تقدیر بنانے اور بگاڑنے والے آسمان! وہ شوخ محبوب ہماری بات نہیں سنتا تھا، ہمارے عشق سے انکار کرتا تھا اور اپنے غرور و نخوت کی وجہ سے ہمارے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش نہیں آتا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ وہ ہم پر مہربان ہو جائے۔ لہٰذا اُسے اپنا رفیق اور دوست بنانے کے لئے ہم نے جان کی بازی لگا دی اور یوں ہم خاک میں مل گئے یعنی تباہ و برباد ہو گئے لیکن چلئے ہم نے اپنا مقصد تو حل کر لیا اور وہ ہمارے عشق کا اعتبار و اعتراف تو کرنے لگا۔ غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ میرؔ اس شعر میں جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ عشق بچوں کا کھیل نہیں ہے اور اس میں جان پر کھیل کر اپنے مقاصد حاصل کرنا پڑتے ہیں۔

شعر نمبر ۸ : کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

۹ : کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

شعر نمبر ۱۰ : تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

تشریح اس غزل کے آخری تینوں شعر قطعہ بند ہیں۔ میرؔ کہتے ہیں کہ کل اچانک میرا پاؤں ایک ایسی کھوپڑی پر پڑا جو ٹھوکروں اور ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ جیسے ہی میرا پاؤں اس کھوپڑی پر پڑا تو اس میں سے آواز آئی کہ اے اپنے انجام اور موت سے بے خبر انسان! ذرا سنبھل کر اور دیکھ کر چل۔ اپنے انجام پر نظر رکھ اور یاد رکھ کہ ایک وقت آئے گا جب تو بھی موت کا شکار ہو کر میری طرح بے روح ہو جائے گا اور پھر تیری ہڈیاں بھی بکھر جائیں گی۔ اے مجھ کو روندنے والے! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ ایک زمانہ تھا جب میں بھی زندہ اور جیتے جاگتے انسان کا ایسا سر تھا جس میں غرور و تکبر کے جذبے بھرے ہوئے تھے لیکن آج میں لوگوں کی ٹھوکروں میں ہوں۔

میرؔ کھوپڑی کی بات سن کر کہتے ہیں کہ یقیناً وہ شخص جو اپنے حسن و شباب کے اعتبار سے بہشت کی حوروں سے بھی بہتر تھا اور اب مر کر مٹی میں مل چکا ہے، ہم ہی سے تعلق رکھتا تھا یعنی کوئی انسان ہی تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم اُسے سمجھ نہ سکے اور یہ ہماری عقل کے نقص کی وجہ سے ہوا۔ گویا میرؔ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی ظاہری شان و شوکت اور آن بان پر غرور کرنے کی بجائے اپنے انجام پر بھی نظر رکھنا چاہیے۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات تن۔ جسم؛ پیراہن۔ لباس؛ سرکشی۔ باغی، متکبر، مغرور؛ ساں۔ حرفِ تشبیہ، کی طرح، مانند؛ بدر۔ پورا چاند؛ ماہِ نو۔ پہلی رات کا چاند؛ دھونی رمانا۔ ہندو

جوگیوں اور فقیروں کا آگ کا الاؤ جلا کر بیٹھنا ؛ آسن ۔ بیٹھک، بیٹھنے کی جگہ ؛ منت ۔ احسان ؛ خار و خس ؛ کانٹے اور گھاس پھوس ؛ گلخن ۔ بھٹی، چولہا ؛ دوں ۔ شعلہ، لو، آگ، حدت ؛

شعر نمبر ۱: دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا ــ آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

تشریح ــ میرؔ کہتے ہیں کہ جب سے ہمارے خاکی جسم میں دل یعنی عشق کا جذبہ شعلہ زن ہوا ہے اُس وقت سے ہمارا جسم جلنے لگا ہے۔ گویا یہ دل یا عشق ایسی چنگاری کی مانند ہے جو کپڑوں پر گر گئی ہو اور چونکہ چنگاری کپڑوں کو جلا دیتی ہے لہٰذا دل نے بھی ہمارے جسم کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔

شعر نمبر ۲: سرکشی ہی ہے جو دکھلاتی ہے اس مجلس میں داغ ــ ہو سکے تو شمع ساں دیجئے رگِ گردن جلا

تشریح ــ میرؔ ایک کہاوت "غرور کا سر نیچا" کو اپنے الفاظ میں نظم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بغاوت اور غرور و تکبر کا جذبہ ہے جو دنیا میں انسان کو ذلیل و خوار اور رسوا کر دیتا ہے اور کبھی نہ کبھی مغرور سر کو جھکنا پڑتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ جس طرح شمع اپنے سر کو جلا کر غرور و نخوت کا خاتمہ کر دیتی ہے بالکل اسی طرحِ انسان کو بھی اپنی اونچی اور اکڑی ہوئی گردن یعنی غرور و تکبر کو جلا دینا چاہیے۔ اس کے بعد انسان ذلت و خواری سے بچ جاتا ہے۔ یاد رہے کہ شمع کے جس حصے کو آگ لگتی ہے میرؔ اسے شمع کا سر قرار دے کر غرور و تکبر کے خاتمے کا عمل قرار دے رہے ہیں۔

شعر نمبر ۳: بدر ساں اب آخر آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ ــ ورنہ پہلے تھا مرا جوں ماہِ نو دامن جلا

تشریح ــ مہینے کی پہلی تاریخوں کے چاند کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا ایک ذرا سا حصہ روشن اور باقی حصہ تاریک ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ روشن حصہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تیرھویں اور چودھویں تاریخ کو پورا چاند روشن ہو جاتا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ چاند کی طرح عشق کی آگ بھی پہلے پہل صرف میرے دل تک محیط تھی۔ لیکن بعد میں یہ آگ پھیلتی چلی گئی اور اب اس نے میرے پورے جسم کو گھیر لیا ہے۔ یہ شعر حسنِ تحلیل کی اچھی مثال ہے۔

شعر نمبر ۴: کب تلک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رہوں ــ بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو مرا آسن جلا

تشریح ــ میرؔ کہتے ہیں کہ میں نے تیرے عشق میں جوگ اختیار کیا اور جس طرح ہندو فقیر آگ کا الاؤ جلا کر اس کے قریب بیٹھتے ہیں ایسے تیرے دروازے کے سامنے دھونی رما کر اور آگ جلا کر بیٹھ گیا ہوں لیکن آخر میں اس طرح کب تک بیٹھا رہوں۔ اس لئے کہ اب تو آگ کی حدت کے باعث میرے بیٹھنے کی جگہ بھی جلنے لگی اور میرے لئے بیٹھنا مشکل ہو گیا۔

شعر نمبر ۵: ہو جو منت سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی ــ کاٹ اپنی رات کو خار و خس گلخن جلا

تشریح ــ میرؔ کہتے ہیں کہ اگر کسی کا احسان اُٹھا کر باغ یا کسی دوسرے عیش و عشرت کے مقام پر رات گزارنے کا موقع میسر آئے تو اس سے بہتر ہے کہ انسان غربت و ناداری میں عیش و عشرت

کے سامان سے بہت دور کسی بھٹی ہیں کانٹے اور گھاس پھوس جلا کر اپنی رات گزارے۔ گویا میرؔ کہتے ہیں کہ کسی کا احسان اٹھانے کی نسبت تکلیف برداشت کرنا اور خودداری سے زندگی گزارنا زیادہ بہتر ہے۔ یہی بات اقبال کہتے ہیں۔

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو۔ تجھے بھی چاہیئے مثلِ حبابِ آبجو رہنا!

شعر نمبر ۶: سوکھتے ہی آنسوؤں کے نور آنکھوں کا گیا! ۔ بجھ ہی جاتے ہیں دیئے جو وقت سب روغن جلا

تشریح: میرؔ آنکھوں کو چراغ اور آنسوؤں کو تیل سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ چراغ اُس وقت تک جلتا ہے، جب تک اُس میں تیل اور روغن موجود ہو۔ اگر تیل ختم ہو جائے تو دیا بھی بجھ جائے گا۔ چونکہ ہماری آنکھوں کے لئے آنسو تیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا جب تک آنسو بہتے رہے تب تک ہماری آنکھوں میں بینائی موجود رہی لیکن جب آنکھیں خشک ہوئیں اور آنسو سوکھ گئے تو ہم بینائی سے محروم ہو گئے۔

اِس شعر کا مفہوم یہ بھی ہے کہ مشکلات و مصائب میں زندگی گزارنے والا شخص صاحبِ بصیرت ہو جاتا ہے اور عیش و عشرت میں پرورش پانے اور دکھوں سے دور رہنے والا شخص حقائقِ زندگی کا عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔

شعر نمبر ۷: شعلہ افشانی نہیں یہ کچھ نئی اس آہ سے ۔ دوں لگی ہے ایسی ایسی بھی کہ سارا بن جلا

تشریح: میری آہوں سے لگنے والی آگ سے گھبرانے والو! ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس لئے کہ میری آہوں سے ایسی آگ کوئی پہلی دفعہ نہیں لگی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کتنی ہی بار ایسی آگ بھڑک چکی ہے جس نے سارا جنگل جلا کر رکھ دیا ہے۔ جنگل یہاں پر جسم کے معنی بھی دے سکتا ہے۔

شعر نمبر ۸: آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میرؔ ۔ دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

تشریح: میرؔ مقطع میں کہتے ہیں کہ اے میرؔ میرے دل میں اک آگ سلگ رہی ہے اگرچہ ابھی اِس میں وہ حدّت و حرارت پیدا نہیں ہوئی جو آگ کا خاصہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ آگ کبھی بھڑک اٹھی تو یقین ہے کہ اس حرارت کے باعث میری ہڈیوں کو ایندھن اور گھاس پھوس کی طرح جلا کر راکھ کر دے گی۔

غزل نمبر ۳

حلِ لغات: کاد کاد۔ سخت محنت، تکلیف، کاوش۔ زار و نزار۔ دُبلا پتلا، کمزور، ضعیف۔ شتابی۔ جلدی۔ نبہ۔ نباہ۔ تسلیم۔ اطاعت کرنا، قبول، ماننا۔

شعر نمبر ۱:۔ جیتے جی کوچہ دلدار سے جایا نہ گیا　　اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا

تشریح | میرؔ کہتے ہیں کہ جب تک ہم زندہ رہے اور جب تک ہماری جان میں جان رہی ہمارے لئے محبوب کا کوچہ چھوڑنا ممکن نہ ہوا اور ہم اُس کے گھر کی دیوار کے سائے تلے بیٹھے رہے یعنی جب تک زندگی ہے تب تک عشق سے نجات اور چھٹکارا ممکن نہیں۔ یہی بات دوسرے لفظوں میں غالبؔ نے یوں پیش کی ہے۔

؎ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شعر نمبر ۲:۔ کاو کاوِ مژۂ یار و دلِ زار و نزار!　　گتھ گئے ایسے شتابی کہ چھڑایا نہ گیا!

تشریح | میرؔ کہتے ہیں کہ ایک طرف محبت کی سختیاں ہیں اور دوسری طرف میرا کمزور و ناتواں دل ہے جو اس قابل نہیں کہ محبت میں پیش آنے والی سختیوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے باوجود جب عشق اور دل کا آمنا سامنا ہوا تو یہ دونوں ایک دوسرے سے یوں بھڑ گئے کہ ان کو علیحدہ کرنا مشکل ہو گیا یعنی باوجودیکہ دل عشق کی سختیاں برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتا لیکن محبوب کے نظارول اور وصال کی خواہش کے باعث ترکِ عشق بھی اس کے بس کی بات نہیں ہوتی دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اگر عشق ایک بار دل میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لے تو پھر دل سے اس کا نکلنا مشکل ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۳:۔ وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا　　ہم سے ہی حالِ تبہ اپنا دکھایا نہ گیا

تشریح | میرؔ کہتے ہیں کہ میں محبوب کی بزم میں گیا اور اس خیال سے گیا کہ اُسے اپنی بربادی کی داستان سناؤں گا اور بتاؤں گا کہ اُس کے عشق میں مجھ پر کیا کیا بلائیں نازل ہوئیں؟ محبوب میری طرف متوجہ بھی ہوا لیکن میری بدنصیبی ملاحظہ فرمائیے کہ خود میری زبان نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور میں محبوب کو اپنا حالِ زار نہیں سنا سکا۔ دراصل میرؔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اوّل تو محبوب سنتا نہیں وہ سنتا ہے تو عاشق کو داستانِ غم سنانے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ وہ حوصلہ بھی کرے تو زبان ساتھ نہیں دیتی اور وہ حواس باختگی کے باعث نامعلوم کیا سے کیا کہنے لگتا ہے، بالکل یہی بات غالبؔ اس طرح کہتا ہے۔

؎ آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے　　کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

شعر نمبر ۴:۔ مرنے آہ سامنے شب یاد دلایا تھا اسے　　پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

تشریح | رات میں نے چاند دیکھا تو مجھے محبوب کی شکل و صورت اور حسن و جمال یاد آ گیا۔ اس کے بعد تمام رات محبوب ہی کی یادوں میں گزر گئی اور سونے کی بجائے میں صبح تک اُسے

یاد کرتا رہا۔

شعر نمبر ۵: زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا ۔ سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا!

تشریح شاید لوگ محبوب کے مظالم کی وجہ سے تڑپتے اور اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوں گے لیکن اے میرؔ اپنی تو یہ کیفیت ہے کہ جب محبوب کے ستم کی تلوار ہماری گردن پر چلی تو تڑپنا اور پھڑکنا تو ایک طرف ہم سے تو محبت میں اطاعت کے جذبے کی وجہ سے سر بھی نہ ہلایا جا سکا۔ یعنی ہم سے اپنے دکھ کا معمولی سا اظہار بھی ممکن نہ ہوا اور ہم نہایت صبر سے سب کچھ برداشت کرتے چلے گئے۔

غزل نمبر ۴

حلِ لغات آتش۔ آگ ؛ ہجراں۔ فراق ؛ معمار۔ تعمیر کرنے والا ؛ قضا۔ تقدیر، مشیتِ الٰہی ؛ مرغوب۔ پسندیدہ۔ دل کو بھانے والا ؛ تنگ۔ کمزور، کم ؛ جائے۔ جگہ ؛ عذر۔ بہانہ ؛

شعر نمبر ۱: دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا ۔ گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا

تشریح میرؔ کہتے ہیں کہ ہم نے بہت کوشش کی لیکن اپنے دل کو ہجر و فراق کی آگ سے نہ بچا سکے اور یہ گھر یعنی یہ دل ہماری آنکھوں کے سامنے جلتا رہا اور ہم اس کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکے دراصل ہجر کی آگ سے دل کو بچانے کا اختیار صرف محبوب کو حاصل تھا۔ وہ عاشق پر مہربان ہو جاتا تو یہ آگ فوراً بجھ جاتی لیکن محبوب کو یہ منظور نہ تھا اور یوں عاشق اپنے دل کے معاملے میں بے بس و مجبور ہو گیا۔ اور اُس کا دل جل گیا۔

شعر نمبر ۲: دل ہی رہ دل ہیں کہ معمارِ قضا سے اب تک ۔ ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

تشریح میرؔ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے محبوب تجھے چاہیے کہ تو میرے دل میں قیام کرے اور اسی میں رہے۔ اس لئے کہ تقدیر اور مشیتِ الٰہی کے ہاتھوں ایسا پسندیدہ اور دل کو بھانے والا کوئی اور مکان نہیں بن سکتا۔ لہٰذا اگر تو دل کو چھوڑ کر کسی اور جگہ قیام کرے گا تو تجھے تکلیف ہوگی لہٰذا یہی بہتر ہے کہ میرے دل کو اپنی قیام گاہ بنا لے۔

شعر نمبر ۳: کیا تنگ حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ ۔ ایک دم رازِ محبت کا چھپایا نہ گیا۔

تشریح ہمیں عشق ہوا اور ہم نے عشق سے متعلق اپنے راز کو چھپانے کی کوشش کی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری محبت کا راز افشا ہو لیکن اس معاملے میں ہماری آنکھوں اور ہمارے دل نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ آنکھوں نے آنسو بہانا شروع کر دیئے اور دل نے آہیں بھرنا شروع کر دیں اور یوں دل اور آنکھوں کی کم حوصلگی کے باعث ہمارا راز افشا ہو گیا۔

شعر نمبر ۴: شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اُس کے گئے — ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

تشریح ہمارے دل کا شہر ایک عجیب و غریب اور نادرِ روزگار مقام تھا۔ لیکن افسوس کہ جب سے محبوب یہاں سے رخصت ہوا اور ہم نے اس کی محبت ترک کر دی اُس وقت سے دل کی حالت ایسی ہو گئی جیسے کوئی اجڑا ہوا شہر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس اجڑے ہوئے شہر کو ہم نے لاکھ بسانے کی کوشش کی لیکن یہ آباد نہ ہو سکا۔

شعر نمبر ۵: میرؔ مت عذر گریباں کے پھٹے رہنے کا کر — زخمِ دل، چاکِ جگر تھا کہ سلایا نہ گیا

تشریح میرؔ کا گریباں پھٹ گیا لوگ کہتے ہیں کہ اے میرؔ تو نے اپنا گریباں کیوں نہیں سلوایا۔ میرؔ طرح طرح بہانے تراشتا اور لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ اے میرؔ تم بہانے نہ بناؤ اور کیا گریباں کا چاک بھی دل کا زخم اور جگر کا گھاؤ تھا کہ کوشش کے باوجود سل نہ سکا۔ یعنی میرؔ کے نزدیک دل اور جگر کا چاک ایسا نہیں ہوتا کہ اُسے سلوایا جا سکے اور اگر بالفرض یہ سلوایا بھی جائے تو یہ مطلوب نہیں ہوتا کہ آرام پہنچے بلکہ شعرا اور عشاق اس سے بھی مزید درد و تکلیف کے طالب ہوتے ہیں جیسا کہ غالبؔ کہتے ہیں۔

؎ زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن۔ غیر سمجھا ہے کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں

غزل نمبر ۵

حلِ لغات مستی۔ نشہ، متوالاپن، مدہوشی ؛ مرغان۔ مرغ کی جمع معنی پرندے ؛ اور۔ کنارا، جانب، طرف ؛ در آنا۔ کسی چیز کا کسی دوسری شے کا اندر سما جانا ؛ صناع۔ ہنرمند، کاریگر ؛ عیب۔ برائی، نقص، خرابی، داغ ؛ زنہار۔ مثبت یا منفی طور پر تاکید کے لئے بولتے ہیں ؛ خضر۔ ایک پیغمبر کا نام جو نہار رہتا ہے۔ بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتا ہے۔ دنیا کی تمام شادابی انہی کے دم قدم سے ہے۔ انہوں نے بہت طویل عمر پائی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ محض ولایت کا ایک نام ہے ؛ حذر۔ پرہیز۔ انکار ؛

شعر نمبر ۱: جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

تشریح اے محبوب ہم جب بھی تیرا نام لیتے ہیں اور تجھے یاد کرتے ہیں تبھی ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ گویا تیری یاد اور آنسو لازم و ملزوم ہیں لیکن تو ہی بتا کہ اگر زندگی ایسی ہو تو اسے گزارنے کے لئے تاب و حوصلہ رکھنے والا جگر کہاں سے لاؤں۔ یعنی نہ تیری یاد سے غافل ہو سکتا ہوں۔ نہ آنسو رکتے ہیں۔ اس طرح زندگی بہت دشوار اور کٹھن ہو گئی ہے۔

شعر نمبر ۲: میخانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ — دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے

تشریح اے شیخ اور دوسروں کو نیک دبا، سمجھانے والے شخص! تو ہمیں شراب خانے میں آنے سے منع کرنا اور روکنا چاہتا ہے۔ لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ ہم رند تو رہے ایک طرف، میخانہ تو وہ جگہ ہے جہاں سورج بھی صبح اپنے سفر کا آغاز کرنے کے فوراً بعد انتہائی مدہوشی کے عالم میں کوئی راستہ نہ پاکر دیوار پھلانگ کر آتا ہے۔ واضح رہے کہ سورج کو دیوار پر سے آتا دکھا کر سورج کی بے تابی کا نقشہ کھینچنا مقصود ہے جبکہ سورج گھروں میں داخل بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ شعر میں صنعتِ حسن تعلیل ہے۔

شعر نمبر ۳: کیا جانے وہ مرغانِ گرفتارِ چمن کو   جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے

تشریح میر کہتے ہیں کہ وہ پرندے جو گلستان میں رہتے ہیں اور جن تک صبح کے وقت نسیم کی ہوا کے جھونکے ہزاروں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے آتے ہیں۔ وہ اُن پرندوں کی کیفیت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں جو پنجرے میں قید ہیں اور جن تک نسیم کا کوئی جھونکا نہیں پہنچتا اور جنھیں گلستان کی مسرتوں میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس شعر میں بنیادی طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔

شعر نمبر ۴: دیواروں سے سر مارتے پھرنے کا گیا وقت   اب تو ہی مگر آپ کبھو اس اور رہ آوے

تشریح اے محبوب ایک زمانہ تھا جب ہم تیرے عشق میں دیوانے ہو گئے تھے اور تجھے پانے اور تجھ تک پہنچنے کے لیئے رات دن دیواروں سے سر ٹکراتے یعنی بے کار کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن ہمارا سر ٹکرانا چنداں مفید نہ ہوا۔ اور ہم تجھے نہ پا سکے۔ آخر کار ہم تھک ہار کر اور مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ اب اگر تو ہمیں ملنا چاہتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تو خود ہماری طرف آئے اور ہم سے ملاقات کرے۔ اقبال نے اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے۔

~ آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر   اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

~ تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے   لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

شعر نمبر ۵: صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی   ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

تشریح میر اپنے زمانے کے بدترین حالات اور اس عہد میں صاحبِ کمال لوگوں کی بدحالی پر افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فی زمانہ سب ہنرمند ذلیل و خوار ہیں اور ان میں مَیں خود بھی شامل ہوں۔ اس دنیا کا طریقہ یہ ہو گیا ہے کہ اب صاحبِ کمال لوگ اپنے ہنر ہی کے باعث نقصان اور خسارے میں ہیں اور ہنر و کمال ہی اُن کا نقص اور خامی بن گیا ہے اور ان صاحبِ کمال لوگوں کی اُن کے ہنر کے باعث جو قدر و منزلت ہونی چاہیے تھی نہ صرف وہ نہیں ہوتی بلکہ انہیں اس کی وجہ سے ذلت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

شعر نمبر ۶: اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ پہ زنہار — کہیو جو کبھو میر بلاکش اِدھر آوے
مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو — ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

تشریح میرؔ کہتے ہیں کہ اے شخص تو سرِ راہ بیٹھا ہوا ہے اگر تجھے میرؔ جو دیوانہ اور مجنون ہے اور بہت زیادہ شراب پینے والا ہے، ادھر سے گزرتا ہوا نظر آئے تو اُسے میرا یہ پیغام دینا اور کہنا کہ اے میرؔ تو محبت کے صحرا میں قدم مت رکھ۔ اس لئے کہ اس راستے میں ایسے بے شمار مقامات ہیں جن سے حضرتِ خضر بھی احتراز و اجتناب برتتے ہیں۔ حالانکہ نہ انہیں جان جانے کا خطرہ ہے اور نہ اُن کے لئے سفر کی مشکلات کوئی نئی چیز ہیں۔ اس کے باوجود وہ محبت کے راستے پر گامزن نہ ہونے ہی میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔

غزل نمبر ۶

حلِ لغات بہاراں۔ بہار؛ پات پتے؛ ہرے۔ سرسبز و شاداب؛ باد۔ ہوا؛ باراں۔ بارش؛ چوانا۔ نچوڑنا، ٹپکانا، انڈیلنا؛ عہد۔ زمانہ، دَور؛ بادہ گسار۔ شراب پینے والا؛ میدان دار۔ مقابل، لڑنے والے، جنگ آزما، بہادر، مداح؛ وصف۔ خوبی، تعریف، کمال، سلیقہ؛ کار۔ کام؛ کار گزار۔ حکم بجا لانے والا، کام میں چست و چالاک؛ لوہو۔ لہو۔ خون؛ لہو پانی ایک کرنا۔ سخت محنت کرنا، خون پانی کی طرح بہانا، بہادری دکھانا؛ لالہ عذار۔ لالے کے پھول جیسے سُرخ گلابی رخسار والا یعنی محبوب؛ کوہکن۔ پہاڑ کھودنے والا، فرہاد۔ جس نے شیریں کو حاصل کرنے کے لئے کوہِ بے ستوں کو کاٹ کر نہر نکالی تھی؛ مجنوں۔ دیوانہ، سودائی مراد قیس؛ پاس۔ خیال، طرف داری؛

شعر نمبر ۱: چلتے ہو تو چمن کو چلیئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے — پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

تشریح میرؔ جن کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قنوطی شاعر تھے یا کم از کم حد درجہ غم پسند اور غم پرست انسان تھے۔ اپنے بنیادی رویے سے بالکل مختلف انداز میں کہتے ہیں کہ اگر آپ سیر کرنا چاہتے ہیں تو پھر کسی دوسری طرف جانے کی بجائے چمن کی طرف چلیئے اس لئے کہ اوّل تو آج کل موسم بہار ہے جس کی وجہ سے درختوں کے پتے تک تر و تازہ ہیں۔ بے شمار پھول کھلے ہوئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے اور بوندا باندی ہو رہی ہے جس سے گلستان کے منظر میں مزید دلکشی اور رعنائی آگئی ہے۔

شعر نمبر ۲: رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں — آگے ہو میخانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے

تشریح حسین موسم کی وجہ سے ہوا سے بھی اس طرح رنگ ٹپکا پڑ رہا ہے جیسے شراب انڈیلی اور نچوڑی جاتی ہے۔ لہٰذا آج شراب خانے کے سامنے سے نکل چلو کہ ہر طرف شراب پینے والوں نے دھوم مچا رکھی ہے۔ اب یہ انہی کا دور ہے۔ یعنی شراب خانے میں جانے کی ضرورت نہیں صرف اس کے سامنے سے گزر جانا ہی کافی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ کیفیت پیدا ہو جائے گی جو عام طور پر شراب نوشی سے پیدا ہوتی ہے۔ مرزا غالب نے بھی مضمون زیادہ پُرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔

ے ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادپیمائی!

شعر نمبر ۳: عشق کے میدان داروں میں بھی مرنے کا ہے وصف بہت۔ یعنی مصیبت ایسی اٹھانا کارِ کار گزاراں ہے

تشریح وہ لوگ جنہوں نے عشق کی جنگ لڑی اور اس میں فتح و کامرانی حاصل کی یعنی جنہوں نے عشق اختیار کیا، مرنے اور جان دینے کے معاملے میں عجیب و غریب خوبی اور صلاحیت رکھتے ہیں اور یوں بھی عشق اختیار کرنا اور اس کے مصائب برداشت کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ انہی لوگوں کا کام ہے جو بے دریغ ہر حکم بجا لانے والے ہوں اور اپنے فرض کے معاملے میں انتہائی چست و چاک ہوں۔ یعنی عشق وہی اختیار کر سکتے ہیں جو اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہوں اور اس سلسلے میں کسی تذبذب کا شکار نہ ہوں۔

شعر نمبر ۴: دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے آنسو سارے خون ہوئے — لوہو پانی ایک کرے یہ عشق لالہ عذاراں ہے

تشریح میر کہتے ہیں کہ محبوبوں کے عشق کو معمولی بات نہ سمجھیں بلکہ اس کے فرائض اس وقت ادا ہوتے ہیں جب خون پانی بن کر بہنے لگے۔ مجھے دیکھیے میرا دل عشق کی صعوبتیں اٹھا اٹھا کر داغ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور آنسوؤں کی جگہ آنکھوں سے خون بہنے لگا ہے۔ عشق میں سخت محنت کے بارے میں خود میر کہتے ہیں۔

ے عشق میں کیا کام ہے نازک مزاجی کے تئیں! — کوہکن کی طرح سے جی توڑ کر محنت کرو!

شعر نمبر ۵: کوہکن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے — عشق میں ہم کو میر نہایت پاسِ عزت داراں ہے

تشریح میر ہمارے روایتی عشقیہ کرداروں مثلاً قیس اور فرہاد وغیرہ پر اپنی فوقیت جتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیوانے اور شوریدہ سر تو ہم بھی بہت تھے اور اس کے لئے ہمیں دشت و صحرا میں جانا چاہیے تھا لیکن ہم وہاں اس لئے نہیں گئے کہ ہمیں عشق کے میدان کے بڑے بڑے نام رکھنے والے صاحبِ عزت و شان عشاق کا خیال تھا یعنی اگر ہم جاتے تو ہماری شوریدگی اور دیوانگی کے مقابلے میں یہ لوگ کمتر قرار پاتے اور عام لوگوں کی نظر میں ان کا مقام ہے وہ ختم ہو جاتا۔ لہٰذا ان کی عزت کا خیال کرتے ہوئے ہم صحرا اور پہاڑوں میں نہیں گئے۔ دوسرے روایتی عشاق کے بارے میں میر کے ہاں یہ رویہ اکثر و بیشتر ملتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

؎ میرے سنگِ مزار پر فرہاد — رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

؎ نہ دلوانے نفسے ہم سے قیس و فرہاد — ہمارا طورِ عشق اُن سے جدا تھا

نظیؔر اکبرآبادی

سوانحی حالات ولی محمد نام اور نظیؔر تخلص تھا۔ آپ کی ابتدائی زندگی کے مستند حالات میسّر نہیں البتہ آپ کے سنہ ولادت ۱۷۳۵ء پر اکثر محققین کو اتفاق ہے۔ آپ کی جائے ولادت کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ نظیؔر اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہونے کی دوسری روایت کے مطابق نظیؔر کی ولادت دہلی میں ہوئی اور احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیؔر اپنی والدہ اور نانی کے ساتھ آگرے چلے گئے اور پھر یہیں سکونت اختیار کرلی۔ اُنکے والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔ نظیؔر کی ولادت سے قبل اُن کے گیارہ بارہ بہن بھائی فوت ہو چکے تھے اس لئے نظیؔر اپنے والدین کے بہت لاڈلے تھے اور انہوں نے نظیؔر کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے اُن کے کان چھدوا دیئے تھے۔ انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم مولوی محمد کاظم اور ملّا ولی محمد سے حاصل کی۔ نظیؔر کی ساری زندگی عوامی انداز میں عام لوگوں میں گزری وہ ہر محفل کی جان سمجھے جاتے۔ اُن کی جوانی کی شوخی وظرافت اور بذلہ سنجی اُن کی شاعری کا بھی خاصا ہے مگر اپنی طویل زندگی کے تلخ تجربات و مشاہدات سے طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا اور انہوں نے صوفیانہ مسلک اختیار کرلیا۔ اسی زمانے میں نواب سعادت علی خان نے کچھ رقم دے کر ایک قاصد بھیج کر لکھنؤ آنے کی دعوت دی مگر اُن کی قناعت پسند طبیعت نے گوارہ نہ کیا اور دربار داری سے انکار کردیا۔ آخری عمر میں اُن پر فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے اور ۱۸۳۰ء میں وفات پائی اور آگرے میں مدفون ہوئے۔

محاسنِ کلام

نظیؔر اکبرآبادی اردو کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے زندگی کے حقیقی روپ کو من وعن اپنی شاعری کی زینت بنایا۔ نظیؔر نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ مگر حقیقت نگاری واقعیت وجزئیات نگاری کی خوبی اُن کی غزل، قصیدے، مثنوی، رباعی اور مسدس وغیرہ میں ہر جگہ اپنی پوری توانائی اور خلوص کے ساتھ موجود ہے۔ نظیؔر کی بڑی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ ایک عرصے تک

اس کے مقام اور مرتبے کو تسلیم نہیں کیا گیا اور پھر اگر تسلیم کیا بھی گیا تو ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے اس میں شک نہیں کہ نظم کے میدان میں نظیرؔ کو ایک نہایت بلند مقام حاصل ہے مگر ایک غزل گو شاعر کے طور پر بھی اس کی حیثیت مسلم ہے اور اس کی شاعری داخلی وخارجی دونوں حیثیتوں سے بڑی مکمل چیز ہے ۔

نظیرؔ کی غزل گوئی

نظیرؔ کے دیوان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس کی غزل اپنے معاصرین کی غزل سے کسی صورت کم تر نظر نہیں آتی پھر تغزل کی خوبی بھی اپنے بھرپور تاثر کے ساتھ اُن کی غزل میں موجود ہے ۔ نظیرؔ کی غزل کو جو صفت منفرد بناتی ہے وہ اُس کی واقعیت اور جزئیات نگاری ہے جس سے انہوں نے حقیقی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے ۔

ے کیا کبک کو دکھلاتے ہو اندازِ خرام آہ — حسرت زدہ شوخیِ رفتار تو ہم ہیں

ے ٹھہرنا عشق کے آفات کے صدموں میں نظیرؔ — کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا

ے آہ کے نالے کے ٹھنڈی سانس کے یا اشک کے — اب خدا جانے کہ کس کے ساتھ جی جاتا رہا

ے جو نگہ سے چاہ کے دیکھوں ٹک ، تو چڑھا کے تیوری یہ کہتا ہے
تری اس نگہ کی سزا ہے یہ کہ بس اب میں تجھ سے چھپا کروں

ے لے جام لبالب بھر دینا ، پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں !
یہ ساغر پہنچے دوست تلک یا ہاتھ لپک لے دشمن کا !

واقعیت وحقیقت نگاری

نظیرؔ اکبر آبادی نے اپنی طویل زندگی کے تجربات ومشاہدات کو اس کے حقیقی روپ میں کچھ اس واقعیت سے سمویا ہے کہ وہ روزمرہ زندگی کا نمائندہ نظر آتا ہے ۔ جو عوام وخواص کی معاشرتی اور سماجی زندگی کو جیسا پاتا ہے پورے خلوص کے ساتھ اُسے اپنی نظموں کی زینت بنا دیتا ہے ۔ کیونکہ وہ محض خیالات کا شاعر نہیں بلکہ واقعات کا شاعر ہے ۔ اُن کی نظمیں دیوالی ، بنجارہ نامہ ، برسات کی بہاریں ، مفلسی اور آگرہ کی تیراکی وغیرہ اُن کی واقعیت اور حقیقت نگاری کے عمدہ نمونے پیش کرتی ہیں ۔

دیوالی کا ایک بند ملاحظہ ہو ؛ ۔

ے ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا — ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دوالی کا !
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دوالی کا — کسی کے دل کو مزہ خوش لگا دوالی کا

عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

"مفلسی" کا ایک بند بھی توجہ طلب ہے ؛-

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہیں آن پر ا　　دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہرگز کسی کے دل کو نہیں ہوتی ہے اسکی چاہ　　جس طرح کتّے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

ہندوستانی معاشرت کے جیتے جاگتے نمونے

نظیرؔ خالص ہندوستانی معاشرت کے شاعر تھے۔ ہندوستانی معاشرے اور روزمرّہ زندگی کے رسوم و رواج اُن کی شاعری میں رچے بسے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول سے اپنی شاعری کا خمیر اٹھاتے ہیں۔ نظیرؔ بلاشبہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہندوستان کی عام معاشرتی زندگی اور رسوم و رواج کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے وقت اپنا لب و لہجہ بھی عوامی رکھا یہاں تک کہ بعض ناقدین نے اُنکی شاعری کو عامیانہ اور بازاری قرار دے دیا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعرانہ عظمت نمایاں ہوتی چلی گئی۔

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارا　　یا سائبان ستھرا یا بانس کا اسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا　　مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گذارا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کنے مہیّا پکا پکایا کھانا　　اُن کو پلنگ پہ بیٹھے جھڑیوں کا حظ اٹھانا
ہے جن کو اپنے گھر میں یاں نون تیل لانا　　ہے سر پہ اُن کے پنکھا یا چھاج ہے پرانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

نظیرؔ اپنے اِسی رویے کی بنا پر ہندوستانی تہواروں یہاں کے موسموں تقریبوں بلکہ پھلوں تک کا ذکر اپنی شاعری میں کرتے ہیں اور اردو شاعری کی فضا پر فارس و ایران کا اثر پہلی مرتبہ ٹوٹتا نظر آتا ہے۔

ظرافت و مزاح کی لطافت

نظیرؔ کی طبیعت میں ظرافت کا مادہ نمایاں تھا جو ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے اُن کی ظریف طبیعت کبھی کبھی واقعیت پسندی کی رو میں بہہ کر متانت اور سنجیدہ ظرافت کی حدود سے باہر نکل جاتی ہے تاہم مجموعی طور پر اُن کی ظرافت اور مزاح میں عامیانہ اور بھانڈپن نہیں ہوتا بلکہ اُن کا درد مندا اور لطیف طنز عام طور پر انکشافِ حقیقت تک محدود رہتا ہے۔ اُنکی نظمیں "پیسہ ہی سب کچھ ہے" "روٹیاں" "پیٹ" "بڑھاپا" اور "آٹے دال کی فکر کر" ظرافت کی عمدہ مثالیں ہیں۔

درد اور مزاح کی ہم آہنگی ملاحظہ ہو:۔

~ دریا کے تماشے کو اگر جاویں تو یارو! | کہتا ہے ہر ایک دیکھ کے جاتے ہو کہاں کو
اور ہنس کے شرارت سے کوئی پوچھے ہے بدخو | کیوں خیر ہے کیا خضر سے ملنے کو چلے ہو
سب چیز سے ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

~ مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں | بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں

~ پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں | اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

رجائی لب ولہجے کا شاعر

نظیر کا کلام کبھی بھی ہمارے اندر زندگی سے نفرت یا مایوسی پیدا نہیں کرتا۔ وہ زندگی کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں تو اُن سے ہمارے دلوں میں سوز وگداز اور دردمندی کی ایک لطیف کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جو ہمیں زندگی سے دل برداشتہ نہیں کرتی۔ بلکہ اُس کی خوش طبعی ہمیں ایک حوصلہ اور اطمینان دلاتی ہے کہ زندگی صرف رنج والم کا نام نہیں بلکہ زندہ دلی اور خوبصورتی کا امین بھی ہے۔ مثلاً اُس کی غزل کا یہ مطلع ہے۔

~ یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے یا آب وتاب | اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب

نظیر "کلجگ" جیسے عنوان پر بھی نظم لکھتے ہیں تو ہمارے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔

~ جو چاہے لے چل اِس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے آزار میں آزار ہے!

~ دنیا نہ جان اس کو میاں، دریا کی یہ منجدھار ہے
اوروں کا بیڑا پار کر، تیرا بھی بیڑا پار ہے

~ کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

الفاظ وتراکیب کا برمحل استعمال

نظیر کی ایک بڑی خوبی اُن کی قدرتِ بیان ہے اُنہیں الفاظ وتراکیب کے برمحل استعمال میں ملکہ حاصل ہے جس سے نہ صرف وہ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوتے ہیں بلکہ اُن کے اشعار میں ترنم وموسیقی کی سی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے جس سے قاری کی سامعہ پر خاص اثر پڑتا ہے

اور سننے والا خوف وہراس یا لطف وانبساط کی تمام کیفیات الفاظ میں متحرک محسوس کرتا ہے۔

ع روز مزدوں سے رات کو بہ سے تھا مینہ جھک جھک - بوندیں پڑ رہیں ٹپک ٹپک، پانی پڑا چھپک چھپک
جام رہے چھلک چھلک، شیشے رہے بھبک بھبک - ہم بھی نشوں میں خوب چھک لوٹتے تھے بہک بہک

ع جس دم چمن میں چاند کی ہوں خوش جمالیاں - اور جھومتی ہوں باغ میں پھولوں کی ڈالیاں
بہتی ہوں مے کے جوش سے عشرت کی نالیاں - کانوں میں نازنیں کے جھمکتی ہوں بالیاں
عیش وطرب کی دھوم ہنسوں کی بحالیاں
جب چاندنی کی دیکھیئے راتیں اجالیاں

نادر تشبیہات واستعارات

نظیر کا طبعی میلان جزئیات نگاری کی طرف ہونے کے سبب اُن کا کلام صنائع و بدائع کی تمام تر خوبیوں سے مالا مال ہے نادر تشبیہات و استعارات سے اس کا کلام بھرا پڑا ہے جو کبھی کبھی تو اُن کی اپنی اختراع نظر آتی ہیں۔ مثلاً ککڑی کو لیلیٰ کی انگلیاں کہتے ہیں۔

ع وہ نیازِ عجز تھا اُس کی نگہ سے آشکار! - جس طرح سے تھک رہے طائر کہیں پرواز سے
ع سرخ گالوں پر جو ہم کرتے ہیں اُس گل کے نگاہ - پڑتی نارنگیاں ٹپکے ہیں ہزاروں دلخواہ!
ع ساقی بھی یوں جام لے کر رہ گیا - جس طرح تصویر ہو ساغر بکف!

گورے بدن پر سرخ لباس کی کیفیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

ع گویا شفق میں اُن کے بجلی چمک پڑی

پھر اُن کا یہ بیان بھی اپنی مثال آپ ہے۔

ع ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ - اے گل تو اپنے حسن کی خود ہی بہار دیکھ

مختصر یہ کہ نظیر کی شاعری بہت ہی بلند مقام کی حامل ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلاتے ہوئے ہے۔

مخمس شہر آشوب

تعارف

نظیر اکبر آبادی کی زیر نظر نظم ہیئت کے اعتبار سے مخمس ہے۔ مخمس ایسی نظم کو کہا جاتا ہے جس کا ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہو۔ اس نظم کے ہر بند کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں جبکہ پانچواں یعنی آخری مصرع پہلے بند کے آخری مصرع سے ہم قافیہ و ہم ردیف ہے۔

شہر آشوب اصطلاحاً ایسی نظم کو کہا جاتا ہے جس میں کسی شہر کے اجڑنے یا برباد ہونے کا ذکر ہو اور اِس پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہو۔ دراصل شہر آشوب بھی ہجو یہ شاعری کی ایک قسم ہے۔ اردو میں بہت اچھے شہر آشوب ملتے ہیں۔ خصوصاً سودا نے اس ضمن میں خاص شہرت حاصل کی۔ نظیر اکبر آبادی کے شہر آشوب بھی خوب ہیں۔ زیرِ نظر شہر آشوب میں آگرے کی بربادی اور تباہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

حلِ لغات سخن۔ بات، شاعری۔ اختیار۔ قدرت، قابو۔ پسند، اجازت، طبع۔ شعر کہنے کی صلاحیت؛ فکر۔ سوچ بچار، دھیان؛ خلق۔ مخلوق؛ زر۔ سونا، دولت، مال؛ بے زری۔ غربت، مفلسی؛ نا استوار۔ غیر مستقل، ناپائیدار؛ صرّاف۔ سنار، سونے اور چاندی کے زیورات بنانے والا؛ بنئے۔ ہندو تاجر؛ جوہری۔ جوہر فروش؛ ساہوکار۔ ہندو تاجر؛ قزاق۔ ڈاکو، لٹیرا؛ کتوال۔ پولیس کا عہدیدار؛ ملاح۔ کشتی چلانے والا؛ ناؤ۔ کشتی؛ کماں گر۔ کمانیں بنانے والے؛ ابر۔ اوپر؛ صحاف۔ جلد بنانے والے؛ نقاش۔ نقش بنانے والے؛ بدّھی۔ شادی کے دن دولہا کے پہننے کے لئے پھولوں کے ہار؛ جنس۔ شے، سودا، سوداگروں کا سامان؛ ہار۔ شکست، تھکاوٹ، تھکان؛ اور۔ دوسرا؛ شکار بند۔ گھوڑے پر شکار لٹکانے کے لئے ڈوری یا تسمہ؛ ہوا۔ وبا؛ چادر۔ پانی کی چوڑی دھار؛ آبشار۔ جھرنا، چشمہ؛ مہر، محبت۔ مہربانی۔ عنایت؛

بند نمبر ۱: ہے اب تو کچھ سخن کا مرے اختیار بند ۔۔۔ رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موج دار بند ۔۔۔ ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو کاروبار بند

تشریح نظیر اکبر آبادی شہر آشوب کے پہلے بند میں کہتے ہیں کہ آج کل میں شعر کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور شعر گوئی پر میرا اختیار اور قدرت ختم ہو گئی ہے۔ رات دن سوچتا رہتا ہوں اور اسی غور و فکر کی وجہ سے شعر کہنے کی صلاحیت بند ہو گئی ہے۔ شاعری کا وہ ملکہ جو ایک موجزن دریا کی صورت میں تھا، بند ہو گیا ہے اور آخر بات کرتی ہوئی زبان منہ میں بار بار کیوں رُک نہ جائے کہ آگرے کے شہر کے لوگوں کے تو تمام کاروبارِ زندگی ہی بند ہو کر رہ گئے ہیں۔

بند نمبر ۲: بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی ۔۔۔ کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی ۔۔۔ ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

تشریح لوگوں کے پاس روزی کمانے کے وسائل نہیں رہے ہیں اور اس بے روزگاری نے لوگوں کو اس حد تک مفلس و نادار کر دیا ہے کہ جن کے پاس مکان ہیں وہ اُن پر چھتیں نہیں ڈال سکتے اور یوں زندگی کی بنیادی ضرورت سے محروم ہیں اور یہاں بے چھت مکانوں کی دیواروں اور دروازوں کو دیکھ کر گھر میں ناداری کی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایک گھر میں مفلسی نے اس طرح ڈیرے ڈال رکھے ہیں جیسے پانی کے آگے لگایا ہوا بند ٹوٹ جائے تو پانی گھروں اور کھیتوں میں بھر جاتا ہے اور اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح مفلسی کا تدارک بھی ممکن نہیں ہے۔

بند نمبر ۲۳
دنیا میں اب قدیم سے ہے زر کا بندوبست ۔ اور بے زری میں گھر کا نہ باہر کا بندوبست
آقا کا انتظام نہ نوکر کا بندوبست ۔ مفلس جو مفلسی میں کرے گھر کا بندوبست
مکڑی کے تار کا ہے وہ نااستوار بند

تشریح پرانے زمانے سے دنیا کا سارا انتظام و سلیقہ صرف روپے پیسے اور دولت کی وجہ سے ہے اور اگر کوئی آدمی نادار اور مفلس ہو تو اس کے گھر کا اور گھر سے باہر کا تمام انتظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ روپے پیسے کے بغیر نہ کوئی مالک اپنا انتظام درست رکھ سکتا ہے نہ کوئی نوکر اور ملازم۔ اور ایک غریب آدمی جس انداز میں اپنا گھر چلانے کی تدبیر کرتا ہے اس کی مثال یہ ہے جیسے مکڑی کے جالے کی تاروں سے ناپختہ اور غیر مستقل انتظام کر دیا جائے یعنی مفلس کے انتظامات میں پائیداری نہیں ہوتی۔

بند نمبر ۲۴
صراف، بنیے، جوہری اور سیٹھ ساہوکار ۔ دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار
بازار میں اڑے ہے پڑی خاک بے شمار ۔ بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنی دکاندار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

تشریح ایک زمانہ تھا کہ سنار بنیئے ہیروں اور جواہرات کا بیوپار کرنے والے، مختلف کاروبار کرنے والے اور ہندو تاجر اپنی دولت مندی کی وجہ سے لوگوں کو قرض دیتے اور مشکل وقت میں اُن کے کام آتے تھے۔ لیکن موجودہ دور کی حالت یہ ہے کہ یہ دولت مند لوگ بھی اس قدر مفلس ہو گئے ہیں کہ انہیں اپنے گھر کے روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے خود دوسروں سے قرض لینا پڑتا ہے۔ بازار جہاں بے حد چہل پہل اور رونق ہوتی ہے اب ویران ہیں اور ہر طرف خاک اُڑ رہی ہے۔ بازاروں میں جو دکاندار اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے، آج کل اپنی اپنی دکان پر اس طرح بیٹھے ہیں جس طرح چوری کے جرم میں پکڑے گئے مجرم پولیس کے سامنے قطار باندھے بیٹھے ہوں اور اپنی سزا کے منتظر ہوں۔

بند نمبر ۵ ـ لوٹیں ہیں گردو پیش جو قزاق راہ مار ؛ بیوپاری آتے جاتے نہیں ڈر سے زینہار
کتوال رووبیں خاک اڑاتے ہیں چوکیدار ؛ ملاحوں کا بھی کام نہیں چلتا میرے یار
ناویں ہیں گھاٹ گھاٹ کی سب وار پار بند

تشریح ـ آج کل روزگار کے وسائل محدود ہونے کی وجہ سے چوری اور ڈاکے وارداتیں بڑھ گئی ہیں۔ چونکہ آگرے کے گردونواح میں ڈاکو راستہ چلتے لوگوں کو بے دریغ لوٹ لیتے ہیں لہٰذا بیوپاری اور تاجر ایک شہر سے دوسرے شہر جانے اور تجارت کرنے سے ڈرتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے تجارتی سفر بھی ترک کر دیئے ہیں۔ ایسے میں پولیس کے کارندوں اور چوکیداروں کی مصروفیات ختم ہو گئی ہیں اور وہ بھی بیٹھے رو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ملاحوں کا کاروبار بھی بند ہو گیا ہے اور کسی کی کشتی دریا کے ایک کنارے رُک گئی ہے اور کسی کی دوسرے کنارے۔

بند نمبر ۶ ـ ہر دم کماں گروں کے اپر پیچ و تاب ہیں ؛ صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
مرتے ہیں مینا ساز مصور کباب ہیں ؛ نقاش ان سبھوں سے زیادہ خراب ہیں
رنگ و قلم کے ہو گئے نقش و نگار بند

تشریح ـ کمانیں اور دیگر اسلحہ بنانے والوں کا کاروبار بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے لہٰذا وہ ہمہ وقت اضطراب کی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ جلدیں باندھنے والوں کے پاس کتابیں نہیں آتیں لہٰذا وہ بھی بے حد غمگین ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ غم کی کتاب بن گئے ہوں۔ جڑاؤ کا کام کرنے والوں پر بھی مرنے کی نوبت آ گئی ہے اور تصویریں بنانے والوں کے پاس بھی کوئی تصویر بنوانے نہیں آتا لہٰذا ان کا روزگار بھی بند ہے اور وہ اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہیں۔ ان کا کاروبار تو پھر بھی جیسے تیسے چل رہا ہے لیکن نقش گری کرنے والوں کی حالت سب سے زیادہ خراب ہے کہ ان کا کاروبار بالکل بند ہے اور ان کے مختلف رنگوں اور نقش گری کے لئے کام میں آنے والی قلمیں اور برش بے کار ہو گئے ہیں۔

بند نمبر ۷ ـ بیچیں تھے وہ جو گوندھ کے پھولوں کے ہدھی یار ۔ مرجھا رہی ہے دل کی کلی جی ہے داغدار
جب آدھی رات تک نہ بکی جنس آبدار ۔ لاچار پھر وہ ٹوکری اپنی زمیں پہ مار
جاتے ہیں کر دکان کو آخر وہ یار بند

تشریح ـ وہ لوگ جو شادیوں کے موقع پر دُلہا کو پہنانے کے لئے ہار بنا کر بیچا کرتے تھے، کاروبار بند ہونے سے اُن کے اپنے دل ناشگفتہ کلی ہو کر رہ گئے ہیں یعنی یہ سخت آزردہ ہیں۔ جب رات گئے تک انتظار کرنے کے باوجود اُن کے پھول نہیں بکتے تو وہ تنگ آ کر پھولوں کی ٹوکری

پھینک اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں اور تھک ہار کر دکان بند کر دیتے ہیں۔ یعنی افلاس کی وجہ سے نہ لوگ شادی کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں نہ کسی کو ہار خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ پھول بیچنے والوں کا کاروبار چلتا ہے۔

بند نمبر ۸ :- کیونکر بھلا نہ مانگئے اس وقت سے پناہ ۔ محتاج ہو جو پھرنے لگے در بدر سپاہ
یاں تک امیر زادے سپاہی ہوئے تباہ ۔ جن کے جلو میں چلتے تھے ہاتھی و گھوڑے آہ
وہ دوڑتے ہیں اور کے پکڑے شکار بند

تشریح :- آخر ایسے وقت سے انسان کیوں اللہ تعالیٰ کی پناہ نہ مانگے اور خوف نہ کھائے اس لئے کہ عام لوگ تو درکنار فوج میں شامل لوگ بھی جن کی ہر دور میں ضرورت رہی ہے اور جنہیں ہمیشہ بھاری تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں، ایک امیر سے دوسرے امیر کے دروازے پر محتاج ہو کر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ امیر کے گھر پیدا ہونے والے سپاہی اس حد تک تباہ و برباد ہو گئے ہیں کہ ایک زمانے میں ان امیر زادوں کا یہ حال تھا کہ ہاتھیوں اور گھوڑوں کے جلوس ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے لیکن افسوس کہ اب افلاس کے باعث ان کی یہ حالت ہو گئی کہ نہ صرف وہ ہاتھیوں اور گھوڑوں سے محروم ہو گئے بلکہ دوسروں کے ملازم ہو کر اُن کے گھوڑوں کے شکار بند پکڑ کر دوڑنے اور اُن کی خدمت کرنے پر مجبور ہیں۔

بند نمبر ۹ :- جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات ۔ سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہیے بات ۔ روزی کے اب درخت کا ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

تشریح :- چونکہ لوگ غربت اور افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر چیزیں نہیں خرید سکتے لہٰذا اس کے اثر سے صورت یہ ہو گئی کہ آگرے میں جس قدر کارخانے ہیں وہ سب کے سب نہیں چلتے اور اُن کی تیار کردہ چیزیں فروخت نہیں ہوتیں نتیجے میں کارخانہ دار سخت مالی مشکلات کا شکار ہیں۔ لیکن بھلا یہاں پر کس کس کا ذکر کریں اور کس کس کی مشکل بیان کی جائے پس مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ آج کل روزی کے درخت کے پتے نہیں ہلتے اور لوگوں کو روزی میسر نہیں آتی۔ یوں لگتا ہے جیسے افلاس کی ہوا آ کر رک گئی ہو اور اب اس کا خاتمہ ممکن نظر نہیں آتا۔

بند نمبر ۱۰ :- دیکھے کوئی چمن تو پڑا ہے اجاڑ سا ۔ غنچہ نہ پھل نہ پھول نہ سبزا ہرا بھرا
آواز قمریوں کی نہ بلبل کی ہے صدا ۔ نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
چادر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند

تشریح ایسی کیفیت ہے کہ اگر کوئی گلستان اور باغ کو دیکھے تو وہ بالکل اجڑا ہوا نظر آئے گا۔ اس لئے کہ باغ میں نہ تو غنچے ہیں نہ پھول ہے اور نہ پھل ہے اور نہ سرسبز و شاداب سبزہ۔ نہ باغ میں قمریوں کی آوازیں نہ بلبلوں کا شور۔ اس کے علاوہ حوض و تالاب اور نہر بھی خشک پڑی ہے اور اس میں پانی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آبشار اور جھرنے کا پانی بھی خشک ہو گیا ہے۔

بند نمبر ۱۱: ہے میری حق سے اب یہ دعا شام اور سحر - ہو آگرے کی خلق پہ پھر مہر کی نظر
سب کھاویں پیویں یاد رکھیں اپنے اپنے گھر - اس ٹوٹے شہر پر بھی الٰہی تو فضل کر
کھل جاویں ایک بار تو سب کاروبار بند

تشریح میں صبح و شام اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ آگرے کے رہنے والوں پر مہربانی فرما۔ سب لوگ خوشحال ہو جائیں اور ان کے گھروں میں کھانے پینے کی اشیاء کی فراوانی ہو جائے اور آگرے کا شہر جو خسارے میں آگیا ہے، اے اللہ تو اس پر بھی اپنا فضل کر تاکہ لوگوں کے جس قدر کاروبار غربت و افلاس کی وجہ سے بند ہو گئے ہیں اب دوبارہ جاری ہو جائیں اور لوگوں کی ناداری ختم ہو جائے۔

چڑیوں کی تسبیح

تعارف نظیر اکبر آبادی کی یہ نظم مسدس ہیئت میں ہے۔ مسدس کا ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض مسدس ترجیع بند ہوتے ہیں یعنی ان کے پہلے بند کا آخری شعر یا آخری مصرع ہر بند کے آخر میں دہرایا جاتا ہے۔ یہ مسدس بھی ترجیع بند ہے اور اس کے پہلے بند کا آخری شعر تمام بندوں کے آخر میں دہرایا جاتا ہے۔

اس نظم میں زیادہ تر پرندوں کے نام ہیں اور ان میں سے بہت سے پرندے آج ہمارے لئے اجنبی ہیں اس لئے کہ یہ پرندے بالخصوص آگرے کے گرد و نواح میں پائے جاتے تھے اور برِاعظم کے دوسرے علاقوں میں عام طور پر نہیں ملتے اس کے علاوہ کچھ تخیلی و تصوراتی پرندوں مثلاً عنقا اور سیمرغ وغیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ نظم میں پرندوں کے ناموں کا جس انداز میں استعمال ہوا ہے اس سے نظیر کی وسعت معلومات اور قادرالکلامی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم کا حاصل یہ ہے کہ پرندے تک اپنے پالنے والے کی حمد و ثنا میں مصروف ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں لیکن انسان جو اشرف المخلوقات ہے، اللہ تعالیٰ سے غافل ہے اور نظیر کے نزدیک یہ مقامِ افسوس ہے۔

حل لغات سحر۔ صبح ؛ ہوں۔ اقرار کرنا ؛ کن۔ اللہ تعالیٰ دنیا کو پیدا کرنا چاہتے تھے تو لفظ کن فرمایا اور یہ دنیا وجود میں آگئی۔ لفظی معنی ہو جا ؛ فیکون۔ لفظی معنی بن گئی۔ اشارہ خدا کے اشارے پر دنیا کے وجود میں آنے کی طرف ہے ؛ طوطی۔ ایک سبز رنگ کا چھوٹا سا پرندہ ؛ بہتوں۔ طوطی کی آواز ؛ سانجھ۔ شام ؛ سویرا۔ صبح ؛ بے چوں۔ بے مثال ؛ منفرد۔ بے نظیر ؛ تپ۔ حرارت۔ بخار ؛ بیچ۔ میں۔ درمیان ؛ کلپنا۔ تڑپنا۔ کڑھنا ؛ پنکھ پکھیرو ؛ پنچھی۔ پرندے ؛ جپنا۔ تسبیح کرنا ؛ رحمان۔ مہربانی کرنے والا ؛ حنان۔ بے حد رحمت والا بخشنے والا ؛ منّان۔ بہت احسان کرنے والا ؛ دھیان۔ خیال ؛ طائر۔ پرندہ ؛ تخم۔ بیج ؛ پنچھی۔ پرندہ ؛ پاؤں پسار کر سونا۔ انتہائی غفلت برتنا ؛ خورد۔ چھوٹا ؛ کبیر۔ بڑا ؛ حیّ۔ زندہ رہنے والا ؛ قدیر۔ قدرت رکھنے والا ؛ اسیر۔ قیدی ؛

بند نمبر ۱:

وقت سحر کی روحیں کیا کیا ہوں ہوں ہوں ہوں کرتی ہیں
ہوں ہوں ہوں ہوں کر کر ذکر کن اور فیکون کرتی ہیں
مرغے بولے ککڑوں کوں اور مرغیاں کوں کوں کرتی ہیں
طوطیاں بھی سب یاد میں اس کی بہتوں بہتوں کرتی ہیں
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں!
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

تشریح صبح کے وقت تمام جاندار اپنے اپنے انداز میں اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کا اقرار کرتے ہیں۔ اور یہ ہوں ہوں ہوں ہوں کر کے دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے کائنات کو وجود میں آنے کا حکم اور اس کائنات کے وجود میں آنے کا ذکر کرتے ہیں۔ مرغ ککڑوں کوں اور مرغیاں کوں کوں کر کے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتی ہیں جبکہ طوطیاں اللہ تعالیٰ کی یاد میں اپنی مخصوص آوازیں نکالتی ہیں۔ صبح و شام سینکڑوں چڑیاں مل کر چوں چوں چوں کرتی اور اپنے انداز میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ اے اللہ تو بے مثال اور بے نظیر ہے۔

بند نمبر ۲:

پنکھ بڑھا گرڑھ پنکھ اسی کے غم کی تپ میں تپتے ہیں
عنقا اور سیمرغ اسی کی فرقت بیچ تڑپتے ہیں
سارس گدھ حواصل بڑے بگلے پنکھ کلپتے ہیں
پنکھ پکھیرو جتنے ہیں سب نام اسی کا جپتے ہیں
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں!

چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

تشریح پنکھ بڑھا گرگھ پنکھ جیسے پرندے اللہ تعالیٰ کی فرقت میں جلتے ہیں۔ عنقا اور سیمرغ بھی اللہ کی جدائی میں تڑپتے ہیں۔ سارس، گدھ، حواصل، بزے، بگلے اور پنکھ سبھی اللہ تعالیٰ کی یاد میں دکھ اٹھاتے اور تڑپتے ہیں یعنی جتنے بھی پرندے ہیں وہ سب اللہ کی حمد بیان کرتے اور تسبیح کرتے ہیں۔ صبح و شام سینکڑوں چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی اور اپنے طریقے سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرتی ہیں۔

بند نمبر ۳:
قمری بولے حق سرہ، بلبل بولے بسم اللہ — کبک ٹٹیری چاروں قل اور تیتر بھی سبحان اللہ
دادر مور پپیہے کوئل کوک رہے اللہ اللہ — فاختہ کو کو، تیہو ہو ہو طوطے بولیں حق اللہ
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں!
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

تشریح اگر قمریوں کی آواز پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ حق سرہ کہہ کر اللہ کو یاد کر رہی ہیں اور بلبلیں بھی بسم اللہ کا ورد کر رہی ہیں۔ کبک اور ٹٹیری اپنی آوازوں میں چاروں قلوں یعنی سورۃ الکافرون، سورۃ الاخلاص، سورۃ فلق اور سورۃ والناس کا جو لفظ قل سے شروع ہوتی ہیں، ورد کر رہی ہیں جبکہ تیتروں کی آواز سبحان تیری قدرت سے مشابہ ہے گویا وہ بھی اللہ کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہیں۔ دادر، مور، پپیہے اور کوئل اللہ اللہ کی آوازیں نکال رہے ہیں جبکہ فاختہ، تیہو اور طوطے بھی حق اللہ حق اللہ کا ورد کرتے ہوئے خدا کی یاد میں مگن ہیں۔ صبح و شام چڑیاں چوں چوں چوں چوں کر کے دراصل اپنے طریقے پر اللہ کے وجود کا اقرار کرتی ہیں۔

بند نمبر ۴:
ہنس ہما سرخاب تدرو بھی بولیں یا رحمان میاں۔ — سارو ہریل اور لٹورے دھیڑ یا حنان میاں
ققنس تیتر چکوہ چکوی بولیں یا منان میاں۔ — ہدہد بولیں احد احد کچھ تو بھی تو کر دھیان میاں
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

تشریح ہنس، ہما، سرخاب اور تدرو وغیرہ کی آوازیں سنیں تو پتہ چلے گا کہ وہ رحمان رحمان کہہ کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور سارو ہریل، سٹورے اور دھیڑ وغیرہ یا حنان کی آوازیں نکالتے اور اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ ققنس، تیتر، چکوہ، چکوی یا منان یا منان پکار رہے ہیں جبکہ ہدہد احد احد کر کے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتی ہے۔ اے انسان ذرا تو بھی ان آوازوں پر غور کر اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کر۔ صبح و شام چڑیاں چوں چوں کر کے دراصل اپنے طریقے سے اللہ تعالیٰ

کے وجود کا اقرار کرتی ہیں۔

بند نمبر ۵:۔ تن تن اور لم ڈھیک ہمولا حق حق تار پروتے ہیں۔ اگن بئے چنڈول ابلقے یاد میں اسکی روتے ہیں
طائر تو سب تخم محبت اس کا دل میں بوتے ہیں۔ پنچھی اس کو یاد کریں ہم پاؤں پسار کے سوتے ہیں
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

تشریح:۔ تن تن لم ڈھینگ اور ہمولے حق حق کر کے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اگمن بئے، چنڈول اور ابلقے بھی اللہ کو یاد کر کے آنسو بہاتے ہیں۔ ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ سب پرندوں کے دل میں تو اللہ کی محبت موجود ہے اور یہ پرندے تو اللہ کو یاد کرتے ہیں لیکن ہم اللہ سے انتہائی غافل ہیں اور چوبیس گھنٹے میں ایک پل کے لیئے بھی اُسے یاد نہیں کرتے۔

صبح و شام چڑیاں چوں چوں چوں چوں کر کے دراصل اپنے طریقے سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اے اللہ تو بے مثال ولاثانی ہے۔

بند نمبر ۶:۔
کس کس کا لوں نام غرض ہیں جتنے طائر خورد و کبیر
کوئی کہے یا حیّ توانا کوئی کہے یا رب قدیر
پنچھی تو سب یاد کریں اور ہم غفلت میں رہیں اسیر
ہم سا غافل دنیا میں اب کوئی نہ ہوگا آہ نظیرؔ
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

تشریح:۔ نظیرؔ اکبر آبادی بے شمار پرندوں کے نام گنوانے کے بعد کہتے ہیں کہ غرض میں کس کس پرندے کا ذکر کروں بس یہ سمجھ لیجئے کہ جتنے بھی چھوٹے بڑے پرندے ہیں ان میں سے کوئی حیّ کہہ کر اللہ کو یاد کرتا ہے اور کوئی قدیر کہہ کر۔ لیکن غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ پرندے تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں لیکن ہم انسان جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے اور ہم پر اُس کا زیادہ شکر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بالکل غافل ہیں۔ اِسطرح دیکھا جائے تو اے نظیر معلوم ہوگا کہ ہم جیسا غافل اس دنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔

صبح و شام چڑیاں چوں چوں چوں چوں کر کے دراصل اپنے طریقے سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اے اللہ تو بے نظیر و بے مثال ہے۔

تسلیم و رضا

تعارف یہ نظم مسدس ہیئت میں ہے اور یہ مسدس ترجیع بند کی دوسری شکل ہے جس میں پہلے بند کا آخری مصرع نظم کے ہر بند کے آخر میں دہرایا جاتا ہے۔ نظم تسلیم و رضا کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اگر انسان فقر کو اختیار کرے تو پھر ہر حال میں خوش رہتا ہے لیکن فقر اختیار کرنا اتنا آسان بھی نہیں یہ صرف مردوں کا کام ہے، کم ہمت اور بزدل لوگ فقر کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔

حل لغات تسلیم۔ اطاعت، ماننا، قبول کرنا۔ رضا۔ مرضی، اجازت، خوشی، اصطلاحی طور پر تسلیم و رضا کے معانی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق شکایت کئے بغیر زندگی گزارنے کے ہیں۔ فقر۔ درویشی۔ اصطلاحی معنی اس کیفیت کے ہیں جس میں انسان ہر طرح کے حالات کا صبر و استقامت سے مقابلہ کرتا اور ہر حال میں خوش رہتا ہے۔ علائق دنیوی سے کم سے کم تعلق رکھتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں بھی مصروف رہتا ہے۔ علامہ اقبالؔ کے نزدیک فقر مردِ مومن کی زندگی کا جزو لازم ہے۔ دام۔ قیمت، نرخ۔ چال۔ روش، رویہ، طرز، طریقہ۔ زر۔ روپیہ پیسہ، سونا، دولت۔ ادبار۔ نحوست۔ مفلسی۔ اقبال۔ خوش نصیبی۔ علالت۔ حزن و یاس۔ ملال۔ غم، رنج، دکھ۔ چین۔ سلوٹ، شکن۔ الم۔ غم۔ دم۔ طاقت و قوت۔ اوقات۔ حیثیت۔ بساط۔ گدڑی۔ درویشوں کا پھٹا پرانا لباس۔ شال۔ چادر، امیرانہ لباس کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ جنجال۔ مصیبت، بکھیڑا، بلا۔ کھاٹ۔ چارپائی۔ ہاٹ۔ منڈی، بازار، دکان۔ باٹ۔ راستہ۔ موٹھ۔ ایک اناج جو کھانے کے کام آتا ہے۔ چابنا۔ کھانا۔ مندر۔ ہندوؤں کا عبادت خانہ۔ تونگر۔ مال دار، دولت مند۔ چوپال۔ وہ مکان جہاں بہت سے لوگ جمع ہوتے اور بیٹھتے ہیں۔ استل۔ سنسکرت کا لفظ ہے جس کا تلفظ استھل اور استھال بھی ہے۔ اس کے معنی اس جگہ کے ہیں جہاں ہندو فقیر اور تارک الدنیا ڈیرہ ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں۔

بند نمبر ا مع

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں ۔ ہر کام میں ہر دام میں ہر چال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں ۔ بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

تشریح جو لوگ کامل طور پر فقر اختیار کر لیتے ہیں وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور کسی طرح کا رنج و غم ان کے قریب نہیں آتا۔ دنیا کے ہر کام، ہر قیمت اور ہر روش و طریقے میں خوش و

خرم ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ نے انھیں مفلس اور غریب بنا دیا ہے تو وہ افلاس و غربت میں بھی خوش ہی رہتے ہیں۔

فقر کا رویہ اختیار کرنے والے غربت، بدنصیبی اور خوش قسمتی یعنی ہر حال میں شاداں رہتے ہیں اور دیکھا جائے تو وہی انسان مکمل ہیں جو ہر کیفیت میں رنج و غم سے دور اور خوش و خرم رہتے ہیں۔

بند نمبر۲: چہرے پہ ملالت نہ جگر میں اثر غم ماتھے پہ کہیں چین نہ ابرو میں کہیں خم
شکوہ نہ زباں پر نہ کبھی چشم ہوئی نم غم میں بھی وہی عیش الم میں بھی وہی دم
ہر بات ہر اوقات، افعال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

تشریح اگر ان لوگوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ تو ان کے چہرے پر رنج و ملال کے آثار نظر آتے ہیں اور نہ ہی اُنکے دل و جگر پر غم کے اثرات نظر آتے ہیں یعنی یہ لوگ ظاہری اور باطنی ہر دو اعتبار سے خوش نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ نہ ان کے ماتھے پر کوئی شکن نمودار ہوتی ہے اور نہ ان کا ابرو خمیدہ ہوتا ہے نہ ان کی زبان پر شکایت آتی ہے اور نہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگتی ہیں۔ اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جو غم پیدا کرنے والا ہو تو بھی وہ غمگین نہیں ہوتے اور اگر کوئی دکھ کی صورتِ حال پیش آجائے تو بھی وہ پہلی جیسی طاقت و قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہائی صبر و سکون سے غم برداشت کرتے ہیں۔

دنیا کی کوئی بات ہو، ان لوگوں کی کوئی حیثیت ہو اور دنیا کا کوئی بھی کام ہو یہ خوش رہتے ہیں۔ اور دیکھا جائے تو وہی انسان مکمل ہیں جو ہر کیفیت میں خوش رہتے ہیں۔

بند نمبر۳: گر یار کی مرضی ہوئی سر جوڑ کے بیٹھے! گھر بار چھڑایا تو وہیں چھوڑ کے بیٹھے
موڑا انھیں جدھر وہیں منہ موڑ کے بیٹھے گدڑی جو سلائی تو وہی اوڑھ کے بیٹھے
اور شال اڑھائی تو اسی شال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

تشریح اگر محبوب نے پسند کیا تو اُس کے قریب آگئے اور وصل میسر آگیا۔ اگر اُس نے انھیں گھر بار اور اس ضمن کی مصروفیات ترک کرنے کا حکم دیا تو یہ فوراً حکم بجا لائے گویا انھیں جس طرف موڑا گیا اور جس طرف چلایا گیا یہ بلا تکلف اُسی طرف چل پڑے۔ اگر ان کے لئے درویشوں اور فقیروں کا پھٹا پرانا لباس سلوا کر پہننے کو دیا گیا تو انہوں نے یہی لباس پہن لیا اور اگر انھیں امیرانہ لباس دیا گیا تو انہوں نے کسی جھجک کے بغیر اسے پہن لیا اور دیکھا جائے تو وہی انسان مکمل ہیں جو ہر کیفیت میں خوش و خرم رہتے ہوں۔

بند نمبر ۱۴: گر اس نے دیا غم تو اسی غم میں رہے خوش ۔ اور اس نے جو ماتم دیا ماتم میں رہے خوش
کھانے کو ملا کم تو اسی کم میں رہے خوش ۔ جس طور کہا اس نے اس عالم میں رہے خوش

دکھ درد میں آفات میں جنجال میں خوش ہیں

پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

تشریح: اگر اللہ تعالیٰ نے غم و الم ان کے مقدر میں لکھ دیا تو یہ لوگ حالت غم میں بھی خوش رہتے ہیں اور اگر ماتم ان کا مقدر کر دیا گیا تو بھی انہوں نے شکایت نہیں کی۔ اگر پیٹ بھر کر کھانے کو میسر نہ آیا تو بھی شادماں رہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جس انداز میں رہنے کو کہا انہوں نے وہی اندازِ زندگی اختیار کر لیا اور بڑی خوشی کے ساتھ اسے قبول کیا۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مصائب، آفتوں بکھیڑوں اور بلاؤں میں بھی خوش رہتے ہیں اور دیکھا جائے تو وہی انسان کامل ہیں جو ہر حال میں خوش رہتے ہوں۔

بند نمبر ۱۵: گر کھاٹ بچھانے کو ملی کھاٹ میں سوئے ۔ دکاں میں سلایا تو وہ جا ہاٹ میں سوئے
رستے میں کہا سو تو وہ جا باٹ میں سوئے ۔ گر ٹاٹ بچھانے کو دیا ٹاٹ میں سوئے

اور کھال بچھا دی تو اسی کھال میں خوش ہیں

پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

تشریح: اگر سونے کے لئے چارپائی میسر آ گئی تو چارپائی پر سو گئے لیکن اگر اللہ کی مشیت نے انہیں دکان پر سلایا تو انہوں نے انکار نہیں کیا اور دکان پر سونا قبول کر لیا۔ اگر اللہ نے یہ تقاضا کیا کہ لوگوں کی ٹھوکریں کھانے کے لئے رستے میں سو جاؤ تو یہ رستے میں لیٹ گئے اور اگر انہیں بوریا دیا گیا تو یہ بوریا بچھا کر اس پر بیٹھ گئے اور اگر کسی جانور کی کھال میسر آئی تو اسی کھال کے حصول پر خوش ہو گئے۔ غرض وہی انسان کامل ہیں جو ہر حال میں خوش رہتے ہوں۔

بند نمبر ۱۶: گر موٹھ منگا دی تو وہی چاب لی خوش ہو ۔ اور جوار بھنا دی تو وہی چاب لی خوش ہو
سوکھی جو لا دی تو وہی چاب لی خوش ہو ۔ روکھی جو کھلا دی تو وہی چاب لی خوش ہو

اور دال کھلائی تو اسی دال میں خوش ہیں

پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

تشریح: کھانے کے لئے انتہائی کمتر اناج موٹھ میسر آیا تو انہوں نے انتہائی خوش دلی سے اسی کو کھا لیا۔ اگر جوار ملی تو وہ کھائی۔ کسی نے سوکھی روٹی لا کر دے دی تو اُسے کھانے سے بھی انکار نہیں کیا اور اگر سوکھی مل گئی تو بھی نہایت خوشی سے قبول کی اور دال جیسی حقیر چیز کھانے کو ملی تو یہ اس پر بھی خوش ہو گئے۔ غرض وہی انسان کامل ہیں جو ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

میر حسن

داستان تیاری میں باغ کی

تعارف | مثنوی اردو اور فارسی کی معروف و مقبول صنفِ سخن ہے۔ مثنوی کی ہیئت میں قصیدے کے برعکس پوری نظم میں ردیف اور قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی بلکہ ہر شعر جداگانہ قافیہ اور ردیف کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چونکہ مثنوی کے لئے عموماً چھوٹی بحریں استعمال کی جاتی ہیں لہذا دیگر اصنافِ سخن مثلاً قصیدہ اور غزل میں شاعر جس طرح کی دقتوں سے دوچار ہوتا ہے، اس ہیئت میں میں شعر کہتے ہوئے شاعر اُن دشواریوں سے دوچار نہیں ہوتا اور وہ بڑی روانی اور آسانی سے اپنے مطالب پیش کرتا چلا جاتا ہے۔

مثنوی کو عام طور پر عشقیہ اور رزمیہ داستانوں کے بیان کے لئے برتا جاتا ہے لیکن دوسرے موضوعات پر بھی مثنویاں تصنیف کی گئی ہیں۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان بھی ایک عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔ اوّل داستان کے عناصر مثلاً تخیل، رومان اور فوق الفطرت عناصر نے اس نظم میں قارئین کے لئے تجسس پیدا کیا ہے۔ دوسرے میر حسن نے زبان بھی ایسی اختیار کی جو مثنوی کی تصنیف کے تقریباً دو سو سال گزر جانے کے باوجود اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ دراصل میر حسن کا تعلق ایسے خانوادے سے تھا جس میں شعراء کی ایک طویل فہرست ملتی ہے مثلاً میر انیس بھی جس نے مرثیہ میں نام پیدا کیا، اسی خانوادے سے متعلق شاعر ہے۔ اس کے علاوہ میر حسن کا تعلق دلی سے تھا اور انھیں بھی میر امن اور میر تقی میر کی طرح دلی کا روڑا ہونے اور عوام سے گفتگو پر فخر ہے۔ لہذا اسلوب کے حوالے سے میر حسن کے ہاں بھی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو باغ و بہار اور کلام میر کا امتیاز ہیں۔

حل لغات | مے ارغوانی۔ ارغوان پھول کی کلیوں سے کشید کی ہوئی شراب، سُرخ شراب جو بہت اعلیٰ تصور کی جاتی ہے ٭ شہ۔ بادشاہ۔ مراد بے نظیر کا والد ٭ ترتیب دینا۔ آراستہ کرنا۔ سجانا ٭ رشک۔ غیرت۔ جلن۔ حسد ٭ در۔ دروازہ ٭ زربفت۔ کمخواب، زری، ایک اعلیٰ قسم کا کپڑا ٭ سایہ بان۔ دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے بنایا جانے والا چھپر ٭ زرنگار۔ وہ چیز جس پر سنہرا کام کیا گیا ہو ٭ دست بستہ۔ ہاتھ باندھے ہوئے، نہایت ادب اور احترام کے موقع پر بولتے ہیں ٭ زہ۔ ڈوری، فیتہ ٭ مقیش۔ سونے چاندی کے تاروں سے بنا ہوا کپڑا ٭ سربسر۔ سراسر، ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ تمام کا تمام، کل ٭ مہ۔ چاند ٭ چق۔ چلمن، بانس

یا سرکنڈے کی تیلیوں سے بنا ہوا پردہ ؛ محال - مشکل، دشوار ؛ مغرق - چمکتا اور جگمگاتا ہوا، سونے چاندی سے بنا ہوا ؛ ساریاں - بمعنی تمام، کل، ساری کی جمع - آج کل یہ لفظ متروک ہے ؛ پائے ہوس - ہوس اور لالچ کا پاؤں ؛ لخلخے - خوشبو کی بتیاں - اگر بتی وغیرہ ؛ مدام - ہمیشہ ؛ معطر - خوشبودار ؛ مشام - سونگھنے کی قوت کا مقام، دماغ ؛ چھپر کھٹ - وہ مسہری یا چادر جو اوپر سے ڈھکی ہوئی ہو ؛ مرصع - جڑاؤ، جس پر کام کیا ہوا ہو ؛ دالان - بڑا اور لمبا کمرہ جس میں محراب دار دروازے ہوں ؛ آن - لمحہ، وقت، ساعت ؛ جھمک - چمک، جگمگاہٹ ؛ واں - وہاں ؛ صندل - ایک قسم کی خوشبودار لکڑی ؛ پارچہ - ٹکڑا ؛ عیاں - ظاہر ؛ چوہڑ کی نہر - وہ نہر جس کا پانی چاروں طرف بہتا ہو، چار خانہ دار نہر - وہ حوض جس میں سے چار طرف نہر نکالی گئی ہو ؛ سو - طرف، سمت ؛ سرو سہی - دو شاخہ سرو کا پودا ؛ بہی - سیب سے مشابہ ایک پھل ؛ دار - مقام، جگہ ؛ بست - اسباب، چیزیں ؛ تاک - گھات، نگرانی، ٹکٹکی ؛ ہوائے بہاری - بہار کی ہوا ؛ لہلہے - سرسبز و شاداب ؛ ڈہڈہے - سرسبز و شاداب ؛ زمرد - سبز رنگ کا قیمتی پتھر ؛ جواہر - جوہر کی جمع - قیمتی پتھر یعنی لعل، زمرد، الماس، یاقوت وغیرہ ؛ روش - باغ میں بنایا جانے والا راستہ ؛ گل اشرفی - ایک قسم کا گول پھول ؛ زر - پھول کا زیرہ ؛ نثار - قربان ؛ یاسمن - چنبیلی ؛ شاخِ شبو - رات کو خوشبو دینے والا پھول ؛ نشان - آثار ؛ آن بان - شان و شوکت ؛ ارغواں - سرخ رنگ کا پھول جس کی کلیوں سے شراب کشید کی جاتی ہے ؛ جُدی - جدا، الگ، منفرد، بے مثال ؛ داودی - ایک قسم کا پھول - مہتاب دار - چاند کی جگہ ؛ چمپا - ایک قسم کا درخت جس کا پھول انتہائی خوشبودار ہوتا ہے ؛ جھاڑ - فانوس، مشعل ؛ پنج شاخہ ؛ نسرین - ایک پھول جسے شگفتہ بھی کہتے ہیں ؛ نسترن - ایک پھول جسے سیوتی بھی کہتے ہیں ؛ زعفرانی - نہایت خوشبودار زرد رنگ کا پھول ؛ آب جو - ندی ؛ قمری - فاختہ کی قسم کا ایک پرندہ ؛ لب نہر - نہر کا کنارہ - خیابان - پھولوں کے درمیان راستہ ؛ تخم پاشی - بیج بونا ؛ گودنا - زمین کھودنا ؛ پنیری - پودوں کا ذخیرہ ؛ نہال - پودے ؛ لب جو - ندی کا کنارہ ؛ جدر نہ تد - جب نہ تب ؛ خراماں - خرام کرتی ہوئی، چلتی ہوئی ؛ تاز - دریائی بطخ ؛ قرقرا - ایک آبی پرندہ ؛ پرے - صف، قطاریں، گروہ ؛ آنکھ لگنا - نیند آنا ؛ ناتوں - نام ؛ تعشق - عشق و عاشقی ؛ برگ - پتے ؛ بوستان - باغ - لیکن یہاں پر شیخ سعدیؒ کی کتاب مراد ہے جس میں عشق و عاشقی سے متعلق ابواب ہیں ؛ آن - وقت، لمحہ، ساعت ؛ گلستان - باغ لیکن یہاں پر سعدی کی ایک کتاب مراد ہے جس کے پانچویں باب میں عشق و عاشقی کو موضوع بنایا گیا ہے ؛ ددا - بچوں کی خدمت پر مقرر عورت ؛ دائی - دلہن کے ساتھ میکے سے خدمت کے لئے آنے والی خاتون ؛

مغلانی ۔ خادمہ ۔ وہ عورت جس کے سپرد سینے پرونے کی خدمت ہو؛ خواص ۔ ممتاز خدمت گار عورتیں، مصاحبت کرنے والی خواتین؛ لونڈی ۔ نوکرانی؛ چہل ۔ ہنسی مذاق؛ ریل ۔ ہجوم، بھیڑ؛ جوبن ۔ حسن؛ پٹے ۔ تراشے ہوئے بال؛ وا پھڑے ۔ قدیم طنزیہ انداز گفتگو جس سے کسی کی تحقیر کرنا مقصود ہوتی تھی؛ گوکھرو ۔ موڑا ہوا گوٹا؛ تار توڑ ۔ کارچوبی کام؛ مینا ۔ ایک پرندہ جو خوش آواز ہوتا ہے؛ نظر رکھنا ۔ دیکھ بھال اور نگرانی کرنا؛ دھول ۔ تھپیڑ؛ وارنا ۔ نثار کرنا، قربان کرنا؛ آرسی ۔ ایک زیور جس کو انگوٹھے میں پہنا جاتا تھا اور جس میں آئینہ بھی لگا ہوتا تھا؛ مقابہ ۔ سنگھار دان؛ رشک ماہ ۔ چاند کے لئے باعث غیرت یعنی انتہائی خوبصورت ۔ مراد بے نظیر؛ بوا ۔ بہن، باپ کی بہن یعنی پھوپھی، بے تکلف سہیلیوں کے تخاطب کا انداز؛ سودا ۔ جنون؛ چڑھ ۔ چڑ، ناگوار بات؛ چاہ ۔ محبت، پیار؛ عبث ۔ بے کار، فضول؛ تفول ۔ شگون لینا، فال دیکھنا؛ طور ۔ اطوار، عادات، انداز؛ دوانی، مجنون؛ اضطراب ۔ بے قراری، بے چینی؛ تپ ہجر ۔ جدائی کا بخار؛ دراشک ۔ آنسوؤں کے موتی؛ اگلا ۔ پہلا ۔ پہلے کی مانند؛ احوال ۔ حال کی جمع، حالات؛ غیر ۔ دوسرے لوگ؛ سُدھ ۔ یاداشت، خبر، آگاہی، عقل، توجہ، پرواہ، لحاظ؛ نہفتہ ۔ پوشیدہ، چھپا ہوا؛ روبرو ۔ پیش نظر، سامنے؛

شعر نمبر ۱: مے ارغوانی پا ساقیا — کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا

تشریح: اے شراب پلانے والے! مجھے سرخ شراب پلا اس لئے کہ اب میں اس باغ کی کیفیت بیان کرنے چلا ہوں جو بادشاہ نے بے نظیر کی رہائش کے لئے تعمیر کیا تھا۔

شعر نمبر ۲: دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ — ہوا رشک سے جس کے لالے کو داغ

تشریح: بادشاہ نے شاہزادے کے لئے محل کے قریب ایک باغ تعمیر کیا۔ یہ باغ ایسا خوبصورت تھا کہ جلن اور حسد کی وجہ سے لالے کے دل میں بھی داغ پڑ گیا۔ لالے کے پھول میں اندرونی سطح پر سیاہ دھبے ہوتے ہیں۔ میر حسن کا خیال ہے کہ یہ دھبے اس وجہ سے پڑے کہ وہ باغ کی خوبصورتی سے جلتا تھا اور یوں لالے کے دل پر داغ پڑ گئے۔

شعر نمبر ۳: عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان

تشریح: میں عمارت کی کیا کیا خوبیاں بیان کروں اور اس کے دروازوں کی شان کیا بتاؤں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس باغ میں جو چھپر اور سائبان بنائے گئے تھے وہ بھی کمخواب اور زری سے تیار کئے گئے تھے۔

شعر نمبر ۴: چقیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

تشریح: اس کی چھتوں پر ایسے پردے لگائے گئے تھے جن پر سونے کا کام کیا گیا تھا اور بہار اس محل کی عمارت کے دروازوں پر ہاتھ باندھ کر غلاموں کی طرح خدمت پر تیار کھڑی تھی یعنی ہر طرف بہار کا سماں تھا۔

شعر نمبر ۵:۔ کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا — کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا

تشریح: یہ جو پردے لگائے گئے تھے ان میں سے کوئی تو اسی دروازے کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا اور کسی پردے کو رسی اور ڈوری کے ساتھ لٹکا دیا گیا تھا۔

شعر نمبر ۶:۔ وہ مقیش کی ڈوریاں سربسر — کہ مہ کا بندھا جس میں تار نظر

تشریح: اور جن ڈوریوں سے ان پردوں کو باندھا گیا تھا وہ بھی تمام کی تمام سونے اور چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑے سے تیار کی گئی تھیں اور اس قدر خوبصورت تھیں کہ ان کو دیکھنے سے لگتا تھا جیسے ان ڈوریوں میں چاند کی نظروں یعنی کرنوں کو گوندھ دیا گیا تھا۔ یا یہ کہ یہ ڈوریاں اتنی چمکدار اور خوبصورت تھیں کہ چاند بھی انہی کی طرف تکتا رہتا تھا۔

شعر نمبر ۷:۔ چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال — نگہ کو وہاں سے گزرنا محال!

تشریح: مختلف مقامات پر لگائی جانے والی چلمنوں کو دیکھئے تو انہوں نے آنکھوں کے لئے جال تیار کر لیا تھا یعنی ان میں سے نظر نہیں گزر سکتی تھی اور کوئی آدمی ان چلمنوں کے پار نہیں دیکھ سکتا تھا۔

شعر نمبر ۸:۔ سنہری مغرق چھتیں ساریاں — وہ دیوار اور در کی گلکاریاں

تشریح: اس محل کی جتنی بھی چھتیں تھیں وہ سب کی سب چاندی اور سونے سے تیار کی گئی تھیں اور ان میں بہت ہی زیادہ جگمگاہٹ تھی جبکہ تمام دروازوں اور دیواروں پر خوبصورت بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔

شعر نمبر ۹:۔ دیئے آئینے ہر طرف جو لگا — گیا چوگنا لطف اس میں سما

تشریح: یہی نہیں بلکہ ہر طرف آئینے لگا دیئے گئے تھے جن میں باغ اور محل کے حسین مناظر منعکس ہوتے جس کی وجہ سے مناظر کے لطف میں چار چاند لگ گئے تھے اور چوگنی دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔

شعر نمبر ۱۰:۔ وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس — بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

تشریح: یہاں کے تمام فرش سبز رنگ کے نہایت اعلیٰ قیمتی کپڑے سے تیار کئے گئے تھے اور یہ اس قدر اچھے اور صاف ستھرے تھے کہ اس سے زیادہ کی خواہش نہیں کی جا سکتی۔ یعنی ان کی صفائی مثالی تھی۔

شعر نمبر ۱۱: وہیں لخلخے اس میں روشن مدام — معطر شب و روز جس سے مشام

تشریح: اس محل اور باغ میں ہر طرف خوشبودار بتیاں جلتی رہتی تھیں جن کی خوشبو سے ہر وقت وہاں رہنے والوں کا دماغ معطر رہتا تھا اور وہ خوشبو سے لطف اُٹھاتے رہتے تھے۔

شعر نمبر ۱۲، ۱۳: چھپر کھٹ مرصع کا دالان میں — چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں
زمین پر تھی اس طور اس کی جھمک — ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

تشریح: بڑے کمرے میں ایک ایسی مسہری پڑی تھی جس پر جڑاؤ کا کام کیا ہوا تھا اور یہ ہر لمحہ اس طرح چمکتا تھا اور زمین پر اس کی چمک دمک ایسے محسوس ہوتی تھی جیسے آسمان پر ستارے جگمگا رہے ہوں۔

شعر نمبر ۱۴: زمین کا کروں واں کی کیا میں بیاں — کہ صندل کا ایک پارچہ تھا عیاں

تشریح: جو باغ شہزادے کے لئے تیار کرایا گیا تھا اُس کی زمین کی تعریف کس انداز میں کروں بس یہ سمجھ لیں کہ وہاں زمین نہیں بلکہ خوشبودار لکڑی کا تختہ بچھا ہوا تھا یعنی وہ زمین خوشبودار تھی اور دل کو بھاتی تھی۔

شعر نمبر ۱۵: بنی سنگِ مرمر کی چوپڑ کی نہر! — گئی چار سو اس کے پانی کی لہر!

تشریح: اس میں سنگِ مرمر سے ایک ایسی نہر بنائی گئی تھی جس کا پانی چاروں طرف بہتا تھا اور چاروں طرف اس کے پانی کی لہریں جا رہی تھیں۔

شعر نمبر ۱۶: قرینے سے گرد اس کے سرو سہی — کچھ اک دور دور اس سے سیب و بہی

تشریح: اس نہر کے کناروں پر بڑے سلیقے سے دو شاخہ سرو کے پودے لگے ہوئے تھے اور ان پودوں سے ذرا فاصلے پر سیب و بہی کے درخت تھے۔ بہی بھی سیب سے مماثل ایک پھل ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۱۷: کہوں کیا میں کیفیت دار بست — لگے تھے رہیں تاک واں مے پرست

تشریح: غرض یہ باغ اور محل ایسی جگہ بن گیا تھا اور یہاں پر عیش و عشرت کے ایسے اسباب مہیا تھے کہ شراب پینے والے ہر وقت گھات لگائے رہتے تھے یعنی وہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کب انھیں وہاں جانے کی اجازت ملے۔ اس شعر میں تاک اور مے پرست کی یکجائی پُر لطف ہے۔

شعر نمبر ۱۸: ہوائے بہاری سے گل لہلہے! — چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے

تشریح: موسم بہار کی ہوا نے تمام پھولوں کو تر و تازہ اور شاداب کر رکھا تھا صرف پھول ہی نہیں بلکہ سارا گلستان سرسبز و شاداب تھا۔

شعر نمبر ۱۹: زمرد کی مانند سبزے کا رنگ — روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

تشریح اس باغ میں جو سبزہ موجود تھا اُس کا رنگ قیمتی پتھر زمرد کی طرح سبز تھا۔ اور پھولوں کی کیاریوں کے درمیان بنائے گئے راستوں پر پتھر اس انداز میں لگائے گئے تھے کہ وہ بھی قیمتی موتی اور قیمتی پتھر لگتے تھے۔ دوسرے مصرع کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ روش پر جواہرات اس بہتات کے ساتھ لگائے گئے تھے جیسے عام طور پر پتھر لگائے جاتے ہیں۔

شعر نمبر ۲۰: روش کی صفائی پہ بے اختیار! — گل اشرفی نے کیا زر نثار!

تشریح باغ میں بنائے بنائے جانے والے راستے اس قدر صاف ستھرے اور گندگی سے پاک تھے کہ گل اشرفی نے ان پر بے اختیار اپنا زیرہ قربان کر دیا تھا۔ یعنی روشوں پر گل اشرفی کا زیرہ بکھرا ہوا تھا۔

شعر نمبر ۲۱: چمن سے بھرا باغ گل سے چمن! — کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن!

تشریح اس باغ کی کیا تعریف کی جائے بس یہ سمجھ لیں کہ باغ مختلف چھوٹے چھوٹے خمنستانوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر چمن پھولوں سے معمور تھا۔ ان خمنستانوں میں کہیں نرگس کے پھول کھلے ہوئے تھے کہیں گلاب کے اور کہیں چنبیلی کے۔ اور پھولوں کی رنگا رنگی نے گلستان کے حسن میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

شعر نمبر ۲۲: چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا — کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

تشریح ان خمنستانوں میں کہیں چنبیلی کے تختے تھے کہیں موتیا کے، کہیں رائے بیل اور موگرا کے۔ یہ سب پھولوں کے نام ہیں۔

شعر نمبر ۲۳: کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشاں — مدن بان کی اور ہی آن بان!

تشریح باغ میں جگہ جگہ رات کو کھلنے اور خوشبو دینے والے پھولوں کے آثار موجود تھے جبکہ بیلے کے پھولوں کی شان و شوکت بھی نرالی اور عجیب تھی۔

شعر نمبر ۲۴: کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار — جدی اپنے موسم میں سب کی بہار

تشریح باغ میں کہیں ارغواں کے پھول تھے اور کہیں لالہ کے پھول کھلے ہوئے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے اپنے موسم میں ان سب پھولوں کی بہار اور شان و شوکت بالکل مختلف اور جداگانہ تھی۔

شعر نمبر ۲۵: کہیں جعفری اور گیندا کہیں — سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں

تشریح باغ میں جعفری اور گیندے کے پھول بھی کھلے ہوئے تھے اور رات کے وقت گل داؤدی کی اپنی شان تھی۔

شعر نمبر ۲۶:۔ عجب چاندنی میں گلوں کی بہار   ہر ایک گل سفیدی سے مہتاب وار

تشریح: چاندنی رات میں یہ پھول عجیب نظارہ پیش کرتے تھے۔ ہر پھول چاندنی کے اثر سے چھوٹا سا چاند نظر آتا تھا۔

شعر نمبر ۲۷:۔ کھڑے سرو کی طرح چمپے کے جھاڑ   کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

تشریح: اس باغ میں سرو کی طرح چمپے کے خوشبودار پودوں کے جھنڈ کے جھنڈ یوں کھڑے تھے کہ اگر آپ انہیں دیکھیں تو بے اختیار پکار اٹھیں کہ یہ درخت نہیں بلکہ خوشبو کے پہاڑ ہیں۔ خوشبودار پودوں کو زیادتی اور کثرت کی بنا پر پہاڑ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

شعر نمبر ۲۸:۔ کہیں زرد نسرین کہیں نسترن   عجب رنگ پر زعفرانی چمن!

تشریح: اس باغ میں جہاں دوسرے رنگوں کے بے شمار پودے موجود تھے وہیں شکنجہ اور سیوتی کے پیلے پھول بھی کھلے ہوئے تھے جس سے ان پھولوں کا چمن زعفرانی ہو گیا تھا اور بہت لطف دیتا تھا۔ واضح ہو کہ زعفران کا رنگ بھی زرد ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۲۹:۔ پڑی آب جو ہر طرف کو بہے   کریں قمریاں سرو پر چہچہے!

تشریح: اس باغ میں پانی کی ندی بہہ رہی تھی اور سرو کے درختوں پر فاختہ سے مماثل پرندے نغمے گانے میں مصروف تھے۔ آب جو کے ساتھ پڑی کا لفظ پُرلطف ہے جبکہ ہماری شعری روایت میں قمری کو سرو کا عاشق قرار دیا جاتا ہے۔

شعر نمبر ۳۰:۔ گلوں کا لب نہر پر جھومنا   اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

تشریح: نہر کے کنارے پھولوں کے پودے خوشی کے مارے جھوم رہے تھے اور پھول انتہائی سرخوشی کی کیفیت میں ایک دوسرے کے منہ چوم لیتے تھے۔

شعر نمبر ۳۱:۔ وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پہ   نشے کا سا عالم گلستان پر

تشریح: یہ پھول انتہائی سرمستی کے عالم میں جھکتے تھے اور کیاریوں پر گر پڑتے تھے۔ ان کو دیکھنے سے یوں لگتا تھا جیسے سارے باغ میں نشے کی کیفیت چھائی ہوئی ہو جس نے ان پھولوں کو بے اختیار کر دیا ہے۔

شعر نمبر ۳۲-۳۳:۔ لئے ہاتھ میں بیلچے مالنیں!   چمن کو لگیں دیکھنے بھالنے
کہیں تخم پاشی کریں گود کر   پنیری جما دیں کہیں کھود کر

تشریح: باغ کی مالنیں اپنے کام میں مصروف تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں بیلچے تھے اور یہ چمن کی دیکھ بھال اور حفاظت کا فرض ادا کر رہی تھیں۔ کہیں تو یہ بیلچے یا کھرپے سے زمین کھود کر بیج بوتی تھیں اور کہیں مختلف پودوں کی پنیری کاشت کرتی تھیں۔

شعر نمبر ۳۴: کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال — رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال

تشریح: باغ میں بے شمار پودے ایک دوسرے کی شاخوں سے شاخیں ملائے یوں کھڑے تھے جیسے مست اور عشاق ایک دوسرے کی گردن میں بازو حمائل کرکے کھڑے ہوتے ہیں۔

شعر نمبر ۳۵: لب جو پہ آئینے میں دیکھ قد — اکڑنا کھڑے سرو کا جد نہ تد!

تشریح: چونکہ نہر کے پانی نے اپنی صفائی کی وجہ سے آئینے کی صورت اختیار کر لی تھی لہٰذا اس کے کنارے کھڑا ہوا سرو اس آئینے میں اپنا حسن و جمال اور رعنائی و زیبائی دیکھ کر بہت ہی زیادہ غرور تفاخر محسوس کرتا تھا۔

شعر نمبر ۳۶: خراماں صبا صحن میں چار سو — دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو

تشریح: باغ کے صحن میں ہر طرف صبح کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو مختلف پھولوں کی خوشبو کو اپنے ساتھ لاتی اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دماغوں کو معطر کرتی تھی۔

شعر نمبر ۳۷: کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے — لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے

۳۸۔ صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور — درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور

تشریح: نہر کے کنارے دریائی بطخیں اور قرقرے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ مرغابیوں کے گروہ بھی موجود تھے۔ قرقروں کی آوازوں اور بطخوں نے شور مچا رکھا تھا۔ درختوں پر بگلے بیٹھے ہوئے تھے اور مکانوں کی منڈیروں پر مور بیٹھے تھے

شعر نمبر ۳۹: چمن آتش گل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا!

تشریح: پھولوں کی سرخ رنگت نے چمن میں جو کیفیت پیدا کر رکھی تھی اُس کی بنا پر لگتا تھا جیسے گلشن میں آگ لگ گئی ہے اور وہ دہک رہا ہے جبکہ ہوا نے پھولوں کی خوشبو سے سارے باغ کو مہکا رکھا تھا۔ پھولوں کی رنگت اور آگ کے رنگ کی مماثلت کے باعث پہلے مصرع کا مضمون بہت سے شعرا نے نظم کیا ہے مثلاً میر کہتے ہیں۔

؎ گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

شعر نمبر ۴۰: صبا جو گئی ڈھیریاں کرکے بھول — پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

تشریح: چمن میں ہر طرف مولسریوں کے پھول بکھرے پڑے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صبا نے ان پھولوں کو اپنے لئے چنا تھا پھر ان کی ڈھیریاں بنائی تھیں لیکن وہ جاتے ہوئے ان ڈھیریوں کو بھول گئی اور اپنے ساتھ نہ لے جا سکی اور یہ پھول یہاں بکھر گئے۔

شعر نمبر ۴۱: وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھاؤں — لگی جائیں آنکھیں لئے جس کا ناؤں

تشریح باغ میں کیلوں اور مولسریوں کے درختوں نے ایسی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں پیدا کر رکھی تھی کہ اس کا نام بھی لیا جائے تو نیند کے باعث انسان کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ اس چھاؤں کے تصور ہی سے سو جائے۔

شعر نمبر ۴۲: خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں　　　تعشق کی آپس میں باتیں کریں

تشریح باغ میں ہر طرف مسرت و شادمانی کا دور دورہ ہے۔ یہاں تک کہ بلبلیں جو گلاب کے پھولوں کے اردگرد بیٹھی ہوتی ہیں ایک دوسرے کے ساتھ عشق و عاشقی کی باتوں میں مصروف ہیں۔

شعر نمبر ۴۳: درختوں نے برگوں کے کھولے ورق　　　کریں طوطیاں بوستاں کا سبق

تشریح درختوں نے اپنے اپنے پتوں کے صفحے کھول دیئے ہیں تاکہ طوطیاں جو طوطے سے ذرا چھوٹے پرندے ہوتے ہیں، ان صفحات پر سے شیخ سعدی کی کتاب بوستان کے اسباق پڑھیں۔ شاعر نے برگ کی رعایت سے ورق اور پھر ورق کی رعایت سے کتاب اور سبق کا خیال پیدا کیا اور اسے عشق و عاشقی سے متعلق کرنے کے لئے بوستان کا ذکر آیا جو اس سلسلے کی مشہور تصنیف ہے۔

شعر نمبر ۴۴: سماں قمریاں دیکھ اس آن کا　　　پڑھیں باب پنجم گلستان کا!

تشریح طوطیوں کے سبق پڑھنے کا منظر دیکھ کر قمریاں بھی شیخ سعدی کی کتاب گلستان کے پانچویں باب کا مطالعہ کرنے لگتی ہیں۔ گلستان کا یہ باب بھی عشق و عاشقی کے مضامین کے لئے معروف ہے۔

شعر نمبر ۴۵: ددا دائیاں اور مغلانیاں　　　پھریں ہر طرف اس میں جلوہ کناں

تشریح باغ میں مختلف خادمائیں اپنے حسن کے جلوے دکھاتی پھرتی ہیں۔ کبھی وہ ایک طرف جاتی ہیں اور کبھی دوسری طرف۔

شعر نمبر ۴۶: خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم　　　محل کی وہ چہلیں وہ آپس کی دھوم

تشریح باغ میں ممتاز خدمت گار عورتوں اور عام لونڈیوں کا ہجوم ہے۔ یہ خواتین آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کرتی ہیں اور آپس میں دھومیں مچاتی ہیں۔

شعر نمبر ۴۷: تکلف کے پہنے پھریں سب لباس　　　رہیں رات دن شاہزادے کے پاس

تشریح یہ سب خدمتگار عورتیں انتہائی پُرتکلف لباس پہنے پھرتی ہیں اور ہر وقت شہزادے کی خدمت میں اُس کے آس پاس موجود رہتی ہیں۔

شعر نمبر ۴۸ تا ۵۱: کنیزان مہ رو کی ہر طرف ریل　　　چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل

رنگیلی کوئی اور کوئی شام روپ — کوئی چت مگن اور کوئی کام روپ

کوئی کیتکی اور کوئی گلاب! — کوئی مہر تن اور کوئی ماہتاب

کوئی بیبوتی اور ہنس مکھ کوئی — کوئی دل مگن اور تن سکھ کوئی

تشریح: باغ میں چاند جیسی حسین و جمیل لونڈیوں کا ایک ہجوم ہے۔ ان میں سے کسی کا نام چنبیلی ہے اور کسی کا رائے بیل۔ کوئی رنگیلی کہلاتی ہے اور کوئی شام روپ۔ کسی لونڈی کو چت مگن کہہ کر پکارا جاتا ہے اور کسی کو کام روپ کہہ کر۔ کسی لونڈی کا نام کیتکی، کسی کا گلاب، کسی کا مہر تن اور کسی کا ماہتاب ہے۔ ان میں سے کسی کا نام بیبوتی اور کسی کا نام ہنس مکھ ہے، کوئی مہر تن ہے تو کوئی ماہتاب۔

شعر نمبر ۵۲:۔ ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں — پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں

تشریح: یہ باغ میں ادھر ادھر آتی جاتی ہیں اور یوں اپنے حسن کے جلوے دکھاتی پھر رہی ہیں۔

شعر نمبر ۵۳:۔ کہیں اپنے پٹے سنوارے کوئی — اری او سہیلی پکارے کوئی!

تشریح: ان میں سے کوئی کہیں بیٹھ کر اپنے تراشے ہوئے بال سنوار رہی ہے یعنی بالوں میں کنگھی کر رہی ہے اور کوئی لونڈی دوسروں کو انتہائی بے تکلف انداز میں بلا اور پکار رہی ہے۔

شعر نمبر ۵۴:۔ کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں — کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں

تشریح: بے تکلفی میں یہ خواتین ایک دوسری کی چٹکیاں لیتی ہیں۔ کچھ خواتین تالیاں بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی ہیں۔ بعض قہقہے لگا رہی ہیں اور بعض ایک دوسرے کو گالیاں دے رہی ہیں۔

شعر نمبر ۵۵:۔ بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے — کہیں ہوتے ری اور کہیں واچھڑے

تشریح: ان میں سے کوئی خاتون ناچتی اور اپنے کڑے بجاتی پھرتی ہے جبکہ کوئی خاتون عام انداز میں دوسروں کو پکار رہی ہے اور ان پر طنز یہ جملے کس رہی ہے۔

شعر نمبر ۵۶:۔ دکھا دے کوئی گوکھرو موڑ موڑ — کہیں سوت بوٹے کہیں تار توڑ

تشریح: ان میں سے کوئی اپنے لباس پر لگا ہوا گوٹا کناری دکھا رہی ہے جبکہ کسی عورت کے لباس پر دھاگوں سے بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں اور کسی کے لباس پر کارچوبی کا کام ہے۔

شعر نمبر ۵۷:۔ ادا سے کوئی بیٹھی حقہ پیئے — دم دوستی کوئی بھر بھر جیئے!

تشریح: کوئی لونڈی بڑے ناز و انداز سے بیٹھی حقہ پی رہی ہے جبکہ کوئی اپنا وقت عشق و عاشقی

کی باتوں میں صرف کر رہی ہے اور عشق و عاشقی کو ہی زندگی تصور کرتی ہے اور وفا کے سہارے زندہ ہے۔

شعر نمبر ۵۸:۔ کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے — کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلائے

تشریح: کوئی خادمہ حوض میں نہا رہی ہے اور کوئی محض نہر کے کنارے بیٹھی ہے اور پانی میں پاؤں ڈالے عالم سرخوشی میں پاؤں ہلا رہی ہے۔

شعر نمبر ۵۹:۔ کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر — کوئی اپنی مینا پر رکھے نظر!

تشریح: کوئی اپنے طوطے کی دیکھ بھال میں مصروف ہے اور کسی کو اپنی مینا عزیز ہے اور وہ اس کی حفاظت میں لگی رہتی ہے۔

شعر نمبر ۶۰:۔ کسی کو کوئی دھول مارے کہیں — کوئی جان کو اپنے وارے کہیں!

تشریح: کوئی ازراہ شرارت و شوخی کسی کو تھپیڑ مارتی ہے جبکہ کوئی دوسری خاتون عشق و عاشقی میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔

شعر نمبر ۶۱:۔ کوئی آرسی اپنے آگے دھرے — ادا سے کہیں بیٹھ کنگھی کرے

تشریح: کسی نے آرسی یعنی آئینہ اپنے آگے رکھا ہوا ہے اور وہ اپنے گیسو کی آرائش میں مصروف ہے اور کنگھی کر رہی ہے۔

شعر نمبر ۶۲:۔ مقابہ کوئی کھول مسی لگائے — لبوں پر دھڑی کوئی اپنے جمائے

تشریح: کسی نے سنگار دان اپنے آگے رکھا ہوا ہے اور وہ اپنے ہونٹوں پر مسّی لگانے میں مصروف ہے اور یوں اپنے حسن اور دلکشی میں اضافہ کر رہی ہے۔

شعر نمبر ۶۳:۔ ہوا ان گلوں سے دو بالا سماں — اسی باغ میں تھا وہ سرو رواں

تشریح: غرض پھولوں پودوں اور نہروں کے علاوہ ان پھولوں جیسی حسین و نازک خواتین کی وجہ سے بھی باغ کے حسن و رعنائی میں اضافہ ہوا اور انہی سب کے درمیان اِس بڑھتے ہوئے سرو یعنی شاہزادہ بے نظیر کی پرورش ہوئی وہ اِسی باغ میں موجود تھا۔

داستان بے نظیر کے غم ہجر سے بدر منیر کی بے قراری میں

شعر نمبر ۶۴:۔ کئی دن نہ آیا جو وہ رشک ماہ — نظر میں ہوا اس کی عالم سیاہ

تشریح: میر حسن بے نظیر کے گم ہونے اور ملاقات کے لئے بدر منیر کے پاس نہ آنے کے بعد کی کیفیت بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جب بے نظیر جو اپنے حسن و خوبی میں چاند سے بھی بڑھا ہوا تھا، کئی دن تک بدر منیر سے ملنے نہ آیا تو بدر منیر کی نظروں میں دنیا تاریک ہو گئی یعنی اُس کی تمام امیدیں، آرزوئیں اور ولولے ختم ہو گئے اور وہ بے حد اداس و غمزدہ ہو گئی۔

شعر نمبر ۶۵:۔ لگی کہنے بجم النساء سے لوا ! خدا جانے اس شخص کو کیا ہوا !

تشریح: ایک دن وہ اپنی دوست اور سہیلی وزیر زادی بجم النساء کو کہنے لگی کہ اللہ جانے بدر منیر کو کیا ہو گیا آخر وہ کیوں نہیں آتا اور آج کل اُس کی کیا مصروفیات ہیں یا یہ کہ وہ کن مصائب میں مبتلا ہو گیا ہے۔

شعر نمبر ۶۶:۔ کہا اس نے بی تم کو سودا ہے کچھ وہ معشوق ہے اس کو پروا ہے کچھ

تشریح: بجم النساء کہنے لگی کہ بہن تمہیں تو جنون ہو گیا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ بے نظیر عاشق نہیں بلکہ محبوب ہے اور محبوب کسی کی پروا نہیں کیا کرتے۔ لہٰذا اُسے بھی تمہاری پروا نہیں ہے۔

شعر نمبر ۶۷:۔ خدا جانے کس شغل میں لگ گیا مری چڑھ ہے اتنا بھی ہونا فدا

تشریح: نہ معلوم وہ بے پروا کس دلچسپی میں مشغول ہو گیا ہے لیکن تم اُس پر قربان ہوئی جاتی ہو۔ جبکہ مجھے یہ صورتِ حال ناگوار لگتی ہے یعنی میں اس بات کی قائل ہوں کہ جو تمہارا خیال نہ رکھے تم بھی اُس پر اپنی جان قربان نہ کرو۔

شعر نمبر ۶۸:۔ وہ رہ رہ کے تم کو دلاتا ہے چاہ عبث آپ کو مت کرو تم تباہ

تشریح: وہ نفسیاتی حربوں سے کام لیتا ہے اور رہ رہ کر تمہیں اپنی محبت میں مبتلا کرتا اور اس محبت میں اضافہ کرتا ہے لہٰذا تمہیں بھی بے پروا ہو جانا چاہیے اور خواہ مخواہ اپنی تباہی کا سامان نہیں کرنا چاہیے۔

شعر نمبر ۶۹:۔ رکے جو کوئی اس سے رک جائیے جھکے آپ سے اس سے جھک جائیے

تشریح: زندگی کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی آپ سے دور ہونا چاہیے اور تعلقات منقطع کرنا چاہے تو آپ بھی ویسا ہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے تعلقات منقطع کریں اور اگر کوئی آپ کی طرف جھکے تو بے شک آپ بھی اُس کی طرف جھک جائیں اور تواضع سے پیش آئیں۔

شعر نمبر ۷۰:۔ تفول بھلا کچھ نکالا کرو ! ذرا آپ کو تم سنبھالا کرو !

تشریح: تم اپنے طرزِ عمل سے اچھا شگون لیا کرو اور غم و اندوہ میں مبتلا ہونے کی بجائے خود کو سنبھالا کرو۔

شعر نمبر ۷۱:۔ یہ سن چپ رہی دل میں کھا پیچ و تاب دیا پھر نہ اس بات کا کچھ جواب

تشریح: بدر منیر نے بجم النساء کی یہ باتیں سنیں اُسے غصہ آیا لیکن وہ چپ کر گئی اور بجم النساء کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔

شعر نمبر ۷۲:۔ گئے اس پہ جب دن کئی اور بھی بگڑنے لگے پھر تو کچھ طور بھی !

تشریح: جب اس گفتگو کو مزید کچھ دن گزر گئے اور بے نظیر نہ آیا تو بدر منیر کے اندازِ کیفیت زیادہ خراب ہونے لگی۔

شعر نمبر ۳: وہ دیوانی سی ہر سمت پھرنے لگی ۔۔۔ درختوں میں جا جا کے گرنے لگی!

تشریح: وہ بے نظیر کے ہجر میں مجنون اور دیوانی بن گئی اور سب لوگوں سے دور اکیلی درختوں کے قریب پناہ لینے لگی۔

شعر نمبر ۴: ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب ۔۔۔ لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب!

تشریح: وہ ہمہ وقت مضطرب اور بے چین رہنے لگی اور سوتے میں اُسے زیادہ پریشان کن خواب آنے لگے۔ یہ شعر بہت خوبصورت ہے خاص طور پر اضطراب کے ٹھہرنے کا تصور پُرلطف ہے۔

شعر نمبر ۵: تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی! ۔۔۔ دراشک سے چشم بھرنے لگی،

تشریح: اُسے ہجر و فراق کا بخار رہنے لگا یعنی یہ کیفیت بدر منیر پر طاری ہو گئی اور ہمہ وقت رونا اور آنسو بہانا اُس کا مقدر ہو گیا۔

شعر نمبر ۶: خفا زندگانی سے ہونے لگی ۔۔۔ بہانے سے جا جا کے سونے لگی

تشریح: اُسے عام زندگی سے دلچسپی نہ رہی اور وہ ہر وقت اداس و پریشان رہنے لگی۔ دوسروں سے اپنی کیفیت کو چھپانے کے لئے مختلف بہانے بنا بنا کر سونے لگی۔ یعنی وہ سونے کا بہانہ کرتی تھی تاکہ لوگوں سے دور رہنے کی صورت پیدا ہو۔

شعر نمبر ۷: تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ ۔۔۔ اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ

تشریح: جب ہجر و فراق کی کیفیت زیادہ شدید ہوتی تو اُس کا جسم کانپنے لگتا اور وہ بے نظیر کی یاد میں سب سے الگ منہ چھپا چھپا کر رونے لگتی۔

شعر نمبر ۸: نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا! ۔۔۔ نہ کھانا نہ پینا، نہ لب کھولنا!

تشریح: بے نظیر سے ملاقات سے قبل بدر منیر جس طرح خوش و خرم رہتی تھی۔ وہ انداز رخصت ہو گیا اور لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا اور ہنسنے بولنے کی کیفیت ختم ہو گئی۔ اُس نے کھانا پینا اور بات چیت کرنا چھوڑ دیا یعنی ان سب باتوں میں اُس کا دل نہیں لگتا تھا۔

شعر نمبر ۹: جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اسے ۔۔۔ محبت میں دن رات گھٹنا اسے

تشریح: بے نظیر جہاں بیٹھ جاتی پھر وہیں بیٹھی رہتی اور بدر منیر کی سوچوں میں اس قدر گم ہو جاتی کہ اُس جگہ سے اُٹھنے کا نام نہ لیتی۔ اس طرح وہ بدر منیر کی محبت میں دن رات گھٹنے لگی، اُس کی صحت خراب رہنے لگی اور وہ کمزور ہوتی چلی گئی۔

شعر نمبر ۸۰: کہا گر کسی نے کہ "بی بی چلو" — تو اٹھنا اسے کہہ کے "ہاں جی چلو"

شعر نمبر ۸۱: جو پوچھا کسی نے کہ "کیا حال ہے" — تو کہنا "یہی ہے جو احوال ہے"

تشریح: اُسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ اگر کسی نے اُٹھنے چلنے کے لیئے کہا تو چل پڑی ورنہ جہاں بیٹھی ہے وہیں پر بیٹھی رہتی۔ اگر کوئی اُس کا حال پوچھ لیتا تو زیادہ گفتگو سے گریز کرتے ہوئے مختصر سا جواب دیتی اور کہتی ہے کہ بس یہی حال ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔

شعر نمبر ۸۲: کسی نے جو کچھ بات کی بات کی — پر دن کی جو پوچھی کہی رات کی!

تشریح: بدر منیر خود تو کسی کے ساتھ بولتی ہی نہیں تھی۔ اگر کوئی شخص اُسے مخاطب کرتا اور بلاتا تو یہ بھی ہوں ہاں میں اُس کا جواب دے دیتی۔ لیکن چونکہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہوتی تھی لہٰذا مخاطب کو اُس کے سوال کا صحیح جواب نہیں ملتا تھا۔ اگر اُس سے دن کی کیفیت پوچھی جاتی تو وہ رات کا حال بیان کرنے لگتی۔

شعر نمبر ۸۳: کہا گر کسی نے کہ "کچھ کھایئے" — کہا "خیر بہتر ہے منگوایئے"!

تشریح: بدر منیر ہجر کی وجہ سے اس قدر بے حواس و بے دماغ تھی کہ اُسے کھانے پینے کی بھی کچھ فکر نہیں تھی۔ ہاں اگر کوئی شخص اُسے کھانے کے لیئے کہتا تو وہ انتہائی بے دلی سے جواب دیتی کہ ہاں کچھ منگوا لیں۔

شعر نمبر ۸۴: کسی نے کہا "سیر کیجیئے ذرا" — کہا "سیر سے دل ہے میرا بھرا"

تشریح: اگر کوئی اُسے کہتا کہ آیئے ذرا سیر کو چلیں تو وہ جواب دیتی "نہیں سیر و شغل سے میرا دل بھر چکا ہے اور میرے لیئے اس میں کوئی دلکشی و دلچسپی نہیں"۔

شعر نمبر ۸۵: جو پانی پلاتا تو پینا اسے — غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے

تشریح: کھانے سے زیادہ انسان کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بدر منیر کو پانی تک پینے کا ہوش نہیں تھا۔ اگر کسی نے پلا دیا تو پی لیا ورنہ خیر سلا۔ یوں گویا وہ صرف دوسروں کی توجہ کی وجہ سے زندہ تھی اور زندگی میں اُس کی اپنی دلچسپی یکسر ختم ہو گئی تھی۔

شعر نمبر ۸۶: نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش — بھرا دل میں اس کے محبت کا جوش

تشریح: اُسے کھانے پینے کا ہوش اس لیئے نہیں تھا کہ اُس کا دل محبت کے جذبے سے معمور تھا اور اس جذبے کی شدت نے اُسے دیگر تمام چیزوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

شعر نمبر ۸۷: چمن پر نہ مائل نہ دل پر نظر — وہی سامنے صورت آٹھوں پہر

تشریح: نہ اُسے باغ کی رعنائی اچھی لگتی تھی اور نہ پھول اس کا دل لبھاتے تھے بلکہ ہر وقت اُس کے سامنے بے نظیر کی شکل رہتی تھی اور وہ رات دن بے نظیر ہی کے خیالات میں

کھوئی رہتی تھی۔

شعر نمبر ۸:۔ نہفتہ اسی سے سوال و جواب　　　　سدا روبرو اس کے غم کی کتاب!

تشریح: بدر منیر اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی دوسرے لوگوں سے چھپا کر بے نظیر سے سوال جواب میں مصروف رہتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے ہر وقت اُس کے سامنے غم کی کتاب کھلی ہوئی ہے جس نے اُسے غمزدہ اور بے قرار کر رکھا ہے۔ شعر میں کتاب، روبرو اور سوال و جواب کی رعایات خوب ہیں۔

غلام ہمدانی مصحفی

غزل

حل لغات: حسرت - کسی چیز کے نہ ملنے کا افسوس، پشیمانی، ارمان، شوق؛ شوخ - شریر، بے باک؛ تیغ - تلوار؛ کج - ٹیڑھی؛ کلاہ - ٹوپی؛ نخوت - غرور، تکبر؛ ضبط - نگہبانی، حفاظت، قابو، تحمل، قید، پابندی؛

شعر نمبر ۱:۔ دیکھ اُس کو اک آہ ہم نے کرلی　　　　حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی

تشریح: جب ہم نے محبوب کو دیکھا تو ہمارے منہ سے بے اختیار ایک آہ نکلی اور انتہائی حسرت کے عالم میں ہم اُس کی طرف دیکھتے رہ گئے اور ہمیں اُس کے نہ ملنے کا سخت افسوس ہوا۔ یہ افسوس اور پشیمانی اس لئے تھی کہ ہم نے ایسے شخص سے محبت کیوں کی جس کا ملنا بھی ناممکن ہے؛

شعر نمبر ۲:۔ کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے　　　　اس شوخ سے راہ ہم نے کر لی

تشریح: اگرچہ ہم محبوب کی بزم میں نہ جا سکے اور ہمیں بامر مجبوری اپنے گھر میں مقید ہونا پڑا لیکن کون جانے کہ ہم نے گھر بیٹھے بٹھائے اُس شوخ و شریر اور بے باک محبوب سے دوستی پیدا کر لی۔ یعنی محبوب سے ملنا تو ممکن نہیں لیکن خیالات پر کون پابندی لگا سکتا ہے اور وہ ہمہ وقت ہمارے خیال میں رہتا ہے اور یوں ہم ایک دوسرے سے بہت مانوس ہو گئے ہیں۔ اس مضمون کو مومن نے بہت اچھے اسلوب میں نظم کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شعر نمبر ۳:۔ جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر　　　　ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

تشریح: جب ہمارے محبوب نے ہم پر اپنے نازو ادا کی تلوار چلائی تو ہم نے اپنے ہاتھوں کی ڈھال بنائی اور ہم ہاتھوں کی آڑ میں آ گئے۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ اس

طرح ہمارے ہاتھ کٹ گئے اور ہم بالکل ہی بے بس ہو گئے یعنی ہاتھ کٹ جانا بجائے خود بے بسی کی دلیل ہے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے ہاتھوں کو ڈھال بنایا یعنی محبوب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنے کمتری کا اظہار کر دیا اور یوں محبوب کے دل میں ہمارے لئے رحم کا جذبہ بیدار ہو گیا۔

شعر نمبر ۴: نخوت سے جو کوئی پیش آیا — کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

تشریح: ہم انتہائی مسکین اور فقیر منش آدمی ہیں اور لوگوں سے عاجزی وانکساری سے پیش آتے ہیں لیکن اگر کوئی ہمارے سامنے غرور وتکبر کا مظاہرہ کرے اور نخوت سے پیش آئے تو ہم بھی اپنے عجز کو نظر انداز کر کے اپنی کلاہ کج کر لیتے ہیں۔ واضح ہو کہ کلاہ کج کرنا اور ٹوپی کو سر پر ٹیڑھا رکھنا غرور وتکبر کی علامت ہے۔ اور اسلام میں تکبر کے ساتھ تکبر کرنے کو صدقہ کہا گیا ہے یعنی عام حالات میں انسان کو منکسر المزاج ہونا چاہیے لیکن اگر کوئی مغرور ہو تو پھر غرور کرنا کارِ ثواب ہے۔

شعر نمبر ۵: دی ضبط میں جب کہ مصحفی جان — شرم اس کی گواہ ہم نے کر لی

تشریح: مصحفی کہتے ہیں کہ ہم نے عشق میں بے صبری و بے تابی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے تمام پیش آمدہ مصائب کا مقابلہ انتہائی تحمل اور بردباری سے کیا اور خود پر قابو رکھا یہاں تک کہ جان دے دی اور یوں ہمارے محبوب کی رسوائی ہونے سے بچ گئی۔ گویا ہم نے اپنی موت کا گواہ محبوب کی شرم وحیا کو بنایا۔ یعنی اسے کوئی لاج نہ لگنے دی۔

انشاء اللہ انشاء

غزل

حلِ لغات: کمر باندھنا۔ سفر کو تیار ہونا، پکا ارادہ کرنا، امید رکھنا: یار۔ دوست، ساتھی: نکہت۔ پھولوں کی خوشبو، مہک: راہ لگنا۔ رستہ پکڑنا، پیرو ہونا، اپنا کام کرنا: اٹھکیلیاں۔ چنچل پن، ناز، شوخی: بیزار۔ ناخوش، ناراض، خفا، متنفر: پرے۔ دور، آگے: عرش۔ مادیات و فلکیات کی حدود سے بالاتر ایک منزل جہاں مقرب فرشتوں کے علاوہ صرف آنحضرتؐ شبِ معراج کو پہنچے: زور۔ عجیب وغریب، انوکھا، بہت اچھا: دھن۔ مقصود، دھیان، لگن: بسان۔ حرفِ تشبیہ، مانند، کی طرح: نقش پائے رہرواں۔ سفر کرنے والوں کے پاؤں کے نشانات: لاچار۔ بے بس: چال۔ حالت، کیفیت: افتادگی۔

مصیبت ؛ پہروں - ہر دن کے چوتھے حصے کو کہتے ہیں یعنی تین گھنٹے یہاں پہروں سے وقت کی کثرت کا اظہار مقصود ہے ؛ ننگ و نام - شرم ، غیرت ، عزت ، عصمت ؛ نجیب - شریف ، بزرگ ؛

شعر نمبر ۱: کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں - بہت آگے گئے ، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

تشریح: انشا کہتے ہیں کہ اس دنیا میں جس قدر لوگ اور دوست احباب ہیں وہ سب یہاں سے کوچ کرنے کا پختہ ارادہ کئے بیٹھے ہیں - اس دنیا میں چل چلاؤ لگ رہا ہے - کچھ ہم سے پہلے رخصت ہو گئے اور دارِ فانی کو سدھارے جو رہ گئے ہیں وہ ہمہ وقت تیار ہیں اور کسی بھی وقت سفر پر روانہ ہو سکتے ہیں - انشاؔ کا یہ شعر انسانی حیات و موت کے ضمن میں ہے اور اس آیتِ قرآنی کی شرح ہے کہ کل نفسٍ ذائقۃ الموت - اس دنیا میں جو پیدا ہوا اُسے مرنا ضرور ہے۔ البتہ آگے پیچھے کا فرق ہو سکتا ہے - اِسی بات کو مجید امجد نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

ے عدم کے راستے پر آنکھ میچے — کوئی آگے رواں ہے کوئی پیچھے

شعر نمبر ۲: نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری ، راہ لگ اپنی — تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تشریح: یہ شعر حاصل غزل ہے - سید انشا اللہ انشاؔ کہتے ہیں کہ بہار کی ہوا کے ساتھ آنے والی خوشبو حسبِ معمول چنچل پن اور شوخی کا مظاہرہ کرتی ہے عام حالات میں یہ شوخی اور چنچل پن اچھا لگتا تھا لیکن اب جبکہ انشاؔ دنیا سے بیزار و متنفر ہو گئے ہیں اور کسی چیز میں اُن کا دل نہیں لگتا تو انھیں یہ شوخی گراں گزرتی ہے - لہٰذا وہ خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے نکہت مجھے پریشان نہ کر اور اپنا کام کر - اس لئے کہ تجھے تو اب شوخی و شرارت سوجھ رہی ہے جبکہ میں انتہائی آزردہ اور اداس ہوں اور مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔

شعر نمبر ۳: خیال اُن کا پرے ہے عرشِ اعظم سے کہیں ساقی
غرض کچھ اور دھن میں اِس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

تشریح: اے ساقی ! یہ شراب پینے والے اس وقت اپنے عجیب و غریب اور انوکھے تصور میں کھوئے ہیں اور اگر آپ اندازہ کر سکیں تو معلوم ہو گا کہ اس وقت ان کے خیالات عرشِ اعظم سے بھی آگے ہیں یعنی اُس مقام پر ہیں جہاں عام حالات میں انسان کا گزر بھی ممکن نہیں - لہٰذا انھیں پکارنے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

شعر نمبر ۴: بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں — نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

تشریح: انشا کہتے ہیں کہ جس طرح مسافروں کے پاؤں کے نشانات زمین سے اُٹھ نہیں سکتے اور حرکت کرنا اُن کے بس میں نہیں ہوتا - اسی طرح ہم بھی اپنی تمناؤں کے کوچے میں انتہائی بے بی

کے عالم میں بیٹھے ہوئے ہیں نہ ہم سے اُٹھا جاتا ہے اور نہ ہمارے لیے ترکِ تمنا ممکن ہے۔ گویا انشاؔ نے عشق و محبت میں انسان کی بے بسی اور لاچاری کا نقشہ کھینچا ہے اور اُن کے نزدیک نہ عشق میں محبوب کا حصول ممکن ہے اور نہ عشق ترک کرنا عاشق کے بس میں ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۵: یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے ان دنوں پہروں نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

تشریح: پے در پے مصائب کے باعث ہماری کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ جہاں بھی دیوار کا سایہ دیکھتے ہیں یعنی جہاں بھی تھوڑا بہت آرام و سکون میسر آنے کا امکان ہو سکتا ہے وہاں بیٹھ جاتے ہیں اور پھر پہروں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

شعر نمبر ۶: کہیں ہیں صبر کس کو، آہ ننگ و نام ہے کیا شے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں

تشریح: انشاؔ کا کہنا ہے ہمارا صبر بھی رخصت ہو گیا اور شرم و غیرت بھی نہ رہی یعنی عشق میں ان دونوں چیزوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اب تو ان سے ذرا سا تعلق اور شناسائی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ عشق کی شدت کے باعث ہم نے ان سب چیزوں کا ایک بار ہی ماتم کر لیا۔ ماتم کے تصور سے صبر و قرار اور ننگ کے ختم ہونے کی طرف اشارہ مقصود ہے اس لئے ماتم ایسی چیزوں کا کیا جاتا ہے جو ختم ہو جائیں۔

شعر نمبر ۷: نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

تشریح: سید انشاؔ اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دور میں شرفاء کا حال نہ پوچھیے اس لئے کہ سب کا ایک جیسا حال ہے اور سب لوگ بیکاری و بے روزگاری کا شکار ہیں۔ اصل میں یہ ساری غزل انشاؔ کی زندگی کے اُس دور کی ہے جب وہ نواب سعادت علی خان کے زیرِ عتاب تھے۔ اس کے علاوہ یہ عہد فنکاروں کے لئے بطورِ خاص تکلیف دہ تھا۔ اس سے ذرا ہی پہلے میر تقی میرؔ، سوداؔ، ضاحکؔ، میر حسنؔ اور مصحفیؔ کے علاوہ خود انشاؔ کو دہلی سے نکل کر در بدر ہونا پڑا۔ یہ لوگ لکھنؤ پہنچے لیکن یہاں بھی اکثر شاعروں کو اطمینان میسر نہ آیا۔ انشاؔ نے انہی حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرؔ نے بھی یہی کہا ہے۔

ضائع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی

شعر نمبر ۸: کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے سنا انشاؔ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

تشریح: انشاء اللہ خان انشاؔ مقطع میں کہتے ہیں کہ میری یہ بات دھیان سے سُن کہ تقدیر کسی کو چین نہیں لینے دیتی اور ہمیشہ پریشان و آشفتہ حال رکھتی ہے۔ اس کے باوجود اگر چند ایک یار دوست جمع ہیں اور اکٹھے اُن کا وقت گزر رہا ہے تو یہ مقام شکایت نہیں بلکہ مقام شکر ہے۔ اس لئے کہ

معلوم نہیں کب کس پر کیا مصیبت آپڑے اور وہ اپنے ساتھیوں سے جدا ہو جائے۔

حیدر علی آتش

غزل نمبر ۱

حلِ لغات ساں۔ کی طرح، مانند۔ حرف تشبیہہ؛ دم نہ مارنا۔ اُف نہ کرنا، چپ رہنا، شکوہ نہ کرنا، قائل ہو جانا؛ مقسوم۔ جو کچھ قسمت میں ہو؛ پسارنا۔ پھیلانا؛ طالب، چاہنے والا؛ زر۔ دولت، سونا؛ طمع۔ لالچ؛ نیاریئے۔ سنار کی خاک چھان کر سونے کے ذرے علیحدہ کرنے والے؛ ابتر۔ بدحال، منتشر؛ سنبل۔ ایک قسم کا خوشبودار گھاس جسے شعراء زلفوں سے تشبیہہ دیتے ہیں؛ غریبی۔ وطن سے دور ہونے کی کیفیت، پردیسی؛ فاتحہ پڑھنا۔ مردے کی روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے قرآنی آیات کی تلاوت کرنا، مایوس ہو جانا؛ خاک میں ملانا۔ تباہ کرنا، زمین کا پیوند کرنا، مار ڈالنا؛ کارواں۔ قافلہ؛ جرس۔ قافلے کے ساتھ بجنے والی گھنٹی؛

شعر نمبر ۱: سر شمع ساں کٹائیے، پر دم نہ مارئیے ۔۔۔ منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریئے

تشریح شمع کو روشن کر دیا جائے تو اس کا اوپر کا حصہ آہستہ آہستہ پگھلتا اور ختم ہوتا رہتا ہے۔ آتش اسی عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھئے شمع کا سر کٹ رہا ہے لیکن نہ وہ کسی کو پکارتی ہے نہ احتجاج کرتی ہے نہ نالہ و فریاد کرتی ہے اور نہ کسی سے شکوہ و شکایت کرتی ہے۔ پس انسان کی زندگی بھی ایسی ہی ہونی چاہیے۔ اس کے راستے میں ہزارہا مشکل منزلیں آئیں پھر بھی انسان کو ہمت ہارے بغیر نہایت بہادری سے اپنی منزل کی طرف گامزن رہنا چاہیے اور ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

شعر نمبر ۲: مقسوم کا جو ہے سو وہ پہنچے گا آپ سے ۔۔۔ پھیلایئے نہ ہاتھ، نہ دامن پساریئے

تشریح آتش اسلامی فقر اور غیرت و خودداری کا اصول بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نہ تو ہمیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا چاہیے اور نہ اپنا دامن۔ یعنی جو بھی صورت حال ہو لیکن ہم کسی کے آگے سوال نہ کریں۔ اس لئے کہ جو کچھ ہماری قسمت میں ہے وہ بہر حال ہمیں ملے گا اور خود بخود ہم تک پہنچے گا اور جو کچھ ہمارے نصیب میں نہیں لکھا وہ ہم دامن پھیلانے سے بھی نہیں پا سکتے۔ اور جب یہ صورت ہے تو پھر سوال کر کے ذلیل و خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ واضح رہے کہ یہ شعر بہت عمدہ اخلاقی اصول کو پیش کرتا ہے لیکن اس تصور کی غلط تعبیر نے ہمارے معاشرے میں بہت سی خامیوں کو بھی راہ دی اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے۔ محنت سے جی چرانے لگے اور یہ سوچ لیا کہ جو کچھ مقدر

میں ہے وہ ہر حال میں ملے گا تو پھر جد و جہد کی کیا ضرورت ہے یوں اِس تصور نے ہمارے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

شعر نمبر ۳:۔ طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل وخوار زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک بنا ہیئے

تشریح: آتش کہتے ہیں کہ اس دنیا میں جو شخص بھی مال و دولت کا خواہاں ہوگا اور اس کے لالچ میں مبتلا ہوگا بالآخر ذلیل و خوار ہوگا اور تباہی و بربادی اُس کا مقدر ٹھہرے گی۔ اس کے لئے خواجہ آتش ایک بہت عمدہ مثال دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ اُن لوگوں کو دیکھیے جو سنار کی بھٹی سے راکھ لے کر بڑی محنت کے بعد اس راکھ میں شامل سونے کے ذرات کو الگ کرتے ہیں اور انھیں یہ ساری راکھ چھاننا پڑتی ہے۔ جس سے اُن کی حالت بے حد خراب ہو جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں چہرہ اور لباس خاک آلود ہو جاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ایک نیاریئے کی یہ حالت کیوں؟ جواب یہ ہے کہ صرف دولت کے لالچ کی وجہ سے۔ اس شعر میں خاک چھاننا مجازی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور حقیقی معنوں میں بھی۔

شعر نمبر ۴:۔ برہم نہ ہو مزاج کسی وقت آپ کا ابتر ہوتی ہیں زلفیں نہایت اسنواریئے

تشریح: آتش محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ آپ اپنی زلفیں دیکھیے۔ یہ بے حد بکھر گئی ہیں لہٰذا آپ انھیں سنوار لیں اور درست کر لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زلفوں کی یہ ابتری اور انتشار آپ کے مزاج پر بھی اثر انداز ہو اور آپ کا مزاج بھی بگڑ جائے۔ اس شعر میں کوئی خاص خوبی نہیں صرف مزاج کی برہمی اور زلفوں کی ابتری اور پھر زلفوں کے سنوارنے میں رعایات ملحوظ ہیں جو لکھنوی دبستان شاعری کا خاصہ ہے۔

شعر نمبر ۵:۔ نرگس کو صدقہ کیجیے بیمار چشم کے زلفِ سیاہ پر تری سنبل کو واریئے

تشریح: نرگس ایک بہت اچھا پھول ہے لیکن اس کے مقابلے میں اے محبوب تیری چشم بیمار بہت ہی خوشنما اور دیدہ زیب ہے لہٰذا ہماری دلی تمنا ہے کہ نرگس کو آپ کی آنکھوں کے صدقے کر دیں۔ اس طرح سنبل ایک بہت عمدہ اور خوشبودار گھاس ہے لیکن آپ کی زلفیں اس سے کہیں زیادہ اچھی ہیں لہٰذا جی چاہتا ہے کہ ان زلفوں پر سنبل کو قربان کر دیں۔ رعایتوں کے علاوہ اس شعر میں بھی کچھ نہیں اور شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی آنکھوں اور زلفوں کے مقابلے میں نرگس اور سنبل کی کوئی حیثیت نہیں۔

شعر نمبر ۶:۔ تنہائی ہے، غریبی ہے، صحرا ہے، خار ہے کون آشنائے حال ہے کس کو پکاریئے

تشریح: کسی پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے تو وہ مدد و تعاون کے لیے کسی دوست یا ساتھی کو بلاتا ہے تاکہ وہ مشکل سے نجات پا سکے۔ لیکن ایک شخص سفر کرتا ہوا اپنے وطن سے دور چلا گیا جہاں

کوئی ساتھی آشنا اور ہم وطن موجود نہیں ۔ پھر جہاں وہ پہنچا ہے وہاں کوئی آبادی بھی نہیں بلکہ صحرا ہے صحرا میں کسی ہم نفس کی تلاش ناممکن ہے اور یوں یہ شخص بالکل یکہ و تنہا ہو گیا ہے اور مستزاد یہ ہے کہ سفر نہایت دشوار ہے اس لئے کہ یہاں پر کانٹے ہی کانٹے اور مشکلات ہی مشکلات ہیں شاعر کہتا ہے کہ بھلا ایسی کیفیت میں کون ہمدرد ہے جو ہمدردی کر سکے ، کون شخص ہے جو میرے دل سے واقف ہو اور کون دوست ہے جسے مدد کے لئے پکارا جائے ۔ یہ مشکلات تو انسان کو تنہا ہی برداشت کرنی ہیں ۔ غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس شعر کا انسان کے سفرِ زندگی اور سفرِ آخرت سے نہایت گہرا تعلق ہے ۔ خاص طور پر موت کے بعد جو مراحلِ سفر ہیں اُن کی نشاندہی کرتا ہے ۔

شعر نمبر ۷ :۔ تبدیل روزِ وصل سے فرقت کی شب ہوئی ۔ آئی ہوئی بلا ٹلی صدقہ اتاریئے

تشریح | آتشؔ کہتے ہیں کہ ہم ہجر کے مارے ہوئے تھے اور ہماری زندگی پر فرقت کی شب چھائی ہوئی تھی ۔ خوش قسمتی سے یہ رات کٹ گئی اور ہماری مشکلات و مصائب کا دور ختم ہو گیا ۔ وصل کا دن آیا یوں ہم خوشیوں سے سرشار ہو رہے ہیں اور چونکہ فرقت کی مصیبت ٹل گئی ہے اور مصیبت ختم ہونے پر انسان شکرانے کے طور پر کچھ نہ کچھ قربان کرتا ہے لہذا ہمیں بھی کچھ صدقہ کرنا چاہیے ۔ اِس شعر میں بھی صنعتیں ہی صنعتیں ہیں ۔

شعر نمبر ۸ :۔ تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوئے ۔ بس خاک میں ملا چکے اچلیئے سدھاریئے

تشریح | آتشؔ کہتے ہیں کہ ہم مر گئے اور ہمیں لوگوں نے دفن کر دیا یہی نہیں کہ اے محبوب تم نے ایصالِ ثواب کے لیئے فاتحہ بھی پڑھ لی گویا ہماری موت کی تمام رسومات پوری ہو چکیں ۔ پھر اب کس امید اور توقع پر تم یہاں موجود ہو ۔ تم تو اپنے طور پر ہمیں ختم کر چکے لہذا اب یہاں سے جایئے لطف یہ ہے کہ شعر میں بہت سے لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معنی میں استعمال ہو رہے ہیں مثلاً یہ معنی بھی ہیں کہ تم تو ہمیں ذلت و خواری کی انتہا تک پہنچا چکے یہاں تک کہ خاک میں ملنا اور ذلیل و تباہ ہونے کا تو ذکر ہی کیا تم نے تو ہمیں دفن تک کر دیا اور پھر ہم سے حد درجہ مایوس ہو گئے جب ہماری یہ حالت ہو گئی اور تمہیں ہم سے کوئی امید اور توقع نہ رہی تو پھر ہماری طرف دیکھنے کے کیا معنی ! لہذا اب تشریف لے چلیئے اور ہماری مزید ذلت کا سبب نہ بنیئے ۔

شعر نمبر ۹ :۔ دکھلائی دے جو آنکھوں کو یوسف کا کارواں ۔ چلّایئے جرس کی طرح سے پکاریئے

تشریح | اگر کہیں حضرت یوسفؑ مراد محبوب کا قافلہ نظر آئے اور تم اُسے دیکھ پاؤ تو پھر چپ رہ کر قطعاً یہ موقع ضائع نہ کیجئے ۔ بلکہ اگر ممکن ہو تو قافلے کی گھنٹی کی طرح مسلسل اور زور زور سے چلایئے آخر کسی نہ کسی وقت محبوب تمہاری طرف بھی متوجہ ہو ہی جائے گا ۔

شعر نمبر ۱۰ :۔ نازک دلوں کو شرط ہے آتشؔ خیالِ یار ۔ شیشہ خدا جو دے تو پری کو اُتاریئے

تشریح اے آتشؔ جن لوگوں کا دل نازک ہو انہیں چاہیے کہ وہ دل کی نزاکت کو کام میں لائیں اور دل کی نزاکت کو کام میں لانے سے یہ مراد ہے کہ اس شیشے میں پری کو اتاریں یعنی عشق اختیار کریں اور ہمہ وقت خیال محبوب میں زندگی بسر کریں۔ نزاکت کی وجہ سے دل کو شیشہ قرار دیا گیا۔ یعنی جس طرح محاورۃً شیشے میں پری اتاری جاتی ہے اسی طرح دل میں خیالِ یار کو اتارنا چاہیے۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات عدم۔ موت، نیستی، زندگی کا نہ ہونا؛ ہستی۔ زندگی؛ دیار۔ شہر، ملک؛ سمند۔ گھوڑا؛ عناں گستہ۔ بے لگام، بے مہار؛ بدرقہ۔ رہنما؛ دوش۔ کندھا؛ بار۔ بوجھ؛ راہ زن۔ ڈاکو۔ راستے میں لوٹنے والا؛ گلِ مراد۔ مقصود، محبوب؛

شعر نمبر ۱: ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے — خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

تشریح خواجہ آتشؔ گلستان سے خزاں کے جانے اور بہار کے آنے کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ بس اب خزاں جا رہی ہے۔ بہار کی آمد آمد ہے وہ ہوائیں جن کی گردش نے گلستان کو تاراج کر دیا تھا رخصت ہو رہی ہیں اور خوشگوار شراب کا دور چلنے والا ہے یعنی غم واندوہ کے دن ختم ہونے والے ہیں اور اچھے دن آنے والے ہیں۔

شعر نمبر ۲: گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے — بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

تشریح یقیناً آج کوئی ایسا شخص سفر کر رہا ہے جو بہت زیادہ سخی اور دیالو ہے جو ہر مانگنے والے کا دامن بھر دینے اور ہر فقیر کو مالا مال کر دینے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رستے میں بے حد غبار اُڑ رہا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اس غنی شہ سوار کے ساتھ بے شمار حاجتمند سفر کر رہے ہیں اور اُس کی مہربانی سے سرفراز ہو رہے ہیں۔

شعر نمبر ۳: عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں — نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

تشریح آتشؔ اسلامی عقیدے کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آخرت کے سفر کی تیاری اسی دنیا میں کر لینی چاہیے اور وہاں پر جس قسم کا اسباب سفر درکار ہوگا وہ اسی دنیا میں زندہ رہتے ہوئے جمع کر لینا چاہیے تاکہ سفر کے دوران کوئی دشواری پیش نہ آئے اور یہ بات اس لئے ضروری ہے کہ جب ہم سفرِ آخرت پر روانہ ہوں گے تو راستے میں کوئی شہر یا ملک نہیں آئے گا جہاں سے ہم ضرورت کے مطابق چیزیں لے سکیں گے یعنی اگلی دنیا میں نیکیاں ہمارے کام آئیں گی اور مرنے کے بعد نیکی کرنے کا کوئی موقع ہمارے پاس نہ ہوگا اور لہٰذا بہتر ہے کہ ہم اس دنیا میں ہی وافر نیکیوں کا ذخیرہ جمع کر لیں جو محشر میں ہمارے کام آئے۔

شعر نمبر۴: سمندِ عمر کو اللہ رے شوقِ آسائش — عنان گستہ و بے اختیار راہ میں ہے

تشریح: عمر اور زندگی کا گھوڑا اس قدر آرام پسند ہے کہ اس نے سفر کے دوران لگام اور باگ تمام کی ہر شے سے تعلق منقطع کیا ہوا ہے۔ آتش ان علامتوں کے ذریعے صرف یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی پر ہمارا کوئی اختیار نہیں اور ہماری زندگی کی مثال ایسے گھوڑے کی ہے جس کا جہاں تک جی چاہے سفر کرے اور جہاں جی چاہے رُک جائے اور ہماری موت واقع ہو جائے۔ مرزا غالب نے بھی مضمون انہی علامتوں کے ساتھ ذرا وضاحت سے پیش کیا ہے۔

؎ رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

انسان کی اِسی بے بسی کا نقشہ محمد حسین آزاد نے ذرا مختلف استعاروں میں پیش کیا ہے۔

؎ جہازِ عمرِ رواں پر سوار جاتے ہیں — سوارِ خاک میں بے اختیار جاتے ہیں

شعر نمبر۵: نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے — فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

تشریح: خواجہ آتش کہتے ہیں کہ زندگی کے سفر میں نہ تو کوئی رہنما ہمارے ساتھ ہے اور نہ کوئی ساتھی کہ ہمیں راستے کے نشیب و فراز سمجھائے اور نیک و بد سے آگاہ کرے اور یوں ہمارے لئے مشکلات پیدا ہو گئی ہیں لیکن ہم اس بنا پر مطمئن ہیں کہ سفرِ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور عنایت ہمارے ساتھ ہے اور اس کی موجودگی میں کسی رہنما اور ساتھی کی حاجت نہیں رہتی اور انسان بے پرواہ ہو کر اپنی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے اور نہایت کامیابی سے اپنا سفر طے کر لیتا ہے۔

شعر نمبر۶: تلاشِ یار میں کیا ڈھونڈیئے کسی کا ساتھ — ہمارا سایہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے

تشریح: آتش کہتے ہیں لوگ سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کو بھی اپنے سفر میں شریک کر لیں تاکہ مل جل کر سفر کی مشکلات پر قابو پایا جا سکے۔ لیکن چونکہ ہم کسی عام سفر کی بجائے محبوب کی تلاش میں نکلے ہیں لہذا ہمیں کوئی ساتھی درکار نہیں، بلکہ اس سفر کے دوران میں تو ہمیں ہمارا سایہ بھی جو ہر وقت ساتھ رہتا ہے، ناگوار اور ناپسند ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ کسی طرح یہ بھی ہم سے جُدا ہو جائے۔ آتش دراصل عشاق کی اس نفسی کیفیت کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ عاشق محبوب سے تنہا ملنا چاہتا ہے اور اس میں کسی کا ساتھ اسے اچھا نہیں لگتا۔

شعر نمبر۷: جنوں میں خاک اُڑاتا ہے ساتھ ساتھ اپنے۔ — شریکِ حال ہمارا غبار راہ میں ہے

تشریح: آتش کہتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک ہم تنہا سفر کر رہے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ساتھ ساتھ راستے کی مٹی بھی اُڑ رہی ہے اور سفر کر

رہی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح ہم دیوانہ وار سفر میں مصروف ہیں بالکل یہی حالت اس غبار کی بھی ہے اور یوں ہم تنہا اور اکیلے نہیں ہیں

شعر نمبر ۸:۔ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

تشریح: آتش کہتے ہیں کہ لوگ اس خوف سے سفر پر نہیں نکلتے کہ راستے میں کوئی اُن کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنے والا نہیں جبکہ ہزار ہا مشکلات پیش آنے والی ہیں جن سے تنہا عہدہ برآ ہونا مشکل ہوگا۔ آتش کہتے ہیں کہ انسان کو یہ نہیں سوچنا چاہیے بلکہ بے خوف و خطر سفر پر نکلنا چاہیئے اس لئے کہ اگر راستے میں اور کوئی نہ بھی ہوا تو بھی مسافروں پر مہربانی کرنے والے ہزار ہا سایہ دار اور گھنی چھاؤں رکھنے والے درخت موجود ہیں جو انسان کو آرام و سکون پہنچاتے اور کوفتِ سفر کو کم کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ شعر حاصلِ غزل ہے۔

شعر نمبر ۹:۔ کوئی تو دوش سے بار سفر اتارے گا ہزار راہ زن امیدوار راہ میں ہے

تشریح: آتش کہتے ہیں کہ لوگوں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ اُن کے کندھوں پر جو بوجھ ہے اُسے کون اتارے گا اور کون انھیں سکون کا سانس لینے کا موقع فراہم کرے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی فکر نہیں اس لئے کہ راستے میں ہزاروں ڈاکو اور لیٹرے موجود ہیں اگر کسی ساتھی نے مساعدت اور تعاون نہ کیا تو بہر حال یہ لیٹرے تو تنہا پاکر ہمیں اس بوجھ سے نجات دلا ہی دیں گے۔ یعنی اگر کوئی دوست کام نہ آیا تو یہ دشمن مشکل آسان کرنے کا سبب بنیں گے۔

اس مقام پر آتش کے کلام میں غالب کے عمومی رنگ کی جھلک نظر آتی ہے اور آتش کے ہاں بھی یہ انداز ملتا ہے کہ وہ ناخوشگوار باتوں سے بھی خوشگوار پہلو نکال لیں۔

شعر نمبر ۱۰:۔ مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہیں

تشریح: بے شک ہزاروں دشمن راستے میں ہیں اور وہ انتظار کر رہے ہیں کہ کب ہم اپنا سفر شروع کریں اور وہ ہمیں لوٹیں لیکن فکر کی کوئی بات نہیں جب ہم اپنا سفر شروع کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی بھی شاملِ حال ہوگی اور اسی مہربانی کے سہارے بالآخر ہم اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے اِس شعر کو قرآن پاک میں مذکور اس واقعہ کے پس منظر میں سمجھنا اور دیکھنا چاہیے کہ راندۂ درگاہ ہونے کے بعد شیطان نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعویٰ کیا کہ میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا اور ایک ایک منزل پر اُن کے لئے ایسے حالات پیدا کروں گا کہ وہ تجھ سے باغی ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو اس کی اجازت دی اور فرمایا کہ بے شک تیرے ایسا کرنے کے باوجود وہ لوگ جو میرے بندے ہوں گے گمراہ نہ ہوں گے اس لئے کہ میری مہربانی اُن کے شاملِ حال ہوگی۔

شعر نمبر ۱۱۔ تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش　　　گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

تشریح: آتش مقطع میں کہتے ہیں کہ بالفرض سفر کرتے کرتے آپ کے پاؤں تھک گئے تو بھی آپ رکئے نہیں اس لئے کہ جس قدر آپ رکیں گے اتنا ہی اپنی منزل سے دور رہیں گے۔ اس لئے اگر پاؤں تھک جائیں اور آپ کو سر کے بل چلنا پڑے تو بھی اپنا سفر جاری رکھیئے کہ راستہ بہرحال کانٹوں سے بھرا ہوا ہے جہاں آرام ممکن نہیں اور منزل پر مقصود و محبوب ملنے والا ہے جس کے ملتے ہی تمام تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ سر کے بل چلنا محاورۃً بھی استعمال ہوا ہے یعنی پاؤں تھکیں تو بھی رکنے کی بجائے دیوانہ وار سفر کرتے رہنا چاہیے۔

امام بخش ناسخ

حل لغات: مشرق۔ سورج نکلنے کا مقام؛ طاؤس۔ مور؛ مار۔ سانپ۔ خورشید رُو۔ سورج جیسے چہرے والا، محبوب؛ صبح صادق۔ رات کے وقت صبح کا وہ وقت جب سورج طلوع نہ ہوا ہو لیکن مشرقی سمت میں روشنی پھیل جائے؛ ابرِ باراں۔ بارش برسانے والے بادل؛ روئے خنداں۔ ہنستا ہوا چہرہ؛ پری رُو۔ پری جیسے چہرے والا مراد محبوب؛ تابوت۔ وہ صندوق جس میں مردے کی لاش رکھتے ہیں؛ تختِ سلیمانی۔ حضرت سلیمانؑ ایک بہت بڑے پیغمبر اور بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ قرآن میں ہے کہ اُن کی حکومت انسانوں کے علاوہ جنات اور حیوانات پر بھی تھی اس کے علاوہ عناصرِ اربعہ بھی اُن کی عملداری میں تھے۔ تختِ سلیمان سے مراد اُن کی حکومت اور اختیار ہے۔ معمور۔ بھرا ہوا؛ رخنہ۔ دراڑ۔ خلل، روزن؛ تہ۔ نیچے؛ بشاش۔ خوش و خرم، مسرور؛ دہان۔ منہ؛

شعر نمبر ۱۔ مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا　　　طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

تشریح: میرے سینے پر محبوب کے ہجر و فراق کی سختیاں جھیلنے کے باعث بے شمار داغ پڑ گئے ہیں اور ہر داغ اس قدر روشن ہے کہ اگر اسے دیکھیئے تو معلوم ہو گا کہ میرا سینہ نہیں بلکہ وہ مقام ہے جہاں سے سورج نکلتا ہے یعنی صبح کے وقت جس طرح مشرقی سمت روشن و پُرنور ہوتی ہے یہی کیفیت میرے سینے کی ہے۔ اسی طرح میرا گریباں چاکوں کی وجہ سے چونکہ تار تار ہو گیا ہے لہٰذا یہ قیامت کی صبح کا منظر پیش کر رہا ہے۔

شعر نمبر ۲۔ ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں　　　دلِ پُرداغ کو کیوں کر ہے عشق اس زلفِ پیچاں کا

تشریح: ناسخ اپنے دل کو داغوں کی وجہ سے مور اور محبوب کی زلفوں کو سانپ سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے تب سے مور اور سانپ میں دشمنی کا تعلق ہے اور ان میں کبھی دوستی کا رشتہ نہیں رہا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میرا دل جو مثل مور کے ہے وہ محبوب کی زلف جو سانپ کی طرح ہے اسے عشق رکھتا ہے۔ ناسخ اس بات پر حیران ہیں کہ آخر اس رشتے کی معنویت میں اتنا تغیر کیوں آگیا اور قدیم دشمنی دوستی میں کیسے بدل گئی۔

شعر نمبر ۳: کسی خورشید رو کو جذب دل نے آج کھینچا ہے ۔ کہ نور صبح صادق ہے، غبار اپنے بیاباں کا

تشریح: میرے دل کی کشش نے میرے خورشید جیسا چہرہ رکھنے والے محبوب کو آنے پر مجبور کر دیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ صحرا کا غبار بھی جو اپنی فطرت کے اعتبار سے تاریک ہوتا ہے، صبح صادق کا منظر پیش کر رہا ہے اور روشن ہوگیا ہے۔

ناسخ نے اس شعر میں انسانی مشاہدے میں آنے والی ایک چیز سے فائدہ اٹھایا ہے اور وہ یہ کہ مٹی کے اڑتے ہوتے ذرات اگر سورج کی کرنوں کے سامنے آجائیں تو وہ بھی روشن ہو کر نمایاں ہو جاتے ہیں اور بالکل اسی طرح محبوب کے آنے سے بیابان کے ریت کے ذرات روشن ہوگئے ہیں۔ البتہ شاعر نے محبوب کے چہرے کو حقیقی معنوں میں سورج فرض کر لیا ہے اور یہ انتہائی مبالغہ ہے۔

شعر نمبر ۴: چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابر باراں میں ۔ تصور چاہیے رونے میں اسکے روتے خنداں کا

تشریح: ناسخ کہتے ہیں کہ آپ نے دیکھا ہوگا جب بارش ہوتی ہے اور بادل برستا ہے تو ساتھ ہی ساتھ بجلی بھی چمکتی ہے، لہٰذا اگر میں رو رہا ہوں تو پھر مجھے محبوب کے ہنستے مسکراتے چہرے کا تصور کرنا چاہیے۔ شاعر نے اپنے رونے کو بادل کے برسنے اور محبوب کے ہنسنے کو بجلی کی چمک سے تشبیہ دے کر مضمون آفرینی کی ہے۔

شعر نمبر ۵: دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے ۔ گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

تشریح: ناسخ کہتے ہیں کہ میرے فوت ہونے کے بعد میری لاش کو صندوق کے تختوں پر رکھا گیا اور مجھے دفن کرنے کے لئے لے جایا گیا۔ عام طور پر یہ صورت کچھ اچھی اور باعثِ فخر نہیں ہوتی لیکن میرے لئے یہ صورتِ حال اس وجہ سے بہترین ہو گئی کہ میرے پری جیسا چہرہ رکھنے والے محبوب نے بھی میرے جنازے کو کندھا دیا اور یہ ایسا اعزاز ہے جس کی بناء پر مجھے اپنا تابوت بھی حضرت سلیمانؑ کے تخت جیسا نظر آنے لگا۔ یعنی گو میں فنا کے گھاٹ میں اتر رہا تھا لیکن محبوب کے کندھا دینے کے باعث خود کو حضرت سلیمانؑ جیسا صاحبِ اختیار سمجھ رہا تھا۔

اس شعر میں تخت اور تختہ میں لفظی رعایت ہے اس کے علاوہ محبوب کو پری رو کہہ کر تختِ سلیماں اور جنازے کے بعد کندھا دینا اور تابوت کے ذکر نے رعایتیں پیدا کی ہیں۔

شعر نمبر۶:۔ مرا ویرانہ مثلِ آئینہ معمورِ حیرت ہے   یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشمِ حیران کا

تشریح: شعراء آئینے کو حیران قرار دیتے ہیں اس لئے کہ وہ سب کچھ دیکھتا ہے اور حیرت زدہ شخص کی طرح ساکت و صامت رہتا ہے یہاں تک کہ اپنی پسند و ناپسند تک کا اظہار نہیں کرتا۔ ناسخ نے کہا کہ جس طرح آئینہ حیرتوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے یعنی انتہائی حیران ہوتا ہے بالکل یہی کیفیت میرے ویران و تباہ حال گھر کی ہے۔ یہاں تک کہ میرے گھر کی دیواروں میں جو روزن اور رخنے ہیں اگر اُن کو دیکھا جائے تو وہ بھی حیرت زدہ آنکھ نظر آتے ہیں۔

شعر نمبر۷:۔ کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا   نہ الجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا

تشریح: اس دنیا میں، جسے ناسخ نے وحشت سرا کہا ہے، اسکے بارے میں کہتے ہیں کہ مجھے کسی چیز سے محبت نہ ہوئی اور میں نے کسی سے کوئی تعلق پیدا کیا۔ یہاں تک کہ عام طور پر بیابان اور کانٹے کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن میرے بیابان اور ویرانے میں کبھی کوئی کانٹا تک بھی نہیں اُگ سکا کہ بہر حال یہ کانٹوں ہی سے سہی لیکن ایک تعلق کو ثابت کیا جا سکتا تھا۔ گویا اچھی چیزیں تو درکنار میں نے بُری چیزوں سے بھی کوئی رشتہ نہیں رکھا۔ شاعر نے اس دنیا کو وحشت سرا یعنی ایسی جگہ قرار دیا ہے جہاں انسان گھبراہٹ کا شکار ہو اور اُس کے دل کو چین و آرام میسر نہ آئے اور واقعہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے روح کو انسانی جسم میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا تو روح نے وحشت زدہ ہو کر جسم میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور جب مختصر و محدود مدت کے لئے داخل بھی ہوئی تو وہ اس قید سے ناخوش ہے اور جلد نکل بھاگنا چاہتی ہے جس سے اس دنیا کو وحشت سرا قرار دینے کا قرینہ بنتا ہے۔

شعر نمبر۸:۔ تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ   کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

تشریح: کسی کی گردن پر تلوار رکھی جائے تو وہ خوش و خرم نہیں ہو سکتا بلکہ وہ انتہائی آزردہ ہوگا لیکن مجھے دیکھئے جب قاتل یعنی محبوب نے میری گردن پر تلوار رکھی اور مجھے ذبح کرنا چاہا تو میں ناخوش ہونے کی بجائے انتہائی خوش و خرم اور بشاش و بشاش تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ذبح ہوتے وقت میرے جسم پر جس قدر زخم لگے اُن کے منہ مسکراتے ہوئے چہرے کا تصور پیش کر رہے ہیں اور یہی میرے بشاش ہونے کا ثبوت ہے۔

محمد ابراہیم ذوق

غزل نمبر ۱

حل لغات اصلا۔ بالکل، ہرگز، کبھی ؛ رشک۔ غیرت ؛ مسیحا۔ حضرت عیسیٰ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو مردوں کو زندہ اور بیماروں کو اچھا کر دیتے تھے اور حسین وخوبصورت لوگ بھی شعرا اور کے نزدیک یہی خصوصیت رکھتے ہیں لیکن اس کے مجازی معنی محبوب کے ہیں ؛ مذکور۔ ذکر ؛ تا۔ تا وقتیکہ، جب تک ؛ جی سے جانا۔ مرنا ؛ کوئی دم۔ بہت تھوڑے وقت کے لئے استعمال کرتے ہیں ؛ دَم۔ سانس ؛ صیاد۔ شکار کرنے والا ؛ دام۔ جال، فریب، دھوکا ؛ لٹک۔ جنون و دیوانگی، عشق و محبت ؛ ٹشکا۔ جادو، کسی کو اپنے ساتھ اُلجھا لینے کا منتر، فریب، چالاکی، داؤں ؛ ہستی۔ زندگی ؛ عدم۔ موت ؛ طاق۔ یکتا، ہوشیار، چالاک، ماہر ؛

شعر نمبر ۱: جیتا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا　　　گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا

تشریح اگر آج بھی ہمارا محبوب نہیں آتا اور ہمیں جدائی کی رات گزارنا پڑتی ہے تو پھر ہمیں اپنی زندگی کی کوئی امید نہیں اور ہم یقیناً مر جائیں گے۔ شاعر نے محبوب کو رشک مسیحا اسلئے کہا کہ جس طرح حضرت عیسیٰ بیماروں کو اچھا کر دیتے تھے اور اُن کے حکم سے مُردے زندہ ہو جاتے تھے شاعر کے نزدیک یہی خصوصیت محبوب میں بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے آنے میں زندگی اور نہ آنے میں موت پوشیدہ بتائی گئی ہے۔

شعر نمبر ۲: مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا　　　پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

تشریح شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کی محفل میں ہر طرح کا اور ہر شخص کا ذکر ہوتا ہے لیکن ہم ایسے بد نصیب ہیں کسی بھی صورت میں تیری بزم میں ہمارا ذکر نہیں آتا۔ یعنی اے محبوب تو ہم سے ذرا سا بھی تعلق نہیں رکھتا اور کبھی یاد نہیں کرتا ورنہ تیری محفل میں کبھی نہ کبھی تو ہمارا ذکر ضرور آتا۔

شعر نمبر ۳: آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے　　　جب تک اُسے غصہ نہیں آتا نہیں آتا

تشریح ذوقؔ کہتے ہیں کہ ہمارے محبوب کو ناراض وخفا نہ کرو اس لئے کہ عام حالات میں اُسے غصہ نہیں آتا اور وہ بہت جلدی سے آزردہ نہیں ہوتا لیکن اگر وہ کسی سے ناراض ہو جائے اور اسے غصہ آجائے تو پھر یہ غصہ آسانی سے فرو نہیں ہوتا اور کسی نہ کسی کی جان چلی جاتی ہے اور کوئی نہ کوئی موت کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔

شعر نمبر ۴: ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں　　　شبنم کی طرح ہمیں رونا نہیں آتا

تشریح لوگ روتے ہیں اور تھوڑے بہت آنسو بہا کر چپ ہو رہتے ہیں لیکن ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے اس لئے کہ ہمیں شبنم کی طرح دو چار قطرے آنسوؤں کے بہانا پسند نہیں۔ ہاں البتہ اگر ہم کبھی روتیں تو پھر اس قدر اشک بہاتے ہیں کہ آنسوؤں کے دریا بہہ جاتے ہیں۔

شعر نمبر ۵: آنا ہے تو آ جا کہ کوئی دم کی ہے فرصت — پھر دیکھیئے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

تشریح ذوقؔ کہتے ہیں کہ اے محبوب، اب تو خواہ بہت معمولی وقت کے لئے سہی لیکن فرصت مہیا ہے لہذا اگر تو آنا چاہتا ہے تو جلد آ اور ہم پر اپنے لطف و عنایات کی بارش کر۔ مستقبل کا حال کسے معلوم اور زندگی کی کسے خبر! عین ممکن ہے کہ تُو اپنا آنا مستقبل پر اٹھا رکھے لیکن ہمیں تو اگلے لمحے اور سانس کی بھی توقع نہیں اور یہ اُمید نہیں کہ اگلا سانس بھی لے سکیں گے یا اُس سے پہلے ہی فوت ہو جائیں گے۔ لہذا بہتر ہے کہ تو وقت ضائع کئے بغیر جلد سے جلد چلا آ۔

شعر نمبر ۶: غافل ہے بہار چمنِ عمر جوانی — کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا

تشریح اے غفلت برتنے والے محبوب! جوانی انسانی عمر کا ایسا حصہ ہے جیسا کہ چمن پر بہار کی کیفیت ہوتی ہے لہذا اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ بہار پر بھی جوانی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ بہار ہر سال آجاتی ہے لیکن جوانی ایک دفعہ جا کر پھر واپس نہیں آتی۔ لہذا جس قدر ممکن ہو اس سے لطف اُٹھانا چاہیے۔ بہار کی رعایت سے شاعر نے جوانی کے دور کو بھی موسم کہہ کر پکارا اور چمن و بہار کی رعایت سے سیر کا لفظ باندھا۔

شعر نمبر ۷: دنیا وہ ہے صیاد کہ سب دام میں اس کے — آجاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

تشریح دنیا کی مثال ایک شکاری کی ہے جو لوگوں کو دھوکا اور فریب دے کر گرفتار کرتی اور انھیں اُن کی اصل منزل سے بھٹکا دیتی ہے۔ انسان اس کے فریب میں آکر خدا کو بھول جاتا ہے اور اپنے فرضِ حقیقی کو فراموش کر بیٹھتا ہے اور پھر یہ چالاک بھی ایسی ہے کہ دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی طرح اس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ عقلمند اور دانا ہیں اور اپنے نیک و بد کو بخوبی سمجھتے ہیں وہ دنیا کے فریب میں نہیں آتے۔ یعنی ذوقؔ کے نزدیک، دنیا کی تمام تر کشش اور رعنائی کے باوجود اللہ کے برگزیدہ بندے اِس کے جال میں نہیں پھنستے۔

شعر نمبر ۸: جاتی رہے زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے — افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا

تشریح ذوقؔ کہتے ہیں کہ ہمارا دل محبوب کی زلفوں میں اٹکا ہوا ہے اور ہم ان زلفوں کی محبت میں گرفتار ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس محبت کو ترک کر دیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایسی چالاکی اور جادو نہیں آتا جس کی وجہ سے زلفوں سے ہماری رہائی ممکن ہو سکے گویا ذوقؔ کے نزدیک، ترکِ عشق ناممکن ہے۔ جیسا کہ حالیؔ نے بھی کہا ہے۔

ے ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

شعر نمبر ۹: ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں — جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

تشریح: اصول فطرت ہے کہ انسان مرنے کے بعد نہ تو دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے اور نہ واپس اس دنیا میں آ سکتا ہے۔ اس سے ذوقؔ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شاید آخرت میں انسان کے لئے آرام و اطمینان کی دولت وافر مقدار میں موجود ہے جبکہ اس دنیا میں اُس کے لئے غم ہی غم ہیں۔ لہٰذا جو آدمی مر جاتے ہیں وہ وہاں کے آرام و آسائش کو ترک کر کے دوبارہ دنیا کے جنجال میں پھنسنا قبول نہیں کرتے۔ یوں بھی انسانی فطرت ہے کہ انسان وہیں رہنا پسند کرتا ہے جہاں اُسے آرام و آسائش کا سامان مہیا ہو اور وہاں سے بھاگتا ہے جہاں اُس کے لئے دُکھ اور مصائب ہوں۔ بہر حال یہ شعر حسن تعلیل کی اچھی مثال ہے۔

شعر نمبر ۱۰: قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ — سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

تشریح: باعزت زندگی کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں اوّل یہ کہ انسان کسی فن میں ماہر ہو تاکہ اُس کی وجہ سے عزت و آرام پا سکے دوم یہ کہ اُس کی تقدیر اچھی ہو بصورت دیگر یہی فن اُس کے لئے مصیبت بھی بن سکتا ہے۔ ذوقؔ کہتے ہیں کہ میں ہر فن میں طاق و ماہر ہوں، دنیا کا کونسا کام ہے جو مجھے نہیں آتا لیکن میں اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور ہوں، بدنصیبی کے باعث کسی بھی کام کا حسبِ خواہش نتیجہ نہیں نکلتا اور میں ذلیل و خوار رہتا ہوں۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات: دور۔ چال، روش۔ چکر، رفتار، حکومت، پھیلاؤ، انقلاب، زمانہ؛ کشتی دخانی۔ ایسی کشتی جو دھویں اور بھاپ کے زور سے چلے؛ رکاؤ۔ رکاوٹ، روک، توقف؛ روانی۔ بہاؤ، تیزی؛ فساد۔ خرابی، بگاڑ؛ خضاب۔ سفید بالوں کو سیاہ کرنے کے لئے لگائی جانے والی مہندی؛ مو۔ بال؛ خضر۔ ایک پیغمبر جن کی عمر بہت طویل ہے اور جنہیں فنا نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام تر شادابی انہی کے دم قدم سے ہے۔ وہ سفر میں اور صحراؤں میں رہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ انہوں نے آبِ حیات پیا ہے؛ آبِ بقا۔ آبِ حیات، وہ پانی جسے پینے کے بعد موت نہ آئے؛ تہمت۔ الزام، بہتان؛ گریہ۔ رونا۔ آہ و زاری؛ پانی میں آگ لگنا۔ چغلی کھانا۔ دوستوں کو لڑانا؛ کھوج۔ تلاش؛ وار۔ مثل، مانند؛

شعر نمبر ۱: گزرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں — کہ جیسے جاتے کوئی کشتیٔ دخانی میں

تشریح: شیخ ابراہیم ذوقؔ کہتے ہیں کہ آسمان کی گردش اور پھیلاؤ میں میری عمر اس طرح گزر رہی ہے

جیسے سمندر یا دریا میں بھاپ کے زور سے چلنے والی کشتی تیرتی ہے ۔ مراد یہ ہے کہ میری عمر بہت تیزی سے گزر رہی ہے اور دنیا میں رہنے کی جو فرصت ہے وہ بہت کم ہے ۔ زندگی کو کشتی اور جہاز کے استعارات سے اور بہت سے شعراء نے بھی واضح کیا ہے مثلاً

جہازِ عمر رواں پر سوار جاتے ہیں — سوار خاک میں بے اختیار جاتے ہیں

شعر نمبر ۲: رکاوٹ خوب نہیں طبع کی روانی میں — کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

تشریح: فطرت، مزاج یا شعر کہنے کی صلاحیت میں رکاوٹ نہیں پڑنا چاہیئے اس لئے کہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اگر پانی کسی جوہڑ یا تالاب میں رک جائے اور کچھ عرصے کے لئے اُسے بہنے کا رستہ نہ ملے تو یہ بے رنگ و بو پانی بدبودار ہو جاتا ہے اور اس کی فطرت میں بگاڑ آ جاتا ہے ۔ لہٰذا اگر طبیعت رُکے تو اس میں بھی بگاڑ اور خرابی پیدا ہو جائے گی ۔

شعر نمبر ۳: نہیں خضاب سے مطلب مگر یہ موئے سفید — سیاہ پوش ہوئے ماتم جوانی میں

تشریح: شاعر نے اپنے سفید بالوں کو سیاہ کرنے کے لئے خضاب لگایا اور بال سیاہ ہو گئے اسکے جواز میں وہ یہ کہتا ہے کہ میرے بالوں کی سیاہی کا خضاب سے کوئی تعلق نہیں ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میری جوانی ختم ہو گئی اور یہ بال جوانی کے ماتم میں سیاہ ہو گئے ۔ ہماری معاشرت میں ماتم اور سوگ کے دنوں میں لوگ سیاہ کپڑے پہن لیتے ہیں اور اسی سے اُن کے ماتمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ شعر حسنِ تعلیل کی اچھی مثال ہے ۔

شعر نمبر ۴: کہانیاں ہیں حکایات خضر و آبِ بقا — بقا کا ذکر ہی کیا اس جہانِ فانی میں

تشریح: ذوقؔ کہتے ہیں کہ دنیا میں یہ مشہور ہے کہ خضرؑ کو موت نہیں آئے گی اور وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے ۔ اسی طرح جو شخص آبِ حیات پی لے گا، اُسے بھی ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی مل جائے گی لیکن میرے نزدیک یہ حرف کہانیاں ہیں اور ان میں ذرّہ بھر بھی حقیقت نہیں ۔ اس لئے کہ ساری دنیا ہی فنا ہونے والی ہے ۔ اسی بناء پر اسے جہانِ فانی کہا جاتا ہے ۔ پھر بھلا جو دنیا ہی ختم ہونے والی ہو اس میں ہمیشگی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی کا کیا تصور ہو سکتا ہے ۔

شعر نمبر ۵: لگاتے تہمت گریہ ہیں دل جلوں کو ترے — یہ لوگ وہ ہیں لگاتے ہیں آگ پانی میں

تشریح: کسی نے محبوب کے پاس یہ شکایت کی کہ تیرے عشاق تیرے فراق میں روتے اور آنسو بہاتے ہیں اور اس طرح تیری رسوائی ہوتی ہے ۔ چنانچہ محبوب ناراض ہو گیا ۔ عاشق اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جناب ۔ ہم نے ہجر و فراق کی سختیوں پر کسی طرح کی کوئی شکایت نہیں کی اور نہ تیری بدنامی کا سبب بنے ۔ جو لوگ ہم پر یہ الزام و بہتان تراشتے ہیں دراصل وہ پانی میں آگ لگا رہے ہیں یعنی ایک ایسا کام کر رہے ہیں جس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا یا یہ کہ یہ لوگ

ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا رہے ہیں اور اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ محض چغلی کھا کر دوستوں میں جھگڑا کرانے کا باعث بن رہے ہیں۔

شعر نمبر ۶:- وہ اپنے گھر کو سدھارے اور انکی کھوج میں ہم - پھرے بھٹکتے ہوئے کوئے بدگمانی میں

تشریح اس شعر میں ذوقؔ نے عاشق کی نفسی کیفیت کی بھرپور تصویر کھینچی ہے اور ان اندیشوں اور بدگمانیوں کا نقشہ کھینچا ہے جو عاشق کو محبوب کے بارے میں ہو سکتی ہیں۔ ذوقؔ کہتے ہیں کہ محبوب تو اپنے گھر چلا گیا لیکن بدگمان عاشق محبوب کی تلاش میں جگہ جگہ پھرتا رہا۔ اس لئے کہ اُسے اندیشہ تھا کہ محبوب کہیں کسی رقیب کے گھر نہ چلا گیا ہو۔ غالبؔ نے یہی کیفیت زیادہ پر لطف انداز میں پیش کی ہے۔

~ تو اور آرائشِ خمِ کاکل : میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

شعر نمبر ۷:- ہمیشہ ہے مجھے سرمایۂ فنا میں بقا حباب وار ہوں میں آبِ زندگانی میں

تشریح ذوقؔ کہتے ہیں کہ جس طرح ایک بلبلے کی زندگی اِس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ وجود پائے اور پھر فنا ہو جائے تاکہ پھر نئے سرے سے وجود پا سکے۔ بالکل یہی حالت میری ہے۔ میں بھی زندگی کے سمندر میں بلبلے کی مانند ہوں اور اگر میں فنا ہوتا ہوں تو اس لئے کہ مجھے پھر وجود میں آنا ہے۔ اقبالؔ نے یہی مضمون ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

~ آہ غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنت نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا!

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

سوانحی حالات

مرزا اسد اللہ نام تھا۔ پہلے اسدؔ اور بعد میں غالبؔ تخلص کیا۔ نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ خطابات تھے۔ غالب ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خان تھا۔ خاندانی سلسلہ ایبک ترکمانوں سے ملتا تھا۔ اسی لئے غالبؔ کو اپنی خداداد قابلیت اور صلاحیتوں کے علاوہ اپنی عالی نسبی پر بھی بڑا ناز تھا۔ ان کے والد سپاہی پیشہ تھے۔ پانچ برس کی عمر میں ہی غالبؔ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے تو اُن کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے اُن کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ لیکن اُن کا بھی ایک جنگ میں انتقال ہو گیا تو غالبؔ اپنے ننھیال منتقل ہو گئے۔ وہ لوگ خاصے خوش حال تھے اس طرح غالب کی ابتدائی زندگی خاصی خوش الحالی اور عیش وعشرت میں گزری۔ تعلیم وتربیت کے لئے مولوی معظم علی، نظیر اکبرآبادی اور ملّا عبدالصمد پارسی سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی دوران محض تیرہ برس کی عمر میں غالبؔ کی شادی دہلی کے معروف شاعر مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی اور یوں دہلی آمد ورفت شروع ہوگئی۔ دہلی میں شادی ہونے کی رعایت سے مرزا نوشہ کے عرف سے مشہور ہوئے۔ غالبؔ کا کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ گزر اوقات خاندانی پنشن ساڑھے سات سو روپے سالانہ پر تھی جو ۱۸۳۰ء میں بند ہوگئی۔ اپنی پنشن کی بحالی کے لئے غالب نے کلکتہ کا سفر کیا اور ملکہ برطانیہ کو اپیل ارسال کی مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ عرصے کے لئے تاجدارِ اودھ نواب واجد علی شاہ کی طرف سے پانچ سو روپے سالانہ وظیفہ ملتا ہو۔ مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کی طرف سے تاریخِ خاندانِ تیموریہ لکھنے کے لئے پچاس روپے ماہوار مقرر ہوئے۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد بادشاہ کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد غالبؔ کو بھی مصائب کا سامنا کرنا پڑا مگر بے گناہ ثابت ہونے پر پنشن بحال ہوگئی۔ اس کے علاوہ نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کی طرف سے بھی سو روپے ماہوار وظیفہ زندگی بھر ملتا رہا۔ مگر اپنے شاہانہ اخراجات کے سبب ساری زندگی مالی پریشانیوں سے دوچار رہے اور زندگی کرایے کے مکان میں گزری۔
غالبؔ کی ذاتی بدنصیبی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُن کے کئی اولادیں فوت ہوئیں لہٰذا انہوں نے اپنی بیوی کے بھتیجے عارف کو اپنا متبنیٰ بنایا مگر وہ بھی جوانی میں ہی فوت ہو گیا۔ غالبؔ کی حوصلہ مندی کی داد دینا پڑتی ہے کہ زندگی بھر مالی مشکلات اور ذاتی زندگی کے رنج والم کے باوجود انہوں نے خوش طبعی نہ چھوڑی اور ہر صدمے کو بڑے حوصلے اور زندہ دلی سے برداشت کیا۔ آخری عمر میں کئی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ بصارت کے بعد سماعت سے بھی محروم ہونا پڑا۔ آخر کار ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء

کو اس یگانۂ روزگار ہستی نے اس دنیا سے رحلت فرمائی اور درگاہ سلطان نظام الدین میں اپنے خسر کے مزار کے پاس مدفون ہوئے۔

تصانیف غالب نے درج ذیل تصانیف یادگار چھوڑیں ہیں۔

(i) دیوان اردو (ii) دیوانِ فارسی (iii) اردوئے معلیٰ (خطوط)
(iv) عودِ ہندی (خطوط) (v) غالب نامہ (vi) قاطع برہان (vii) مہر نیم روز (viii) تاریخ مغلیہ
(ix) دستنبو (x) سبد چین (xi) تیغ تیز (xii) قادر نامہ (xiii) لطائف غیبی

محاسنِ کلامِ غالب

مرزا غالب اپنی ہمہ گیر شخصیت، منفرد اندازِ فکر، جدت بیاں اور ندرتِ خیال کی وجہ سے اردو کے صفِ اوّل کے شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری پر آج جس قدر مواد ملتا ہے، وہ مشرق میں شاید ہی کسی شاعر یا ادیب پر ہو اور یہ سلسلہ حالی کی یادگارِ غالب سے شروع ہو کر آج تک مختلف کتب، مضامین اور رسالوں کے غالب نمبروں کی صورت میں ادب کی میراث بنتا جا رہا ہے۔
ہر دور کے ناقدین نے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہاں تک کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوان غالب کو "الہامی کتاب" کا درجہ دیا ہے۔ بقول حالی "غالب عام روش سے ہٹ کر چلتے ہیں" اگر غور کیا جائے تو غالب کی شخصیت اور شاعری اسی روش کی بدولت تمام تر اردو شاعری سے ممتاز، منفرد، جدید اور سب سے بڑی بات یہ کہ زندگی سے قریب تر نظر آتی ہے۔

غالب کی مشکل پسندی غالب کو فارسی زبان و ادب پر مکمل عبور تھا اور بہت عرصہ انہوں نے اپنی فارسی شاعری کو ہی اپنے لئے وجہِ افتخار جانا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اولین اردو شاعری فارسی آمیزش، الفاظ و تراکیب کے بکثرت استعمال کی وجہ سے بہت مشکل ہے مگر وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کئے بغیر مرزا بیدل کی پیروی کی خواہش کی تکمیل میں کوشاں رہتے ہیں ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

غالب کی مشکل پسندی کا یہ دور کچھ معاصرین کی مداخلت سے ختم ہوگیا۔ دیوانِ غالب کی پہلی غزل کو غالب کی مشکل پسندی کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

سادگیٔ بیان غالب کی آخری عمر کی بیشتر غزلیں اندازِ بیاں کی سادگی اور جذبے کے خلوص کی وجہ

نے انسانی محسوسات کے بہت قریب ہیں اور اُن کے یہ اشعار سہلِ ممتنع کی صورت اختیار کر گئے ہیں جن کو ہم محسوس تو کر سکتے ہیں مگر اپنے الفاظ میں اُن جذبوں کی صداقت کا اظہار مشکل پاتے ہیں ۔

۱ے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	آخر اس درد کی دوا کیا ہے
۲ے درد منتِ کشِ دوا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا ، بُرا نہ ہوا
۳ے موت کا ایک دن معین ہے	نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
۴ے ابن مریم ہوا کرے کوئی	مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

غالب کی جدت پسندی اور جدتِ ادا

غالب کی غزل میں اردو شاعری کی تمام قدیم روایات سے ہٹ کر ایک نیا احساس، جذبہ اور زندگی کا واضح اور روشن فرق نظر آتا ہے وہ نئے مضامین کو نئے اور اچھوتے انداز سے پیش کرتے ہیں اور اُن کا زندگی کو نئے پہلو سے دیکھنے کا یہ شعور ہی اُن کے کلام میں جدتِ بیاں ، ندرتِ خیال اور عالمگیر سچائی جیسی خوبیاں نمایاں کرتا چلا جاتا ہے اُن کا دیوان جدت پسندی اور جدتِ ادا کی خوبصورت مثالوں سے بھرا پڑا ہے :-

۱ے اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا	ساغرِ جم سے مرا جام سفال اچھا ہے
۲ے کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب	آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
۳ے ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا !	نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا !

معاملاتِ حسن و عشق

غالب نے معاملاتِ حسن و عشق کو اپنے ذاتی تجربے کی روشنی اور جدتِ فکر سے اپنے اشعار کی زینت بنایا ہے ۔۔ کبھی ایک عام آدمی کا تجربہ محسوس ہوتا ہے اور کبھی ایک فلسفی کا اندازِ فکر نظر آتا ہے مگر ہر جگہ ایک خوددار عاشق کی انانیت اور خودداری و خودنمائی کا احساس بھی نمایاں رہتا ہے ۔ جو یقیناً غالب کی جدتِ طبع اور انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے ۔

۱ے عشق پر زور نہیں ، ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۲ے جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

۳ے واں وہ غرور و ناز ، یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں ، بزم میں وہ بلائے کیوں

۴ے بندگی میں بھی وہ آزاد و خودبیں ہیں کہ ہم

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی
اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

غالب کی حقیقت نگاری

غالبؔ کی شاعری میرؔ کی طرح خود سپردگی اور غم کو ہلکا کرنے کی شاعری نہیں بلکہ انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں فطرتِ انسانی کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اُن کا رویہ ہمیشہ تقلید سے گریزاں رہا۔ زندگی کے بہت بڑے نباض ہونے کے ناطے انہوں نے حیات و کائنات کے حقائق اپنے احساس کی بھٹی میں کندن بنا کر پیش کئے ہیں اور زندگی کی اصلیت کے یہ انداز اپنے بیگانے سبھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا!
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ فریب ہے
مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور — رکھ لی میرے خدا نے میری بے کسی کی شرم

لفظی صناعی اور پیکر تراشی

غالبؔ کو الفاظ و تراکیب کے استعمال میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ مضمون کو کچھ اس طرح الفاظ کا پیکر پہنانتے کہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی۔ اسی لفظی صناعی اور مضمون آفرینی کی بدولت انہوں نے اشعار میں وہ پیکر تراشی کی ہے کہ انسان تمام منظر اپنے روبرو پاتا ہے اور بقولِ غالب مصرعہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"، کی تصویر بن جاتا ہے۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو میری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

تصویر کشی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

حیات و کائنات کے مسائل

غالبؔ کی شاعری کا بیشتر حصّہ فکر اور تجربے کی پیداوار ہے وہ زندگی کے ہر عمل کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور ایک بالغ نظر مفکّر کی طرح اس سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ انہوں نے کائنات اور موجوداتِ عالم کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے زندگی، موت اور دین سے متعلق تلخ حقائق انہیں مشاہدۂ حق کی اُس منزل پر لے گئے ہیں جہاں پہنچ کر دنیا کے شب و روز اور ہنگامے اُن کے نزدیک بازیچۂ اطفال میں انجام پانے والے کھیل اور تماشے بن گئے ہیں۔

۱ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ! عالم تمام حلقۂ دامِ فریب ہے!

۲ ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پرتو آفتاب سے ذرّے میں جان ہے

۳ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غالب کی ظرافتِ طبع

مولانا حالیؔ کے بقول "غالبؔ ایک ظریف طبع انسان تھے" ان کی زندگی اگرچہ مصائب و آلام اور ذاتی حرماں نصیبی میں گزری مگر انہوں نے کبھی بھی ان مصائب کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ ایک زندہ دل اور خوش طبع انسان کی طرح ہمیشہ ہر صورتحال کا مقابلہ کیا گویا ان کا ایمان تھا کہ ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

غالبؔ کی اس زندہ دلی اور بذلہ سنج طبیعت میں شوخی و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

؎ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

؎ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا!

؎ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

؎ چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے!

؎ آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اختصار و ایمائیت

ایک نقاد کے بقول "غزل اظہار کا نہیں بلکہ اخفا کا ذریعہ ہے۔ اس میں دل کی بات استعاروں اور کنایوں میں کہی جاتی ہے" غزل کی یہ خوبی غالب کے ہاں بھی بھرپور انداز میں ملتی ہے وہ بڑے سے بڑے مضمون کو رمز و ایما سے کچھ اس اختصار سے ادا کرتے ہیں کہ جتنا سوچیئے لطف شعر بڑھتا جاتا ہے گویا اُن کے ہر لفظ کے گنجینہ میں ایک جہانِ معنی آباد ہوتا ہے جو اہلِ نظر کو مسحور کرتا چلا جاتا ہے۔

؎ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

غزل نمبر ۱

حلِ لغات گلہ ۔ شکوہ ، شکایت ؛ جا ۔ جگہ ، مقام ؛ گہر ۔ موتی ؛ محو ہونا ۔ چھپ جانا ، سما جانا ؛ اضطراب ۔ بے چینی ؛ پاسخ ۔ جواب ؛ مکتوب ۔ خط ؛ ذوقِ خامہ فرسا ۔ ایسا شوق جو لکھنے کی دھن میں مبتلا ہو ؛ دوام ۔ ہمیشگی ؛ کلفت ۔ رنج ، تکلیف ، مصیبت ؛ دماغ ۔ برداشت ، تاب ، طاقت ؛ خندہ ہائے بے جا ۔ بے موقع ہنسی ؛ ہنوز ۔ ابھی تک ؛ محرمی ۔ راز دار ، ہمراز ، روشناس ؛ بنِ مو ۔ بال کا حلقہ ، رونگٹا ؛ چشمِ بینا ۔ دیکھنے والی آنکھ ؛ گریہ ۔ رونا ، آہ و زاری ؛ کارفرما ۔ کام لینے والا ۔ کسی کام کا اصل محرک ؛

شعر نمبر ۱ ۔ گلا ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا   گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

تشریح مطلع میں مرزا غالب کہنا چاہتے ہیں کہ گو سمندر بے حد مضطرب اور بے چین ہوتا ہے لیکن اس کی یہ بے چینی عشق کی بے تابی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔ مثلاً سمندر کا اضطراب ایک موتی میں سما جاتا ہے اور حرکت سے سکون اختیار کر لیتا ہے جبکہ عشق جسے غالب نے شوق کہا ہے دل جیسی وسیع و عریض جگہ کے بارے میں بھی تنگی اور عدم وسعت کی شکایت کرتا نظر آتا ہے یعنی سمندر تو موتی میں سما سکتا ہے لیکن عشق دل میں نہیں سما سکتا اور اُسے یہ مقام بھی اپنے تحرک کے مقابلے میں تنگ نظر آتا ہے ۔

شعر نمبر ۲ ۔ یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب   مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

تشریح اے محبوب میں جو تمہیں بار بار خط لکھتا ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے تمہاری طرف سے خط کے جواب کی توقع ہے ۔ بلکہ یہ بات تو مجھ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ تو خط کا جواب نہیں دیتا ۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر میں خط کیوں لکھتا ہوں ۔ تو اس بارے میں غالب کہتے ہیں کہ دراصل میں خط لکھنے اور تحریر کے شوق میں مبتلا ہوں اور اسی کے مظالم برداشت کر رہا ہوں ۔ یعنی تمہارے نام خط لکھنے کا شوق ہے اور بس ۔ غالب نے یہی مضمون ذرا مختلف انداز میں ایک اور جگہ میں نظم کیا ہے ۔

ے خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو   ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

شعر نمبر ۳ ۔ حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی   دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

تشریح مرزا غالب عیش و مسرت کو فانی اور غم و اندوہ کو دائمی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بہار کے بارے میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی حیثیت محض یہ ہے کہ بہار کو خزاں کے پاؤں کی مہندی قرار دیا جا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ مہندی بہت جلد اتر جاتی ہے ، گویا بہار بھی بہت جلد رخصت ہو جاتی ہے اور پھر دائمی خزاں کا دور دورہ ہوتا ہے ۔ پس اگر انسان کو وقتی طور پر عیش و عشرت

شعر نمبر ۴:۔ غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو   مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

تشریح غالب کہتے ہیں کہ میں محبوب سے بچھڑ گیا جس کے باعث آج کل محبوب کے ہجر و فراق کے غم میں مبتلا ہوں۔ ایسے میں مجھے یہ نہ کہو کہ آؤ باغ کی سیر کو چلیں۔ میرے لئے یہ سیر بجائے خود بموجب تکلیف و پریشانی ہے۔ اس لئے کہ غمِ فرقت کے باعث میں پھولوں کی بے موقع اور بے محل ہنسی برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ شاعر نے پھولوں کے کھلنے کو پھولوں کی ہنسی سے تعبیر کیا ہے۔ سید انشا نے یہی مضمون ذرا مختلف انداز میں نظم کیا ہے۔

؎ نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں، ہم بے زار بیٹھے ہیں

شعر نمبر ۵:۔ ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں   کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

تشریح اگرچہ اب میری حالت یہ ہو گئی ہے کہ میرے جسم کا ایک ایک رونگٹا اور ہر بال کا ایک ایک حلقہ چشمِ بینا کی حیثیت اختیار کر گیا ہے یعنی میں حقیقت کے ادراک کے جملہ اسباب فراہم کر چکا ہوں لیکن ابھی تک حسن سے رازداری، واقفیت اور روشناسی کا کوئی موقع نہیں مل سکا اور میں زندگی کے اس مقصودِ حقیقی کے لئے ترس رہا ہوں۔ یعنی مرزا غالب کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر طرح کی دانائی حاصل کر لینے کے باوجود اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا آسان نہیں۔

شعر نمبر ۶:۔ نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے   میری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

تشریح اے محبوب میں رو رہا ہوں اور تو کہہ رہا ہے کہ میرا رونا اور میری آہ و زاری میرے دل کی حسرت کے مطابق ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں اور تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیے اس لئے کہ میں اپنی دلی حسرت کے مطابق نہیں رو رہا۔ میں جانتا ہوں کہ عام طور پر دریا میں کتنا پانی ہوتا ہے۔ کتنے پانی سے زمینیں سیراب ہوتی ہیں۔ کتنا سمندر میں جا گرتا ہے اور میں محض اکیلا رو رو کر کئی دریا بہا سکتا ہوں۔ یعنی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں اپنی حسرت کے مطابق رونا شروع کر دوں تو میرے آنسوؤں سے کئی دریا بہہ جائیں۔

شعر نمبر ۷:۔ فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد   جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

تشریح انسانی فطرت کا یہ پہلو ہے کہ کسی ایک چیز کو دیکھ کر فوراً کوئی دوسری مماثل چیز یاد آتی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ میں بھی آسمان کو دیکھتا ہوں تو مجھے فوراً اپنا محبوب یاد آ جاتا ہے۔ اس لئے کہ آسمان کے ظلم و ستم ڈھانے کا انداز بھی وہی ہے جو محبوب نے اختیار کر رکھا تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے جیسے آسمان جو ستم ڈھا رہا ہے۔ اس کے پسِ پشت بھی خود محبوب ہی کارفرما ہے۔ واضح ہو کہ ہماری شعری روایت میں آسمان کو تقدیر کا مالک اور ظلم و ستم ڈھانے

والا قرار دیا جاتا ہے۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات تاخیر۔ دیر؛ باعث۔ وجہ، سبب؛ عناں گیر۔ لگام تھامنے والا۔ روکنے والا؛ بے جا۔ بے موقع، بے محل؛ شائبۂ خوبیٔ تقدیر۔ تقدیر کی خوبی کا دخل، خوبی یہاں طنزاً استعمال ہوتا ہے مراد ہے بدنصیبی، بدقسمتی؛ فتراک۔ جال، دام، شکاربند؛ نخچیر۔ شکار؛ وحشی۔ غیر مانوس، بھڑکنے والا، ناتراشیدہ۔ غیر مہذب؛ گرانباری۔ بوجھ، وزن؛ تشنۂ تقدیر۔ بات کرنے کا خواہاں؛ تعزیر۔ سزا؛ آشفتہ سر۔ دیوانہ، پاگل، مجنوں؛ جواں میر۔ جوانی میں فوت ہوجانے والا؛ ریختہ۔ اردو زبان کا قدیم نام؛ استاد۔ ماہر شاعر؛

شعر نمبر ۱: ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تشریح غالب محبوب سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تم نے میرے ہاں آنے کا جو وقت مقرر کیا تھا تم اس کے بعد آئے اور تمہیں دیر ہو گئی۔ یقیناً اس تاخیر کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔ میرے خیال میں وجہ صرف یہ تھی کہ تم جب بھی چلنے کا ارادہ کرتے تھے تو کوئی یعنی غیر یا رقیب تمہیں روک لیتا تھا اور تمہارے گھوڑے کی لگام تھام لیتا تھا۔

گویا مرزا غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم میرے ہاں آنے سے پہلے رقیب کی طرف سے ہو کر آئے ہو اسلئے کہ وہ تمہیں مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔ مزید براں تم اس کے اس حد تک ناز اٹھاتے ہو کہ اب وہ تمہارے معمولات میں بھی دخل دینے لگا ہے اور تم اس کی مرضی کے مطابق چلنے لگے ہو۔

شعر نمبر ۲: تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تشریح اے محبوب میں اپنی سادگی کی وجہ سے اپنی تباہی کا ذمہ دار تمہیں قرار دے رہا ہوں۔ حالانکہ اس معاملے میں تم سے شکایت بے موقع اور بے محل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میری تباہی میں خود میری اپنی قسمت کی خرابی کو بھی دخل تھا اور جب میں ۔۔۔ اپنی قسمت کی خرابی کی وجہ سے تباہ ہوا تو پھر تم سے شکایت کیسی؟۔

شعر نمبر ۳: تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

تشریح اے محبوب ایک مدت سے تو نے مجھے یاد نہیں کیا اور غالباً اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ تو مجھے بھول گیا ہے اور اگر تو مجھے واقعی بھول گیا ہے تو پھر میں تجھے اپنا نشان و پتہ بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تمہارے شکاربند اور دام میں ایک زمانے میں ایک شکار بندھا ہوا تھا اور میں وہی ہوں۔ یعنی تو مجھ پر پہلے بھی ظلم کرتا تھا پھر نجانے کیوں بھول گیا۔

شعر نمبر ۴: جو قید میں ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

تشریح: تیرے عاشق یعنی مجھ پر عشق کے باعث جنون طاری ہوا تو عزیزوں اور چارہ گروں نے اس کے علاج کے لئے مجھے زنجیریں پہنا دیں اور قید کر دیا۔ لیکن اس قید سے میرا جنون اور سودا کم نہ ہوا بلکہ گرفتاری کے عالم میں بھی میں تیری زلفوں کی یاد میں مگن رہا۔ البتہ اس سلسلے میں پہلے جیسی یکسوئی حاصل نہ تھی اس لئے کہ زنجیروں کا بوجھ تکلیف دہ تھا اور بار بار تکلیف کا احساس ہوتا تھا۔

شعر نمبر ۵: بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

تشریح: اے محبوب تو نے مہربانی کی اور مجھے اپنے حسن کا جلوہ دکھایا۔ بے شک تیرے حسن کا جلوہ میرے سامنے ایسے ظاہر ہوا جیسے آسمان پر بجلی کوند جاتی ہے لیکن صرف دیدار سے میری تسلی نہیں ہوئی اس لئے کہ میں تو تم سے گفتگو کرنے اور باتیں کرنے کا متمنی بھی تھا یعنی کاش تم مجھ سے باتیں بھی کرتے اور اس طرح میری آرزو پوری ہوتی۔

شعر نمبر ۶: یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

تشریح: میں نے اپنے محبوب کو یوسف کہہ کر مخاطب کیا اور اس خیال سے کیا کہ یوسفؑ دنیا کے حسین ترین شخص گزرے ہیں۔ لیکن چونکہ محبوب خود کو یوسف سے بھی زیادہ حسین تصور کرتا تھا لہٰذا میں نے محبوب کو یوسف تو کہہ دیا لیکن پھر مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن خیریت یہ ہوئی کہ محبوب نے مجھ سے اس غلطی پر کوئی باز پرس نہ کی ورنہ مجھ سے خطا تو ایسی ہوئی تھی کہ اس پر سزا بھی دی جا سکتی تھی۔

شعر نمبر ۷: دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

تشریح: عاشق عموماً رقیب سے جلتا ہے لیکن مرزا غالب اس تعلق میں بھی عجیب و غریب پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ میں نے رقیب کو دیکھا تو مجھے بے حد اطمینان اور سکون میسر آیا۔ اس لئے کہ وہ بھی محبوب کے فراق میں نالہ و زاری میں مصروف تھا اور اس بات کی دعائیں کر رہا تھا کہ اس کے نالوں میں اثر پیدا ہو جائے تاکہ محبوب اس پر مہربان ہو سکے۔ گویا غالبؔ کے اطمینان کا سبب رقیب کو دیکھنے میں پوشیدہ نہیں بلکہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ بھی فرقت زدہ اور محبوب کی مہربانی کا طالب ہے۔

شعر نمبر ۸: پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

تشریح: غالبؔ کہتے ہیں کہ فرہاد نے پرویز کے کہنے پر کوہ بے ستون کو کاٹا اور اس میں سے نہر نکالی بعض لوگ اسی بناء پر فرہاد کو بدنام کرتے اور اس کی شخصیت و عمل پر تنقید کرتے ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی بھی پیشہ اختیار کر لینا معیوب نہیں ہوتا۔ یعنی اگر فرہاد نے کوہ کنی

اختیار کی تو کچھ بُرا نہ کیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ جو ہم جیسے عاشقوں کی صف میں شامل تھا، عین جوانی کے عالم میں فوت ہو گیا، لہٰذا ہمیں اُس کی عزت اور احترام کرنا چاہیے۔ غالب عموماً مسلماتِ شعری کو توڑتے ہیں اور وہ فرہاد و قیس کی بڑائی کو بھی عام روایت کے برعکس تسلیم نہیں کرتے لیکن اِس شعر میں فرہاد سے متعلق اُن کا رویہ نسبتاً ہمدردانہ ہے۔

شعر نمبر ۹: ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی ‏ ‏ ‏ آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

تشریح: ہم مرنا چاہتے تھے اور مرنے کے لئے بالکل تیار تھے لیکن بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ محبوب ہمارے پاس نہ آیا۔ وہ صرف قریب آنے کی صورت ہی میں اپنی تلوار سے ہمارا کام تمام کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ہمیں قریب آ کر اگر ہمیں اپنی تلوار سے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا تو پھر اُسے دور ہی سے تیر چلا کر ہماری جان لے لینا چاہیے تھی لیکن اُس نے ایسا بھی نہیں کیا! اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں اول یہ کہ وہ ہم پر مہربان ہے اور یہ ممکن نہیں۔ تو پھر دوسری بات ہی ہو سکتی ہے کہ اُس ترکش اور اُس کی کمان میں کوئی تیر ہی نہیں تھا جسے وہ چلاتا اور ہماری جان لیتا۔

شعر نمبر ۱۰: پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ‏ ‏ ‏ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

تشریح: غالب طنز و شوخی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ تو نے فرشتوں کو ہمارے اعمال کا حساب کتاب رکھنے کے لئے مقرر کیا اور قیامت کے دن انہی فرشتوں کے بنائے ہوئے نامۂ اعمال کی بناء پر ہم انسان مستوجب جزا و سزا ہوں گے۔ اور یہ بات درست نہیں ہے اس لئے کہ دنیا میں کسی بھی ملزم کے خلاف فیصلہ کرتے ہوئے اُس کے وکیل کو بھی فیصلے میں شامل رکھا جاتا ہے تاکہ وہ ملزم کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ لیکن ہمارے نامۂ اعمال کے بارے میں یہ صورت نہیں رکھی گئی اور اس کی تیاری کے وقت ہمارا کوئی گواہ معاملے میں شامل نہیں ہوتا اور یوں ہم صرف فرشتوں کی رپورٹ پر پکڑے جاتے ہیں اور سزا پاتے ہیں اور ظاہر ہے یہ صورت مناسب نہیں ہے۔

اس شعر میں اول تو شوخی و ظرافت کا پہلو موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بات یہ بھی ہے کہ فرشتے انسان کی جبلت، اس کے تقاضوں اور اُن مجبوریوں کو نہیں سمجھتے جن کی بناء پر انسان گناہ و ثواب کرتا ہے، لہٰذا وہ انسان کے ساتھ کوئی رعایت بھی نہیں برتتے۔ اگر کوئی انسان گناہ و ثواب کے دفتر بناتا تو یقیناً وہ انسانوں کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے نرمی سے کام لیتا جس سے انسانوں کے سزا سے بچنے کی صورت پیدا ہو سکتی۔

شعر نمبر ۱۱: ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب ‏ ‏ ‏ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

تشریح: اِس شعر میں غالب نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے لیکن اس طرح کہ میر تقی میر کی استادی

اور دنیائے شعر میں بزرگی کا اعتراف بھی موجود ہے غالب اپنے آپکو کہتے ہیں کہ بے شک تم اردو زبان کے بہت بڑے شاعر ہو لیکن تم واحد آدمی نہیں ہو جسے یہ منصب عطا ہوا بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ گزشتہ زمانے میں ایک بہت بڑا شاعر میر تقی میر نامی بھی گذرا ہے۔

غزل نمبر ۳

حلِ لغات خوئے یار۔ محبوب کی عادت، محبوب کے انداز و اطوار۔ التہاب۔ گرمی، حرارت، اشتعال۔ کافر۔ غیر، دشمن، بیگانہ، ملحد۔ خدا کو نہ ماننے والا۔ جہانِ خراب۔ دنیا۔ حساب۔ شمار۔ قاصد۔ نامہ بر، چھٹی رساں، ایلچی۔ دور۔ گردش۔ جام۔ پیالہ۔ ساقی۔ شراب پلانے والا۔ منکر۔ انکار کرنے والا۔ باب۔ متعلق، معاملہ۔ تیوری۔ نظر، چتون، نگاہ، پیشانی۔ تیوری چڑھنا۔ غصہ آنا، ماتھے پر بل پڑنا۔ نقاب۔ پردہ، برقع۔ طرف۔ جانب، پہلو، رُخ، کنارہ، پاس۔ لگاؤ۔ تعلق، نسبت، رشتہ محبت۔ بناؤ۔ آرائشگی، سجاوٹ۔ عتاب۔ غصہ، قہر۔ خس۔ گھاس پھوس۔ شگاف۔ روزن، دراڑ۔ سحر۔ جادو، طلسم۔ سراب۔ ریتلی زمین چاند یا سورج کی چمک کی وجہ سے پانی کا تاثر دیتی ہے، اسی دھوکے کو سراب کہا جاتا ہے۔ روز۔ دن۔

شعر نمبر ۱: ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

تشریح کوئی چیز انسان کے لئے اُسی وقت تک تکلیف دہ ہوتی ہے جب تک انسان اُس کا عادی نہیں ہو جاتا مثلاً ہمالہ کی سردی ہمارے لئے اور ہمالہ کی ترائیوں میں رہنے والوں کے لئے یہاں کی گرمی اسی لئے ناقابلِ برداشت اور تکلیف دہ ہے کہ ہم اس کے عادی نہیں، اسی پس منظر میں غالب کہتے ہیں کہ مجھے دوزخ میں ڈال دیا گیا۔ عام لوگوں کے لئے دوزخ کتنی ہی ناقابلِ برداشت ہو لیکن میرے لئے دوزخ کی آگ ذرا بھی پریشان کن نہیں۔ اس لئے کہ محبوب کی عادات اپنے اشتعال اور جلا ڈالنے کے انداز کے باعث دوزخ کی آگ سے کسی طور بھی کم نہیں اور چونکہ میں محبوب کی گرمیٔ مزاج کا پہلے ہی عادی ہوں لہذا مجھے دوزخ کی آگ سے نہ صرف تکلیف نہیں پہنچ رہی بلکہ اس سے مجھے راحت اور آرام مل رہا ہے اور اس کے لئے میں قسم تک کھانے کے لئے تیار ہوں۔ یہ ہماری عام معاشرتی روایت ہے کہ کسی بات پر زور دینے کے لئے یا زیادہ قابلِ یقین بنانے کے لئے قسم کھائی جاتی ہے۔ غالب بھی کہتے ہیں کہ اگر دوزخ کے عذاب میں مجھے راحت نہ ملتی ہو تو میں کافر ہو جاؤں یعنی ضرور بالضرور راحت ہی ملتی ہے۔

اس شعر میں تلازمات اور شعری صنعتیں بہت ہی خوبصورت بیان ہوئی ہیں۔

شعر نمبر۲:۔ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں　　　شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تشریح اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں اس دنیا میں کب سے ہوں تو میں کوئی جواب نہیں دے سکتا ہوں۔ اس لئے کہ عام حالات میں دنوں کی گنتی کر کے ہفتوں مہینوں اور برسوں کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نے تو عشق میں فرقت کی راتیں بھی گزاری ہیں جن کی طوالت اور درازی کا حساب ناممکن ہے اور اسی بنا پر ہفتوں، مہینوں اور برسوں کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔

مرزا غالب نے اس شعر میں ہجر کی راتوں کی طوالت کا ذکر بالکل نئے انداز میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کو جہانِ خراب کہہ کر اس کے بارے میں اپنی رائے بھی دے دی ہے۔

شعر نمبر۳:۔ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

تشریح میں نے محبوب کے نام خط لکھا اور ایلچی یا نامہ بر یہ خط لے کر چلا گیا۔ عام حالات میں تو مجھے محبوب کے جواب کا انتظار کرنا چاہیے لیکن چونکہ میں جانتا ہوں کہ محبوب میرے خط کا کیا جواب دے گا یعنی وہ یقینی طور پر میری آرزوؤں اور خواہشوں کو ٹھکرا دے گا لہٰذا مجھے جواب کا انتظار کئے بغیر قاصد کی واپسی سے پہلے ہی دوسرا خط لکھ لینا چاہیے تاکہ قاصد آئے اور دوسرا خط لے جائے۔

دوسرے مصرع میں طنز کا پہلو بھی موجود ہے۔ غالب نے کہا کہ میں جانتا ہوں جو محبوب جواب میں لکھے گا یعنی وہ سرے سے جواب ہی نہیں لکھے گا لہٰذا انتظار فضول ہے اور سابقہ مضمون کا ایک اور خط لکھ رکھنا چاہیے۔

شعر نمبر۴:۔ مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام　　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

تشریح عام حالات میں نظر انداز کئے گئے کسی شخص پر نوازشات کا غیر یقینی سلسلہ شروع ہو جائے تو وہ اس پر چونک جائے گا اور خطرہ محسوس کرے گا۔ اس شعر کا پس منظر بھی یہی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ میں محبوب کی محفل میں بارہا گیا اور وہاں ساقی یعنی محبوب لوگوں کو شراب بھی دیتا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ نوازش مجھ پر کبھی نہ ہوئی اور بزم میں مجھ تک کبھی جامِ شراب نہ پہنچا۔ آج شراب کا پیالہ مجھ تک پہنچا ہے۔ لیکن میں پیتے ہوئے ڈر رہا ہوں اس لئے کہ کہیں محبوب نے شراب کے پیالے میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔ یعنی غالب اس غیر معمولی نوازش پر شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شعر نمبر۵:۔ جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے　　　کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

تشریح اکثر عشاق بدگمان رہتے ہیں کہ محبوب اُن سے زیادہ رقیب پہ مہربان ہے یا یہ کہ رقیب

محبوب کو اپنے چکر میں پھانس لے گا اور وہ رقیب ہی کا ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن غالب عام شعری روایت کے برعکس الگ بات کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رقیب زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنے آپ کو حد سے زیادہ وفادار ثابت کرے اور محبوب کو اپنے دام میں لانے کی کوشش کرے۔ لیکن خوش قسمتی سے محبوب وفا کے جذبے اور رویئے کا قائل ہی نہیں اور اس کے نزدیک یہ ایک بیکار چیز ہے۔ یعنی نہ محبوب وفا کو مانتا ہے اور نہ رقیب اپنے فریب کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں مجھے محض دشمن یعنی رقیب کی وجہ سے اپنے دوست یعنی محبوب سے بدگمان و ناراض نہیں ہونا چاہیے اور اطمینان رکھنا چاہیے کہ محبوب پر رقیب کا فریب نہیں چلے گا۔

شعر نمبر ۶: ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ‏ ‏ ‏ ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

تشریح: عاشق کا محبوب سے سامنا ہوا تو محبوب کو غصہ آیا۔ گو محبوب نقاب اور پردے میں تھا لیکن عاشق کو محبوب کے غصے کا اندازہ ہو گیا کیونکہ غصے کی وجہ سے محبوب کے ماتھے پر بل پڑ گیا جس کی وجہ سے نقاب کے ایک پہلو میں شکن نمایاں ہو گیا اور اس شکن سے عاشق کو محبوب کے غصے کا اندازہ ہوا اور وہ سمجھ گیا کہ وہ جو تمنائے ملاقات لے کر آیا تھا اس کے پورا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

شعر نمبر ۷: لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ‏ ‏ ‏ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

تشریح: غالب کہتے ہیں کہ محبوب ہزار طریقے سے اظہارِ محبت کرے وہ سب ایک طرف لیکن اس کا محض نظر چرانا ایک طرف۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف نظر چرانے سے جن جذبوں کا اظہار ہوتا ہے اور جس تعلق خاطر کا پتا چلتا ہے وہ کسی اور طرح ممکن نہیں۔ اسی طرح محبوب لاکھ بناؤ سنگھار کرے لیکن جو دلآویزی اور دلکشی اس کے بگڑنے اور غضبناک ہونے میں ہے وہ کسی طرح کے بناؤ سنگھار میں نہیں۔

الفاظ کی سادگی، غیر محسوس صنعتوں اور مضمون آفرینی نے شعر کو کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ یہ شعر سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔

شعر نمبر ۸: وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے ‏ ‏ ‏ جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

۹: وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے ‏ ‏ ‏ جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

تشریح: غالب کہتے ہیں کہ وہ اثر انگیز آہ و زاری جو عام حالات میں سورج تک میں دراڑیں ڈال دیتی ہے عاشق کی بدقسمتی سے محبوب کے دل میں گھاس پھوس کے برابر یعنی انتہائی معمولی اثر بھی پیدا نہیں کرتی۔ یعنی عاشق کی آہ و فغاں سے سورج تو شق ہو سکتا ہے لیکن محبوب مہربان

نہیں ہو سکتا۔

اس طرح وہ جادو جس کے زور پر صحراؤں میں جہاں پانی کا نام و نشان نہیں ہوتا، کشتیاں رواں کی جا سکتی ہیں لیکن وہ محبوب کے حصول کے ضمن میں بالکل بے کار اور بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ یعنی عاشق ناممکن کام کر کے دکھا سکتا ہے لیکن محبوب کو اپنی محبت کا قائل کرنا اُس کے بس میں نہیں۔

شعر نمبر ۱۶: غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی ‖ پیتا ہوں روز ابر و شب مہتاب میں

تشریح غالب کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں میں بہت شراب پیا کرتا تھا لیکن اب شراب پینا ترک کر دیا ہے اور کبھی کبھی خاص خاص موقعوں پر پیتا ہوں۔ مثلاً اُس دن جب بادل چھا جائیں اور ہر طرف بارش ہو رہی ہو اور اس رات جب چاند نکلا ہوا ہو اور ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی ہو۔ اس شعر میں اوّل یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ متذکرہ بالا دونوں صورتوں میں زندگی کی عام کیفیات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے جس سے انسان بھی متاثر ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ غالب نے بظاہر اس شعر میں شراب چھوڑ دینے کا تاثر دیا اور یہ کہا کہ صرف عام دنوں میں پیتا ہوں۔ جبکہ ایک نقاد نے اس ضمن میں بہت پتے کی بات کہی ہے وہ کہتے ہیں کہ چار ماہ برسات کے اور ہر ماہ کی آدھی راتیں، چاندراتیں یعنی چھ ماہ، اس حساب سے بنے اور ان میں غالب شراب پینے کا اعتراف کرتے ہیں۔ یعنی یعنی بارہ ماہ سے دس ماہ شراب پیتے ہیں اور صرف دو ماہ کے لئے چھوڑ دیتے ہیں تو یہ شراب چھوڑنا تو نہ ہوا۔ بہرحال یہی غالب کے فن کا کمال ہے۔

غزل نمبر ۴

حلِ لغات کل۔ آئندہ، آنے والا زمانہ ؛ خست۔ کنجوسی، بخل، کمی ؛ سوءِ ظن۔ بُرا خیال، بدگمانی ؛ ساقیٔ کوثر۔ جنت کی ایک نہر یا حوضِ کوثر کی شراب پلانے والے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ؛ باب۔ متعلق، معاملہ ؛ کل۔ ماضی، گذشتہ کل، مراد ہے وہ دن جب فرشتوں کو انسان کے حضور سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ؛ دم۔ وقت ؛ سماع۔ رقص و سرور، ناچنا گانا، محفلِ قوالی ؛ چنگ۔ ستار کی قسم کا باجا ؛ رباب۔ ایک قسم کی سارنگی ؛ رو۔ دُھن، خیال، بہاؤ، جوش، ولولہ، چال ؛ رخش۔ گھوڑا ؛ نے۔ نہ ؛ باگ۔ لگام ؛ رکاب۔ لوہے کا وہ حلقہ جس میں گھوڑ سوار اپنے پاؤں رکھتا ہے ؛ اصل۔ جڑ، حقیقت، اصلیت ؛ شہود۔ دیکھنا، دیکھنے کی صلاحیت، اہلِ تصوف کی اصطلاح میں وہ درجہ جس میں جلوۂ حق بلکہ ہر شے میں حق نظر آئے ؛ شاہد۔ دیکھنے والا، شہادت دینے والا ؛ مشہود۔ جسے دیکھا جائے ؛ مشاہدہ۔ دیکھنا لیکن مشاہدے کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ تقابل کے بغیر اس وزن کے معنی نہیں بنتے ؛

حساب ۔ شمار ؛ صور ۔ صورت کی جمع ؛ بحر ۔ سمندر ؛ حباب ۔ بلبلہ ؛ ہنوز ۔ ابھی تک ، تاحال ؛ دائم ۔ ہمیشہ ؛ شہود ۔ دیکھنا ؛ ندیم ۔ ہمنشین ، ہمدم ، دوست ؛ بندگی ۔ غلامی ؛ بوتراب ۔ مٹی کا باپ ، حضرت علیؓ کا لقب ؛

شعر نمبر ۱: کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

تشریح غالب کہتے ہیں کہ اے ساقی تو اس خیال سے آج شراب دینے میں بخل سے کام لے رہا ہے کہ اگر آج شراب زیادہ پی لی گئی تو قیامت کے بعد جنت میں شراب اسی قدر کم ملے گی۔ لیکن یہ تصور کرنا ساقیٔ کوثر یعنی آنحضرتؐ کے شان میں سوءِ ظن ہے جو نہایت غلط ہے۔ آج بھی شراب اُن کی عنایت سے مل رہی ہے اور کل بھی انہی کی عنایت سے ملے گی اور پینے والے کے حوصلے کے مطابق ملے گی لہٰذا مستقبل کے خیال سے آج کنجوسی اور بخل کرنا درست نہیں۔

کل کے دوسرے معنی فردا یعنی آئندہ آنے والی کل بھی ہو سکتے ہیں اور قیامت بھی۔

شعر نمبر ۲: ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

تشریح اے خدا ایک وہ وقت تھا کہ تو نے ہمیں پیدا کیا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ جس فرشتے نے سجدہ کرنے کی بجائے ہمارے نقائص و مصائب پر نظر کی تو تو نے اُسے راندۂ درگاہ قرار دے کر شیطان بنا دیا۔ گویا ایک زمانے میں تو ہماری وہ عزت اور توقیر تھی کہ ہماری وجہ سے فرشتے بھی راندۂ درگاہ ہو گئے لیکن آج وہی انسان اس دنیا میں ذلیل و خوار ہیں اور تو اُن کی ذلت و خواری کا تماشا خاموش تماشائی کی طرح دیکھ رہا ہے، آخر اس کا کیا سبب ہے! یعنی ہم پر الطاف و عنایت اب بھی ہونا چاہیے۔

شعر نمبر ۳: جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

تشریح غالب کہتے ہیں کہ اگر متصوفین اور وحدت الوجودی صوفیاء کے نظریئے کو مان لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ ہر شے میں خدا ہی موجود ہے۔ یہاں تک کہ مختلف سازوں مثلاً چنگ و رباب کی آواز بھی درحقیقت محبوب حقیقی ہی کی آواز ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آواز کو تو حیات بخش ہونا چاہیے جبکہ اس آواز کو سنتے ہی ہمارے جسموں سے جان نکلنے لگتی ہے اور لوگ یہ آوازیں سن کر تڑپنے لگتے ہیں۔

غالب چونکہ خود وحدت الوجودی نظریات کی طرف میلان رکھتے تھے لہٰذا اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چنگ و رباب میں سے نکلنے والی آواز کو پہچان کر ہی فقراء و صوفیاء تڑپنے لگتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ یہ آواز واقعی محبوب حقیقی کی ہے۔

شعر نمبر ۴: رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

تشریح: زندگی کے بارے میں انسان کی بے بسی، مجبوری اور بے اختیاری کا اس سے بہتر نقشہ نہیں کھینچا جا سکتا۔ غالب کہتے ہیں کہ زندگی کے متعلق ہماری کیفیت اُس سوار سے مماثل ہے جو ایک بھاگتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھا ہے۔ نہ تو اس گھوڑے کی لگام ہے جسے پکڑ کر سوار گھوڑے کو روکنے کی کوشش کرے یا اپنے لئے سہارا بنائے اور نہ اس کے رکاب ہیں جس سے کام لے کر سوار مضبوطی سے بیٹھا رہے یا گھوڑے کی رفتار کو کم و بیش کر سکے۔

زندگی کے سلسلے میں انسان کی یہی کیفیت ہے کہ اُسے اپنے پیدا ہونے پر اختیار ہے نہ اپنی موت پر۔ نہ موت کے مقام کا علم ہے اور نہ زندگی کی استواری کا۔ یہ شعر حسین تشبیہہ اور محاکات کا لاجواب نمونہ ہے۔

شعر نمبر ۵: اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

تشریح: وحدت الوجودی نظریات کے زیر اثر مرزا غالب کہتے ہیں کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ ہی کا عکس ہے۔ اس طرح گویا شاہد یعنی اللہ تعالیٰ کے جلووں کو دیکھنے والے انسان، وہ جو دیکھا جا رہا ہے یعنی خدا اور دیکھنے کی صلاحیت و قدرت میں کوئی فرق نہیں اور یہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف رُخ ہیں۔

اور جب حقیقت ہی ہے تو پھر ہم بار بار مشاہدے کا ذکر کیوں کرتے ہیں

اس لئے کہ مشاہدے کے لئے دو مختلف اور متضاد یا کم از کم الگ الگ وجود رکھنے والوں کا ہونا لازم ہے اور جب ہم اور خدا الگ الگ وجود ہی نہیں رکھتے تو پھر مشاہدے کا ذکر بے معنی ہے۔

شعر نمبر ۶: ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر   یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

تشریح: سمندر میں قطروں لہروں اور بلبلوں کی کوئی حیثیت نہیں اس لئے کہ یہ سب تو صرف سمندر کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں اور دیکھا جائے تو سمندر ہی کا حصہ ہیں سمندر سے الگ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ وجود حقیقی ہے اور اُس نے اپنی ذات کے اظہار کے لئے کائنات کے مختلف مظاہر کو پیدا کیا۔ کیا چھوٹا کیا بڑا، کیا ادنیٰ اور کیا اعلیٰ سب اسی وجود حقیقی کی نمود کا ذریعہ ہیں اور بس۔ دوسرے لفظوں میں غالب کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کی ذات کے مرہونِ منت ہیں اور ہماری اپنی جو کچھ بھی ہستی ہے اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، اللہ ہمارا محتاج نہیں۔

شعر نمبر ۷: آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تشریح: ہمارا محبوب ابھی تک اپنے حسن کی آرائش اور اپنے بناؤ سنگھار میں مصروف ہے اور اس

سے فارغ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اُس نے برقع اوڑھ لیا لیکن نقاب کے پیچھے اب تک آئینہ موجود ہے۔ جو اُس نے اپنے سامنے رکھا ہوا ہے اور اپنی زیبائش میں مشغول و مگن ہے۔

بعض شارحین کا خیال ہے کہ غالبؔ نے اس شعر میں کائنات کے ارتقاء اور مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا نقشہ کھینچا ہے جیسا کہ اقبالؔ کہتے ہیں۔

؎ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

شعر نمبر ۸:۔ ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

تشریح: غالبؔ کہتے ہیں کہ ایک شخص خواب دیکھ رہا ہے کہ وہ نیند سے بیدار ہوا لیکن اگر ہم اسے اُس کی واقعی بیداری تصور کریں تو یہ ہماری غلطی ہو گی کیونکہ حقیقتاً تو وہ شخص ابھی تک سو رہا ہے اور یہ سب کچھ اُس نے عالمِ خواب دیکھا ہے۔ اِسی پر قیاس کرتے ہوئے غالبؔ کہتے ہیں کہ اگر ہم یہ فرض کریں کہ ہم اِس دنیا میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ خدا ہی کا جلوہ اور عکس ہے تو یہ بھی ہماری ایک غلط فہمی ہو گی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو غیب الغیب ہے یعنی ایسی ہستی ہے جو ہمارے وہم و گمان اور تصور و ادراک سے ماورا ہے اور اسے دیکھنا، سمجھنا یا اُس کے بارے میں قیاس کرنا ہمارے لئے ممکن ہی نہیں۔

شعر نمبر ۹:۔ غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست۔ مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

تشریح: انسانی روابط کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں مثلاً دوست تو دوست ہے لیکن دوست کا دوست بھی دوست ہوتا ہے اِسی طرح دشمن کا دشمن بھی درحقیقت دشمن ہی ہوتا ہے۔

اِس پس منظر میں مرزا غالبؔ کہتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ کے دوست اور محبوب ہیں اور میں اُن کی غلامی میں اِس لئے مصروف ہوں کہ دراصل یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی اور غلامی ہے۔

غزل نمبر ۵

حلِ لغات: رشک۔ حسد، جلن، رقابت ؛ ہاتھ دھونا۔ نا اُمید ہونا، آس توڑنا ؛ اندیشہ۔ فکر، سوچ، تردد، خوف ؛ آبگینہ۔ شیشے کی صراحی ؛ صہبا۔ شراب ؛ چشمِ بد۔ بُری نظر، لگ جانے والی نظر ؛ طرب۔ خوشی، مسرت، عیش ؛ پردہ دار۔ چھپانے والا ؛ پا جانا۔ تاڑ جانا، معلوم کر لینا ؛ رنجور۔ غمزدہ، غمگین ؛ مدعائے غیر۔ رقیب کی آواز ؛ نقش۔ تصویر ؛ کھنچتا جانا ؛ ناراض رہنا، کشیدہ خاطر ؛ دود۔ دھواں ؛

شعر نمبر ۱:۔ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے۔ میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

تشریح: مرزا غالبؔ کہتے ہیں کہ میری بدنصیبی ملاحظہ فرمایئے کہ میں خود اپنے آپ سے بھی حسد کرتا ہوں

اور شدید خواہش کے باوجود محبوب کو صرف اس لئے دیکھنے سے محروم چلا آتا ہوں کہ یہ بات میری برداشت سے باہر ہے کہ کوئی میرے محبوب کو دیکھے اور یہ کوئی خواہ میں خود ہی کیوں نہ ہو۔

رشک کے ضمن میں مرزا غالب نے بہت عمدہ مضامین نکالے ہیں۔ اور یہ شعر بھی مرزا کے ایسے ہی اشعار میں شامل ہے۔ غیر اور رقیب سے رشک وحسد ہماری شاعری کی عام روایت ہے لیکن خود اپنی ذات سے رشک کرنے کا مضمون صرف غالبؔ کا حصّہ ہے۔

شعر نمبر ۲: ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے — آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

تشریح غالبؔ نے فکر و اندیشہ کو تیز شراب سے تشبیہ دی ہے اور اپنے دل کو شیشے کی صراحی سے، کہتے ہیں کہ جس طرح شیشے کی صراحی شراب کی تیزی سے پگھل جاتی ہے بالکل اسی طرح ہمارا دل بھی فکر و اندیشہ کی گرمی سے پگھل جائے گا لہٰذا اس سے زیادہ توقعات باندھنے کی بجائے مایوس و ناامید ہو جانا چاہیے۔

شعر نمبر ۳: دورِ چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ — نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

تشریح اے محبوب تونے خوشی و مسرت اور عیش و عشرت کی جو محفل سجا رکھی ہے خدا اسے نظرِ بد سے بچائے اور خدا کرے کہ یہ ہمیشہ یونہی قائم و دائم رہے۔ اس لئے کہ اس بزم کی کیفیت یہ ہے کہ اگر میں ہجر و فراق میں نالہ و زاری بھی کرتا ہوں تو وہ بھی گانے اور نغمے کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور غالباً غالبؔ کے نالے محبوب پر اسی لئے اثر انداز نہیں ہوتے کہ وہ تو اُسے اپنی محفل کے اثر کے باعث غمزدگی کا تاثر دینے کی بجائے نغمہ بن کر خوشی و سرمستی کا تاثر دیتے ہیں۔ بہرحال غالبؔ نے ایک اور جگہ یہی مفہوم ادا کیا ہے۔

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے!

شعر نمبر ۴: گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

تشریح ہم محبوب کی بزم میں بیٹھے ہیں اور جان بوجھ کر محبوب سے غفلت برت رہے ہیں اور اُس کی طرف توجہ نہیں کر رہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارے عشق کا راز محبوب پر نہ کھلے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ظاہری طور پر ہر طرح کی احتیاط کے باوجود جب ہم اُسے دیکھتے ہیں تو از خود وارفتہ ہو جاتے ہیں اور اپنے حواس میں نہیں رہتے۔ اور یہ ایسی کیفیت ہے جس کی بناء پر ہمارا رازِ عشق راز نہیں رہتا اور حقیقتِ حال کھل جاتی ہے اور محبوب ہماری حالت کے سبب تاڑ لیتا ہے۔

شعر نمبر ۵: اُس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں — مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

تشریح محبوب عیش و مسرت کی محفلیں آراستہ کرتا ہے جن میں دوسرے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں

اور مسرت و شادمانی حاصل بھی ہو تو یہ بہار کی طرح بالآخر طبیعت کی گرانباری اور رنج و اندوہ پر منتج ہوتی ہے اور انسان کو اس کے بدلے بے شمار غم برداشت کرنا پڑتے ہیں۔

لیکن مجھ کو شرکت کی اجازت نہیں۔ لہٰذا محبوب سے دور اپنے غمکدے میں محبوب کی محفلوں کا حال سنتا ہوں تو افسوس و غم کے باعث مجھ پر اختلاج قلب کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور میں بے ہوش ہو جاتا ہوں اور میری اس کیفیت کا فائدہ غیر یعنی رقیب کو پہنچتا ہے اور وہ میری عدم موجودگی اور بے ہوشی سے فائدہ اُٹھا کر محبوب کی قرابت حاصل کر رہا ہے اور محبوب کے دل میں اپنے لئے جگہ بنا رہا ہے۔

واضح ہو کہ بیٹھنا کا تعلق بیک وقت دل سے بھی ہے اور نقش سے بھی۔ یعنی میرا دل بیٹھتا ہے اور محبوب کے دل میں رقیب کا نقش بیٹھتا ہے۔

شعر نمبر ۶: ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا　　رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

تشریح: غالبؔ کہتے ہے کہ ہماری طرح محبوب کو بھی عشق ہو گیا ہے اور اس کے باعث جن پریشانیوں اور غموں سے محبوب کو دو چار ہونا پڑا اُن کی وجہ سے اُس کے چہرے کا رنگ اُڑنے لگا اور یوں اُس کا حسن نمایاں ہونے لگا۔ اور اس میں حد درجہ نزاکت آ گئی۔ واضح ہو کہ رنگ اُڑے گا تو چیزیں سفید ہوں گی اور سفید رنگ حسن کی علامت ہے۔ اس بنیاد پر شاعر نے یہ مضمون پیدا کیا۔ بہر حال محبوب کو عشق ہو جانے پر بھی غالبؔ نے بعض اچھے شعر کہے ہیں۔ کہتے ہیں۔

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

شعر نمبر ۷: نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں　　کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

تشریح: مصور محبوب کی تصویر بنا رہا ہے اور محبوب کی تصویر مصور سے کیا کیا ناز و انداز کے مظاہرے کر رہی ہے۔ مصور محبوب کی جتنی تصویر بناتا ہے محبوب اُسی قدر کھنچتا جاتا ہے یعنی محبوب سے دور ہوتا جاتا ہے اور یہ مصور کی بد قسمتی ہے کہ محبوب کشیدہ قامت ہوتا جاتا ہے۔ یعنی جس قدر تصویر بنی محبوب اس سے بڑھ گیا اور مصور کو پھر تصویر بنانا پڑی اور یوں وہ اپنی تصویر مکمل نہیں کر پا رہا۔ کھنچتا جانا عام لغوی معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور محاورۃً بھی۔

شعر نمبر ۸: سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ　　پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

تشریح: مقطع میں مرزا غالبؔ کہتے ہیں کہ اے اسدؔ (غالبؔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے) مجھ پر بُرا وقت آن پڑا تھا اور بُرے وقت میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ سایہ بھی انسان سے الگ ہو جاتا ہے اور میرا سایہ تو اس طرح مجھ سے دور ہوا ہے جیسے آگ لگتے ہی دھواں الگ ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو میرے جسم و جاں میں بھی تو عشق کی آگ لگی ہوئی ہے۔ ایسے میں میرے پاس کون کھڑا ہو سکتا ہے لہٰذا سائے سمیت سب لوگ الگ ہو گئے ہیں۔

غزل نمبر ۶

حلِ لغات ظلمت کدہ ۔ وہ گھر جس میں تاریکی ہو؛ جوش ۔ سرگرمی، ولولہ، زیادتی، تیزی؛ سحر ۔ صبح؛ مژدہ ۔ خوشخبری؛ آشتی ۔ صلح، دوستی، اتفاق؛ خود آرا ۔ اپنے آپ کو سجانے والا، انتہائی حسین؛ تسلیم ۔ سپرد کرنا، قبول کرنا، بندگی، سلام کرنا؛ گوہر ۔ موتی؛ عقد ۔ گرہ، گانٹھ، قول و قرار، ہار؛ اوج ۔ بلندی؛ بادہ ۔ شراب؛ خروش ۔ شور و غل؛ تازہ وارد ۔ نئے آنے والے؛ بساط، حوصلہ، ہمت، وسعت؛ ناؤ نوش ۔ نغمہ سننا اور شراب پینا یعنی عیش و عشرت؛ دیدۂ عبرت نگاہ ۔ واقعاتِ زمانہ سے سبق حاصل کرنے والی آنکھ؛ گوشِ نصیحت نیوش ۔ پند و وعظ پر توجہ دینے والے کان؛ ساقی ۔ شراب پلانے والا؛ آگہی ۔ واقفیت، علم، خبر؛ مطرب ۔ گانے والا؛ رہزن ۔ لوٹنے والا، ڈاکو؛ تمکین ۔ وقار، عزت، طاقت؛ ہوش ۔ دانش، عقل، فہم، شعور، روح؛ کف ۔ ہتھیلی؛ چنگ ۔ ایک ساز؛ صریرِ خامہ ۔ قلم کی آواز؛ سروش ۔ خوشخبری دینے والا فرشتہ؛

شعر نمبر ۱: ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ۔۔۔ اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

تشریح میرے اندھیرے اور تاریک گھر میں غم کی رات کی سرگرمی اور زیادتی کا یہ عالم ہے کہ صبح کی روشنی اور نور یعنی جملہ علامتیں موجود نہیں ہیں ۔ صرف ایک علامت یعنی بجھی ہوئی شمع علامتِ سحر کے طور پر موجود ہے لیکن وہ بھی بجھی ہوئی ہے اور روشنی نہیں دے رہی ۔

واضح ہو کہ شمع رات بھر جلتی ہے اور صبح کے وقت بجھا دی جاتی ہے اور یوں شمع کے بجھنے کو صبح کی علامت قرار دیا جاتا ہے ۔ لیکن بجھی ہوئی شمع بجائے خود اندھیرے کو بڑھانے والی ہے خاص طور پر اس صورت میں جبکہ سحر نہ ہوئی ہو اور گھر میں چاروں طرف تاریکی کا راج ہو ۔

مطلع سمیت اس غزل کے اکثر اشعار مغلیہ سلطنت اور ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کا مرثیہ ہیں اور انھیں اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے ۔ گویا غالب کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی دور ختم ہوا ۔ اس کی یاد کے طور پر بہادر شاہ ظفر موجود ہیں لیکن ان میں بھی حکمرانی کی کوئی شان موجود نہیں اور مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کو ان کے وجود سے متعلق نہیں کہا جا سکتا ۔

شعر نمبر ۲: نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال ۔۔۔ مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

تشریح ایک زمانہ تھا جب محبوب کے وصال کی خوشخبری سن کر کان سرشار و بے چین ہو جاتے تھے یا یہ خبر سننے کے لئے بے چین رہتے تھے اور محبوب کے جلوے دیکھنے یا دیکھنے کی خواہش کی وجہ سے ہماری آنکھیں بے تاب رہتی تھیں ۔ لیکن اب ہمارا جذبۂ عشق ختم ہوا یا محبوب کی نامہربانی

کے باعث ہم انتہائی مایوس و شکستہ دل ہو گئے۔ ایک عرصے سے نہ وصال کی خبر ملی نہ آنکھوں نے جمالِ یار کا مشاہدہ و نظارہ کیا اور یوں ہمارے کان اور آنکھیں دونوں مطمئن اور پر سکون ہو گئیں۔

ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اگر کان وصال کا مژدہ سنتے تو آنکھوں کو کانوں پر رشک آتا اور ان کے لئے شکایت کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اسی طرح آنکھوں کو محبوب کا نظارہ میسر آتا تو کان شکایت کرتے لیکن اب چونکہ دونوں محروم ہیں لہٰذا کسی کو کسی سے گلہ نہیں اور دونوں کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔

شعر نمبر ۳:۔ مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب — اے شوق یاں اجازت تسلیم و ہوش ہے

تشریح: غالب کہتے ہیں کہ ہمارا محبوب جو ہمیشہ اپنی تزئین و آرائش میں مصروف رہتا تھا، اپنے عشاق سے حجاب برتتا تھا لیکن شراب پی کر وہ ان تکلفات سے بے نیاز ہو گیا اور شرم و حجاب کے تمام سلسلے ختم ہو گئے۔ اے عشق! ایسے میں تجھے بھی اپنے ہوش و حواس اور فرماں برداری ترک کر دینی چاہیے کہ صورتِ حال اور موقع کی نزاکت کا یہی تقاضا ہے۔ غالب نے یہی مضمون ذرا مختلف انداز میں ایک جگہ یوں نظم کیا ہے۔

؎ جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

شعر نمبر ۴:۔ گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

تشریح: موتیوں سے ہار بنانے والے نے ہار تیار کیا اور محبوب کے گلے میں پہنا دیا۔ اس سے ہار بیچنے والی کی خوش قسمتی کا اندازہ کیجئے کہ جو موقع عشاق کی زندگی میں کبھی نہ آیا وہ اس ہار بیچنے والے کو نصیب ہو گیا۔ ہار بیچنے والے کی خوش نصیبی کا پہلو یوں نکلتا ہے کہ اس نے ہار پہنایا تو ایک طرح سے محبوب کے گلے میں اس کے بازو حمائل ہوتے لیکن یہ چیز عاشق کو کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

شعر نمبر ۵:۔ دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست — بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

تشریح: غالب کہتے ہیں کہ گو مجھے محبوب کی محفل میں جانے کا موقع نہیں ملتا لیکن میں نے اپنے خیالوں کی دنیا میں ایک محفل سجا رکھی ہے جس میں محبوب کے دیدار اور نظارے کی شراب ملتی ہے۔ میرا اپنا حوصلہ شراب پلانے کے فرائض انجام دیتا ہے اور میری نگاہیں مخمور و سرمست رہتی ہیں اور یوں محبوب کی محفل میں شریک نہ ہونے کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن اس بزم خیال کا نقص یہ ہے کہ محبوب کی محفل میں جو ہنگامہ اور شور و غل برپا ہوتا ہے یہ اس سے خالی ہے۔

شعر نمبر ۶:۔ اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

۷:۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

تشریح: اگلے شعر قطع بند ہیں اور ایک ساتھ ملا کر پڑھنے سے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ مرزا غالب ان

لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں جو نئے نئے عشق کی وادی میں آتے ہیں کہ اسے خواہشوں اور آرزوں کی دنیا میں نئے نئے آنے والو اور اپنے دل میں حد سے زیادہ شراب پینے پلانے کی خواہش رکھنے والو! اگر تم زمانے کے واقعات سے سبق حاصل کرنے والی نظر رکھتے ہو تو مجھے دیکھو اور اگر تمہارے کان لوگوں کی نصیحتیں سننے کے عادی ہوں تو پھر میری بات پر توجہ دو۔ یعنی میں عشق اختیار کر کے جس حال کو پہنچا ہوں وہی حال تمہارا بھی ہوگا لہٰذا اس سے باز آجاؤ۔ ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ میں عشق کے میدان سے واقف ہوں لہٰذا میرے مشوروں پر عمل کرو تاکہ تم نقصان اٹھانے سے محفوظ رہو اور تمہیں محبوب کا وصال میسر آئے۔

شعر نمبر ۸: ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی   مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

تشریح پچھلے دو شعروں کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں شراب پلانے والا اپنے حسن کا جلوہ دکھا کر لوگوں کے ایمان و ہوش و حواس چھین لیتا ہے اور گانے والا نغمہ سنا کر انہیں بے خود کر دیتا ہے اور حواس میں نہیں رہنے دیتا۔ اس کے ساتھ ہی عزت و وقار بھی رخصت ہو جاتا ہے اور انسان بدنام و رسوا ہو جاتا ہے جیسا کہ میر نے کہا ہے۔

ع اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

شعر نمبر ۹ تا ۱۲:

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط   دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ   یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں!   نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی   اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

تشریح غالب کہتے ہیں کہ عزت و ناموس کے بدلے ملنے والے عیش و مسرت کی کیفیت بھی یہ ہے کہ رات کو تو بزم کا ایک ایک گوشہ پھولوں کی کثرت کی بنا پر باغباں کی جھولی اور پھول بیچنے والے کے ہاتھوں کا منظر پیش کر رہا تھا یعنی ہر طرف شادمانی ہی شادمانی اور مسرت ہی مسرت تھی۔ اس کے علاوہ شراب پلانے والے کی مست کر دینے والی چال کا ہر طرف نظارہ تھا اور مختلف سازوں مثلاً چنگ وغیرہ کی آوازیں اور نغمے تھے۔ گویا اگر ساقی کی خرام سے آنکھیں محظوظ ہو رہی تھیں تو نغموں سے کان سرشار تھے۔ رات کو بے شک یہ کیفیت تھی لیکن رات گزرنے کے بعد صبح کے وقت جو بزم کو دیکھا گیا تو وہ پھول، خرامِ ساقی اور صدائے چنگ سب رخصت ہو چکے تھے۔ نہ وہاں وہ سرور و سرمستی کی کیفیت تھی اور نہ جوش و سرگرمی کی حالت۔ البتہ رات بھر جس شمع نے محفل کو جگمگائے رکھا تھا وہ بجھی ہوئی پڑی تھی اور یوں گویا ساری محفل درہم برہم ہو چکی تھی۔ اور شمع اس محفل کے اجڑنے کا استعارہ بنی ہوئی تھی۔

ان اشعار پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ غزل کے عام اشعار ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں برصغیر

میں مسلمانوں کے زوال کا پُر درد نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ کچھ لوگ وارد ہند ہوتے اور یہاں پر انہوں نے محفل آراستہ کی۔ کچھ عرصے تک عیش و عشرت کا دور رہا۔ پھر ان لوگوں کے اخلاف میں سے صرف بہادر شاہ ظفر باقی رہ گیا جس کے لئے یہ عظمت و سطوت قصۂ پارینہ بن چکی تھی اور جس نے اپنی زندگی کے آخری برس جلا وطنی اور قید کی حالت میں رنگون میں بسر کئے۔ بہادر شاہ ظفر کی زندگی اُس شمع سے مختلف نہیں جو شب کی محفل کی حشر ساما نیوں کے فراق کے دُکھ میں بجھ گئی ہو۔

شعر نمبر ۱۳: آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

تشریح غالبؔ اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے غالبؔ یہ مضامین جنہیں میں نظم کر رہا ہوں میرے اپنے تخیل کا نتیجہ نہیں بلکہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد ہوتے ہیں۔ دراصل میرے قلم کی آواز خوشخبری دینے والے فرشتے کی آواز ہے۔

اِس طرح گویا غالبؔ نے اِس شعر میں تعلی کرتے ہوئے اپنی تعریف کی ہے۔

مومن خاں مومنؔ

غزل نمبر ۱

حل لغات غمزہ۔ آنکھ کا اشارہ، ناز، نخرہ؛ غمّاز۔ آنکھ سے اشارہ کرنے والا، چغل خور؛ نہاں۔ پوشیدہ، چھپا ہوا؛ مُرغ۔ پرندہ؛ دشنام۔ گالی گلوچ؛ حزیں۔ غمگین، ملول؛ گراں۔ بوجھ، ناگوار؛ ہم نفس۔ ساتھی، دوست؛ منجم۔ نجومی، ستاروں کی چال دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والا؛ رقیب۔ دشمن، حریف، ہم پیشہ؛ طالع۔ قسمت، مقدر؛ مآل۔ انجام؛ سپہر۔ آسمان؛ تفرقہ انداز۔ نا اتفاقی پیدا کرنے والا، لڑانے والا؛ کشتہ۔ مارا ہوا، عاشق؛ فسوں۔ جادو؛ خیرہ۔ تاریک، اندھی؛ سرزنش۔ ملامت، بھلا بُرا کہنا؛ سوز۔ جلن، آگ؛ جحیم۔ دہکتی ہوئی آگ، دوزخ؛

شعر نمبر ۱: غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

تشریح مومنؔ کے اکثر اشعار میں کچھ باتیں محذوف ہوتی ہیں۔ اگر انھیں پیشِ نظر رکھ لیا جائے تو شعر آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اس شعر کی بھی یہی کیفیت ہے۔ شاعر نے ایک محفل کا نقشہ کھینچا ہے جس میں محبوب بھی موجود ہے اور عاشق بھی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ موجود ہیں۔ ایسے میں محبوب عاشق کو نظر انداز کرنا چاہتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی محبت کا راز دوسرے لوگوں سے چھپانا چاہتا ہے لیکن عاشق یا شاعر کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے محبوب!

اگر محفل میں دوسروں پر عنایات کی بارش کی گئی اور مجھے نظر انداز کر دیا گیا تو تاڑنے والے تاڑ جائیں گے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے اور جب وہ تحقیق کریں گے تو انھیں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ لہٰذا غیروں سے اپنی محبت کے راز کو راز رکھنے اور چھپانے کا طریقہ یہ ہے کہ محفل میں کبھی کبھی میری طرف بھی آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر دینا۔ ایسا ہو گا تو لوگوں کو شک نہیں ہو گا۔

شعر نمبر۲:۔ اٹھتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں ۔ اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

تشریح: اس شعر میں شاعر نے عاشق کی ایسی کیفیت بیان کی ہے کہ محفل میں محبوب کو رقیب کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر عاشق کا رنگ اُڑ گیا۔ لیکن اُس نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور اہل محفل سے اپنی کیفیت چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ شاعر نے رنگِ رُخ کو مرغِ پر شکستہ یعنی ایسا پرندہ جس کے پر ٹوٹ چکے ہوں قرار دیا ہے۔ دونوں میں مناسبت یہ ہے کہ جس طرح عاشق کا رنگ تھوڑی دیر کے لئے اُڑا تھا۔ اِس کے بعد گویا اُس کے پر ٹوٹ گئے۔ بات فقط اتنی ہے کہ عاشق محبوب کی محفل میں پہنچا۔ رقیب کی وجہ سے اس کی وہاں پذیرائی نہ ہوئی، لیکن اس کے باوجود وُہ وہاں بیٹھا رہا۔

شعر نمبر۳:۔ دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں ۔ اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

تشریح: مومن اپنے دوستوں اور راز داروں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ بے شک محبوب مجھے گالیاں دیتا ہے لیکن میری غمگین طبیعت کے لئے محبوب کی یہ گالیاں ناگوار اور تکلیف دہ نہیں۔ اس لئے کہ میری توجہ گالیوں کی تلخی کی بجائے محبوب کے لہجے اور آواز کی نزاکت کی طرف ہے۔ ویسے ہماری شعری روایت میں محبوب کی گالیوں پر خفگی اور ناراضگی کا اظہار نہیں کیا جاتا بلکہ جیسے مومن نے اس شعر میں نزاکت کے حوالے سے گالیوں کو اچھا کہا بالکل اسی طرح بعض دوسرے شعراء نے گالیوں سے مختلف پہلو نکالے ہیں مثلاً غالب کہتے ہیں ۔

؎ کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب ۔ گالیاں کھا کے بھی بد مزہ نہ ہوا

شعر نمبر۴:۔ دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب ۔ تھا ساز گار طالع ناساز دیکھنا

تشریح: اس شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ عاشق نے نجومی سے پُوچھا کہ کیا میری قسمت میں محبُوب کا حصول لکھا ہے؟ نجومی نے زائچہ کھینچ کر دیکھا تو عاشق کی قسمت میں محبوب کا حصُول موجود تھا۔ نجومی کو حسد ہُوا کہ ایسا خوب صُورت محبوب عاشق کی قسمت میں ہے چنانچہ وُہ عاشق کا رقیب بن گیا۔ نجومی کی رقابت کو دیکھ کر عاشق کو اندازہ ہو گیا کہ میری قسمت بالآخر ساز گار ہو جائے گی۔

شعر نمبر۵:۔ یہ کام کا مآل برا ہے جزا کے دن ۔ حال سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

تشریح مومن کہتے ہیں کہ وہ لوگ، جو برے کام کرتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے نہیں انجام کار وہ ذلیل وخوار ہوں گے اور انہیں بداعمال کے نتیجے میں روزِ حساب واحتساب سزا بھگتنا پڑے گی ۔ مثلاً آپ آسمان کو دیکھیے جو لوگوں پر آفات نازل کرتا ہے اور ان میں تفرقے پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے قیامت کے دن ذلیل وخوار ہوگا۔ اس اخلاقی شعر کے لئے مومن خاں مومن نے قیامت کے بارے میں عمومی تصور کو بنیاد بنایا ہے ۔ اس تصور کی رو سے قیامت کے دن سورج سوا نیزے پر آجائے گا ۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے اور آسمان کی بساط لپیٹ دی جائیگی ۔

شعر نمبر ۶: مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم   پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

تشریح مومن کہتے ہیں کہ ذرا خیال رکھنا وہ لوگ جن کی زندگی عشق کرتے گزر گئی اُن کی مٹی پر پاؤں نہ رکھنا اور انہیں ذلیل وخوار نہ کرنا ۔ اس لئے کہ عشق اختیار کرکے اور عشق کے تقاضوں کے مطابق عمل کرکے انھوں نے جو عزت وبلندی حاصل کی ، کہیں آپ کی بے توجہی کے باعث مٹی میں نہ مل جائے۔ ایک طرح سے مومن اس شعر میں اُن لوگوں کا احترام کرنے کا درس دیتے ہیں جنہوں نے قوم وملت یا کسی اور نیک مقصد کے لئے قربانیاں دی ہوں اور اس راستے میں اپنا سب کچھ لٹا دیا ہو ۔ جبکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو محض بیک جنبشِ قلم ان تمام قربانیوں پر پانی پھیر دیتے ہیں ۔ مومن ایسے لوگوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی بھی میدان میں سربلند لوگوں کی عزت کرنی چاہیے ۔

شعر نمبر ۷: کشتہ ہوں اس کی چشم فسوں گر کا اے مسیح!   کرنا سمجھ کے دعویٰ اعجاز دیکھنا

تشریح مومن کہتے ہیں کہ اے عیسیٰ نفس معالج! تو اس بات کا مدعی ہے کہ اپنے علاج سے ہر بیمار کو صحت یاب کر دیتا ہے لیکن میرے سلسلے میں یہ دعویٰ سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر کرنا ۔ اس لئے کہ دنیا کے عام مریضوں کی طرح کا مریض نہیں ہوں بلکہ میں تو اپنے جادو کر دینے والوں محبوب کی آنکھوں پر مٹا ہوا ہوں اور اُن کا عاشق ہوں ، ایسا نہ ہو کہ تو ناسمجھی میں میری صحت یابی کا دعویٰ کر دے اور بعد ازاں تجھے خفت وندامت کا سامنا کرنا پڑے ۔

شعر نمبر ۸: میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو   بے طاقتی پہ سرزنش ناز دیکھنا

تشریح میں نے محبوب کے حسن کے جلوے دیکھے اور میری آنکھیں ان جلووں کی تاب نہ لاکر اندھی ہوگئیں ۔ جب سے میں اندھا ہوا محبوب نے ہر شخص کے سامنے میری آنکھوں کا حوالہ دینا شروع کر دیا اور لوگوں کو میری آنکھیں دکھانا شروع کر دیں ۔ اس کا بظاہر مقصد تو یہ تھا کہ اپنے حسن کے اثرات لوگوں پر ظاہر کئے جائیں لیکن شاعر سمجھتا ہے کہ اس طرح محبوب لوگوں کو بتانا چاہتا ہے کہ دیکھیں عاشق کس قدر کم حوصلہ اور کم ظرف تھا کہ اس نے نظارے کی طلب کی اور جب حسن سامنے آیا تو اس کی

آنکھیں بند ہوگئیں اور یوں دراصل محبوب عاشق کی سرزنش و ملامت کرتا ہے اور عاشق کی رسوائی کا سبب بنتا ہے۔ محبوب کا یہ عمل ظلم کی بجائے ناز اس لئے ہے کہ وہ براہِ راست عاشق کی تذلیل و تحقیر کرنے کی بجائے ایک مختلف انداز اختیار کرتا ہے۔

شعر نمبر ۹:۔ ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے　　　مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

تشریح اے مومن ہماری عمر لہو و لعب میں گزری اور پھر اخروی زندگی اور اپنے انجام کی فکر ہوئی تو صاف نظر آیا کہ ان اعمال کے ساتھ تو ہمارا ٹھکانا جہنم ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جہنم اور جہنم کی آگ سے بچنے کے لئے اپنے اعمال سے تائب ہونا پڑا اور یوں ہم نے محبوب کی محبت بھی ترک کر دی۔ لیکن ترکِ محبت کے ساتھ ہی پتا چلا کہ محبوب کی دوری بھی تو انسان کو جلا دیتی ہے اور ہجر کی آگ بھی اپنی جلن کے اعتبار سے جہنم کی آگ سے کسی طرح کم نہیں۔ یوں گویا ہم ایک آگ سے بچنے کے لئے دوسری آگ کا شکار ہو گئے اور ہم　　　اپنے انجام کی فکر کی ابتدا ہی میں گرفتارِ مصیبت ہو گئے کیونکہ جہنم کی آگ تو جب جلاتی تب جلاتی لیکن ہجر کی آگ نے تو ابھی سے جلانا شروع کر دیا۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات رنج۔ دُکھ، درد، ملال؛ راحت افزا۔ آرام بڑھانے والا؛ حرفِ ناصح۔ نصیحت کرنے والے کی گفتگو، نصیحت؛ تلخ کلامی۔ ذائقہ کی کڑواہٹ؛ گویا۔ ظاہرا، بالفرض، ہو بہو، کامل طور پر، گفتگو کرنے والا؛ خصم۔ دشمن؛ رسا۔ پہنچنے والا، بلند ہونے والا؛ چارہ۔ علاج؛ مضطر۔ بے قرار، بے چین، بے اختیار؛ صنم، بُت، محبوب؛

شعر نمبر ۱:۔ اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا　　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تشریح غالبؔ نے کہا تھا کہ انسان مسلسل رنج و ملال کی کیفیت میں مبتلا رہے تو انسان اُن کا عادی ہو جاتا ہے اور یوں رنج و ملال زیادہ تکلیف دہ نہیں رہتا لیکن مومنؔ کہتے ہیں کہ ہمارے رنج و ملال اور غمزدگی کا محبوب پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا اور وہ ہمارے غموں سے متاثر ہو کر ہرگز ہم پر مہربان نہیں ہوتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یقیناً یہی رنج و غم ہمارے آرام میں اضافے کا باعث بن جاتے۔ لیکن چونکہ محبوب ایسا نہیں کرتا لہٰذا غم و اندوہ کے باعث ہماری کیفیت میں ذرا بھر تغیر نہیں آتا یعنی مومنؔ کے نزدیک محض غمزدہ رہنے سے سکھ اور آرام نہیں ملتا بلکہ اس کے لئے عملی جد و جہد کرنا پڑتی ہے۔

شعر نمبر ۲:۔ بے وفا کہنے کی شکایت ہے　　　تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

تشریح: محبوب ہم سے وفا کرنے کے وعدے کرتا ہے لیکن کبھی اس کے وعدے پورے نہیں ہوتے مگر اس کے اس مسلسل طرز عمل پر اگر ہم اُسے بے وفا کہیں تو وہ ہم سے ناراض ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم جا بجا میری شکایتیں کرتے پھرتے ہو۔ حالانکہ اگر وہ وعدہ وفا کرنا شروع کر دے اور یوں جب اُس کا طرز عمل بدل جائے گا تو ہم خود بخود اُسے بے وفا کہنا چھوڑ دیں گے۔ لیکن وہ ایسا کرنے کی بجائے ہمارے بے وفا کہنے سے خفا ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۳:- ذکر اغیار سے ہوا معلوم حرف ناصح برا نہیں ہوتا

تشریح: جب کوئی نصیحتیں کرنے والا نصیحت کرتا ہے اور ترک عشق کے مشورے دیتا ہے تو ناصح کی یہ باتیں بڑی لگتی ہیں لیکن جب ہم نے محبوب کی محفل میں بیٹھ کر محبوب کی زبان سے رقیبوں اور اپنے دشمنوں کا نام سنا تو یہ ذکر زیادہ ناگوار گزرا اور ہمیں معلوم ہوا کہ نصیحت کرنے والے کی گفتگو کی نسبت یہ ذکر زیادہ تکلیف دہ اور مضطرب کر دینے والا ہے۔ یعنی کسی چیز کی کڑواہٹ کا احساس اُسی وقت تک ہوتا ہے جب تک اس سے زیادہ تلخ اور کڑوی چیز سے واسطہ نہ پڑے۔

شعر نمبر ۴:- کس کو ہے ذوق تلخ کامی لیک جنگ بن کچھ مزا نہیں ہوتا

تشریح: یہ طے ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو ذائقے کی تلخی برداشت کرنے اور اسے مرغوب جاننے والا ہو اور خواہ مخواہ اچھے تعلقات کے باوجود لڑ جھگڑ کر الٹی سیدھی باتیں کہے اور سنے۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگوں اور خاص طور پر محبوب سے اُس کے تعلقات خوشگوار ہی رہیں اور اُن میں کوئی تلخی نہ آئے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اچھے تعلقات کی بنیاد بھی لڑائی اور ان بن پر ہوتی ہے اور حقیقی تعلقات کا لطف اِسی لڑائی جھگڑے اور چھیڑ چھاڑ میں آتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک کے بغیر تعلقات میں بے تکلفی نہیں آسکتی۔

شعر نمبر ۵:- تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تشریح: مومن کہتے ہیں کہ واقعاتِ عالم پر نظر دوڑائیے تو پتا چلے گا کہ روزمرہ اور معمول کے ہزاروں واقعات کے علاوہ دنیا میں ہر روز ایسے بھی بے شمار واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں جن کے وقوع پذیر ہونے کا بظاہر کوئی امکان اور قرینہ موجود نہیں۔ لیکن لاتعداد عجائب اور معجزات کے باوجود آج تک یہ معجزہ نہ ہو سکا کہ تو ہم پر مہربان ہو جائے۔ ہم تو تب مانتے جب یہ بظاہر ناممکن کام بھی ممکن ہو سکتا اور ہم تیری عنایات کا لطف اٹھاتے۔

شعر نمبر ۶: نارسائی سے دم رکے تو رکے　　　　میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تشریح اے محبوب اگر تم تک نہ پہنچ سکنے اور تمہیں نہ پانے کے غم میں میرا دم نکل جائے اور میری موت واقع ہو جائے تو اور بات ہے بصورتِ دیگر میرا مزاج ایسا ہے کہ میں کسی سے ناراض نہیں ہوتا اور چونکہ کسی سے ناراض نہیں ہوتا لہٰذا تم سے بھی خفا نہ ہوں گا اور اپنی زندگی سے بھی نہیں یعنی صرف فراق و ہجر کے صدمے میری جان لے سکتے ہیں۔

شعر نمبر ۷: تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تشریح روایت ہے کہ مرزا غالب جیسے عظیم شاعر نے مومن کے پیشِ نظر شعر کو اپنے پورے دیوان پر فوقیت دی تھی، دراصل اس شعر میں عاشق کی نفسی کیفیت کی کامیاب تصویر، الفاظ کے برجستہ و برمحل استعمال اور مضمون آفرینی نے ایسی شعریت پیدا کر دی ہے جس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

مومن خاں مومن کہتے ہیں کہ اے محبوب جب کوئی میرے پاس نہیں ہوتا اور میں تنہا ہوتا ہوں تو تم چلے آتے ہو اور یوں میری تنہائی تنہائی نہیں رہتی بلکہ ایسی انجمن کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو عاشق کا اولین مطمع نظر ہے۔

یہ شعر سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ لفظ گویا کا استعمال بہت ہی عجیب و غریب انداز میں ہوا ہے اور اس شعر میں یہ لفظ دو مختلف سطحوں پر معنی دیتا ہے۔ گویا کا ایک مطلب ظاہری طور پر ہے یعنی اے محبوب بظاہر تم میرے پاس آ جاتے ہو گویا کے دوسرے معنی ہم کلام ہونے کے ہیں یعنی جب میں تنہا ہوتا ہوں تو دراصل اپنے خیالات میں کھویا ہوا تم سے ہم کلام ہوتا ہوں اور تم سے سلسلۂ کلام جڑ جاتا ہے۔

شعر سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ محبوب تنہائی ملتے ہی شاعر کے پاس آ جاتا ہے جبکہ وہ حقیقت میں نہیں آتا اور یہ صرف شاعر کے تخیل کا کمال ہے کہ وہ اپنے طور پر ایک ایسی محفل سجا لیتا ہے جس میں محبوب موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ جب دوسرے لوگ موجود ہوں تو شاعر کو اُن سے مصروفِ گفتگو رہنا پڑتا ہے لیکن جیسے ہی تنہائی ملتی ہے شاعر کے خیالات میں ایک بزم آراستہ ہو جاتی ہے اور یہ چیز شاعر کی شدید محبت کو ظاہر کرتی ہے۔

بہر حال چند لفظوں میں مومن خان مومن نے جو مضمون پیدا کیا ہے اس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا معجزہ کر دکھایا ہے اور دراصل یہی کمالِ فن ہے۔

شعر نمبر ۸: حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر　　　　ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

تشریح مومن کہتے ہیں کہ محبوب کے فراق میں جو کچھ میرے دل پر بیت رہی ہے، وہ میں محبوب کو لکھنا چاہتا ہوں تاکہ اُسے میری حالت کا اندازہ ہو اور وہ مجھ پر مہربانی کرتے ہوئے میری تکالیف کو ختم کر دے لیکن لکھنے کے لئے ہاتھ کی فراغت ضروری ہے تاکہ قلم تھاما اور لکھا جا سکے جبکہ میرے ساتھ صورت یہ ہے کہ ہجر و فراق کے صدموں کے باعث مجھے اپنا بے قرار و بے تاب دل سنبھالنا پڑ رہا ہے اور اس حالت میں ایسا تسلسل ہے کہ دل سے ہاتھ اُٹھایا نہیں جا سکتا۔ ایسے میں خط لکھنا اور محبوب کو اپنی حالت سے مطلع کرنے کا کام کیونکر انجام دے سکتا ہوں۔

شعر نمبر ۹: رحم کر خصم جان غیر نہ ہو! سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

تشریح اے محبوب! ہم تیرے سچے عاشق ہیں لہٰذا تو ہم پر جو ظلم بھی توڑتا ہے اور جو ستم بھی ڈھاتا ہے ہم شکایت کئے بغیر انتہائی صبر سے اُسے برداشت کرتے ہیں لیکن سب کا دل یعنی حوصلہ اور ظرف ایک جیسا نہیں ہو سکتا اور بہت سے لوگ ان مظالم کو برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ خاص طور پر رقیب تو ہرگز ان صدمات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں خواہ مخواہ اس کی جان چلی جائے گی۔ لہٰذا تو اس کی زندگی کا دشمن نہ بن اور رقیب کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کر۔

شعر نمبر ۱۰: دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو دست عاشق رسا نہیں ہوتا

میر ببر علی انیسؔ

سوانحی حالات میر ببر علی نام اور انیسؔ تخلص تھا۔ آپ میر خلیق کے بیٹے اور مشہور مثنوی "سحر البیان" کے خالق میر حسن کے پوتے تھے۔ اُن کے پردادا امیر ضاحک دہلی سے ہجرت کر کے فیض آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ انیسؔ ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والدِ گرامی، مولوی حیدر علی اور میر عباس کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ فنونِ سپہ گری اور شاہ سواری میں بھی ملکہ حاصل تھا مگر شاعری انہیں نسل در نسل ورثے میں ملی کیونکہ ان کے پردادا میر ضاحک کا شمار بھی دہلی کے استاد شعراء میں ہوتا تھا۔ اسی لئے وہ فخریہ کہتے ہیں کہ ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پشت ہے شبیرؔ کی مداحی میں

میر انیسؔ نے کم عمری میں ہی شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ فارسی اور اردو کے ہزاروں شعر ازبر تھے۔ شروع میں سلام کہتے اور والد سے اصلاح لیتے تھے۔ پہلے پہل حزیںؔ تخلص رکھا تھا مگر مشہور شاعر امام بخش ناسخؔ کے کہنے پر اسے ترک کر کے انیسؔ تخلص اختیار کیا۔ نہایت وضع دار، خوش طبع

اور خوش لباس تھے اور یہ روش انہوں نے زندگی بھر قائم رکھی۔ امراء اور رؤسا کی دربار داری پسند نہ تھی۔ نواب واجد علی شاہ کے عہد میں اپنی رباعیات اور مرثیہ نگاری کی وجہ سے اُن کی شہرت عروج پر تھی، اپنے ہم عصر مرزا دبیر کے ساتھ معاصرانہ چشمک تھی مگر وضع داری اور باہمی احترام کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ ۱۸۵۸ء میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد پٹنہ اور پھر ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد دکن کا سفر کیا اور دونوں جگہ نہایت قدردانی ہوئی۔ جس مجلس میں بھی انہیں مرثیہ پڑھنا ہوتا لوگوں کا جم غفیر داد دینے کے لئے موجود ہوتا۔ میر انیس نے ۱۸۷۴ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور اپنے مکان سے ملحقہ باغ واقع سبز منڈی میں دفن ہوئے۔

محاسنِ کلام

میر انیس بلاشبہ اردو مرثیہ نگاری میں بلند ترین مقام کے حامل ہیں اگرچہ انہوں نے غزلیں بھی کہیں، نظمیں، سلام اور رباعیات بھی یادگار چھوڑیں مگر جو شہرت اور مقبولیت انہیں مرثیہ کے میدان میں حاصل ہوئی وہ کسی دوسری صنفِ سخن کے حصے میں نہ آ سکی اور یہ حقیقت بھی ہے میر انیس کی بدولت، مرثیہ نگاری کو وہ عروج حاصل ہوا، وہ وسعت و شوکت حاصل ہوئی کہ بعد میں کوئی بھی مرثیہ گو شاعر اس میدان میں میر انیس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا۔ اُن کے مرثیے فصاحت و بلاغت، واقعات و جزئیات نگاری اور بہت سے دوسرے اوصاف کے حامل ہیں۔

فصاحت و بلاغت کے عمدہ نمونے میر انیس کے مراثی کے مطالعے سے اُن کے ہاں فصاحت و بلاغت کے نہایت عمدہ نمونے بکثرت ملتے ہیں انہیں شاعری چونکہ ورثے میں ملی تھی اس لئے لفظوں کے چناؤ اور انتخابات کی تربیت بھی گھٹی میں پڑی تھی۔ انہوں نے نامانوس اور ثقیل اور غریب لفظوں کے استعمال سے ہر طرف گریز کیا ہے بلکہ فصیح سے فصیح تر لفظ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اپنی کوشش میں ہمیشہ کامیاب بھی رہے ہیں۔

۱ے طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

۲ے کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

۳ے تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں
قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

۴ے ذرّے کی چمک مہرِ منور سے ملا دوں
کانٹوں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں!
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

روزمرّہ و محاورہ کا استعمال

روزمرّہ اگرچہ فصاحت و بلاغت کا ہی ایک حصہ ہے مگر عام طور پر اسے ایک جداگانہ وصف شمار کیا جاتا ہے۔ البتہ روزمرّہ اور محاورہ کا فصیح ہونا لازمی ہے۔ میر انیس کے کلام میں روزمرّہ اور محاورہ کا استعمال کثرت سے ہے اور اس پر ناز کرتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں۔

~ مرغانِ خوش الحانِ چمن بولیں کیا ۔۔۔ مر جاتے ہیں سن کے روزمرّہ میرا

روزمرّہ اور محاورہ کے برمحل اور فصیح استعمال کی مثالیں انیسؔ کے مراثی اور رباعیات میں بھری پڑی ہیں۔

۱۔ تعریف کریں ڈر کے تو خورسند نہ ہونا ۔۔۔ اعدا سے کسی بات میں تم بند نہ ہونا

۲۔ صدقے کئے فرزند پھوپھی سوگ نشیں ہے ۔۔۔ سمجھیں تو مرا حق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

۳۔ کس کی مجال ہے جو کہے گا یہ کیا کیا ۔۔۔ بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا

واقعات کا بیاں

مولانا شبلی نعمانی کے بقول "واقعات کے بیان میں، بلاغت کا ایک بڑا ضروری اصول یہ ہے کہ کہیں سے سلسلۂ کلام ٹوٹنے نہ پائے" میر انیس کے اکثر مرثیے بہت سے واقعات پر مشتمل ہیں یہاں تک کہ اگر اُن کا الگ الگ جائزہ لیا جائے تو وہ جداگانہ مرثیہ نظر آئے گا۔ لیکن میر انیس کے بیاں کے تسلسل کا کمال ہے کہ یہ مختلف واقعات بھی زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہیں اور وحدتِ مضمون کا تاثر دیتے ہیں۔ مثلاً انیسؔ حر کے مرثیے میں حر کی مدح، امامِ عالی مقام اور اہلِ بیت کا میدان میں اترنا، فریقین کی تیاریاں، حضرت امام حسینؓ کا وعظ، حُر کا امام کی طرف ہونا، حضرت کا بزرگانہ استقبال، حر کی عفو خواہی اور حضرت امام حسینؓ کا عفو و درگزر، حُر کا جنگ کی اجازت طلب کرنا اور میدان میں جا کر شہید ہو جانا، مرتے وقت حضرت امام حسینؓ کا حُر کے پاس جانا اور نزع کی گفتگو —— یہ مرثیہ بہت بڑا ہے اور ہر واقعہ کو مرثیہ کی روایتی طوالت سے لکھا گیا ہے مگر یہ تمام واقعات مجموعی تاثر کے اعتبار سے وحدتِ فکر کا تاثر قائم رکھتے ہیں۔

منظر نگاری

منظر نگاری انیسؔ کے مرثیوں کا ایک نمایاں وصف ہے۔ خاص طور پر مختلف مراثی کی تمہید میں میر انیس نے منظر نگاری کے نہایت اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔ اُن کا حسنِ بیاں، اُنکے الفاظ کا چناؤ اور پھر تمام تر شعری قرینوں کا برمحل استعمال اُن کے اشعار میں مناظر کی ہو بہو تصویریں پیش کرتا ہے اور اُن کی منظر نگاری کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ صبح کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

~ وہ سرخیٔ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار ۔۔۔ وہ بار ور درخت، وہ صحرا، وہ سبزہ زار

~ شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار ۔۔۔ پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

ندرتِ تشبیہ و استعارہ

انیس کے کلام میں جا بجا اچھوتی اور نادر تشبیہات اور خوبصورت استعارے استعمال ہوئے ہیں جن سے اُن کے مراثیوں میں حسنِ لفظی و حسنِ معنی کی صفات اور بھی نمایاں ہو گئی ہیں۔ پھر میر انیس کی مرکب تشبیہات کی اردو شاعری میں نظیر نہیں ملتی۔

~ یوں برچھیاں تھیں چاروں طرف اُس جناب کے - جیسے کہ کرنیں پھوٹتی ہیں آفتاب سے
~ مقتل میں کیا ہجوم تھا اُس نورِ عین پر! - پروانے گر رہے تھے چراغِ حسین پر
~ کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا - تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
~ گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے - پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

صنائع و بدائع

میر کے زمانے میں شاعری کا کمال تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع اور مناسباتِ لفظی کے استعمال کو خیال کیا جاتا تھا۔ نہ صرف زمانی رجحان بلکہ میلانِ طبع کی بدولت میر انیس نے اپنے کلام میں لفظی رعایتوں اور صنائع و بدائع کو اس حسن و خوبی سے برتا ہے کہ کلام کی اصل خوبی یعنی برجستگی، صفائی اور سادگی کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

~ یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں - چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
~ آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں - مرجھا کر گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں

دکھلائے طور، بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

~ پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی - ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی

شاعری جذبوں کا اظہار اور محسوسات کی عکاسی کا نام ہے اور میر انیس کا اصلی جوہر یہیں کھلتا ہے۔ اُن کے مرثیوں میں انسانی جذبوں پر حقیقت پسندانہ اظہار اور احساسات کی خوبصورت عکاسی نظر آتی ہے۔ اُن کا کمالِ فن یہ ہے کہ جس جگہ جس چیز کو لیا ہے اُس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

~ منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بصد غم - چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ مرتے ہم
ماں کہتی تھی مختار ہیں بی بی شہِ عالم - میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہے اس دم

وہ درد ہے جس درد سے چارا نہیں صغراؑ
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغراؑ

حضرت علی اکبرؓ کی شہادت پر حضرت امام حسینؓ کے جذبات کچھ یوں بیان کئے ہیں:۔

کچھ سوجھتا نہیں ہے کدھر جاؤں کیا کروں ۔ اے نورِ چشم تجھ کو کہاں پاؤں کیا کروں!
مضطر ہے جان و دل کسے سمجھاؤں کیا کروں ۔ کیونکر پسر کو ڈھونڈھ کے ہیں لاؤں کیا کروں
پایا تھا مدتوں میں جسے خاک چھان کر
وہ لعل ہم نے کھو دیا جنگل میں آن کر

رزمیہ شاعری میر انیس نے اپنے مرثیوں کے ذریعے اردو میں رزمیہ شاعری کی کمی کو بہت حد تک پورا کیا ہے۔ انیس کے مرثیوں کا وہ حصہ جہاں واقعات جنگ کا بیان ہوتا ہے اُس میں وہ رزمیہ شاعری کے تمام تر لوازمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے لڑائی کی تیاری، معرکے کا زور، تلواروں کی چمک دمک، ہتھیاروں کی جھنکار، شور و غل، ٹاپوں کی آواز، نقاروں کی گونج اور نقیبوں کی صداؤں کا منظر بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں چمکتی ہیں ۔ نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں
نیزے تلے ہوئے ہیں، سنانیں چمکتی ہیں ۔ ترکش کھلے ہوئے ہیں، کمانیں کڑکتی ہیں
سنگین دلوں نے ہاتھوں میں پتھر اُٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرزِ گراں، سر اُٹھائے ہیں

مبالغہ آمیزی اگرچہ قصیدہ اور مرثیہ میں شعراء مبالغہ سے کام لیتے ہوئے نفسِ مضمون میں رنگ آمیزی کرتے رہے ہیں۔ مگر مبالغہ اسی وقت تک اچھا لگتا ہے جب یہ تبلیغ اور اغراق کی حدود کو پار نہ کرے کیونکہ مبالغے میں غلو ہمیشہ ناپسندیدہ خیال کیا گیا ہے۔ میر انیس کے ہاں بھی مبالغے کی یہ تینوں صورتیں موجود ہیں وہ تلوار اور گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے اور واقعاتِ جنگ میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔

وہ لُو، وہ آفتاب کی حدت، وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا!
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا!
پانی تھا آگ، گرمیٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آتی، کباب تھی

انیس کی رباعیات صوفیانہ، اخلاقی اور دنیا کی بے ثباتی کے مضامین کے اظہار کے لئے سب سے موزوں صنفِ سخن رباعی خیال کی جاتی رہی ہے۔ مراثی کے علاوہ میر انیس کی رباعیات کا بھی بڑا دفتر ہے جن میں سے بیشتر میں کوئی نہ کوئی اخلاقی مضمون باندھا گیا ہے۔ البتہ بعض رباعیات مولانا شبلی کے بقول محض مضمون بندی یا کسی صنعت گری کی حامل ہیں۔

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے! — رخ سب سے پھرا کے، منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر — میں نے بھی تو جاں دے کے پایا ہے تجھے
مرتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے، صدا دیتا ہے

تشریح عاشق کو محبوب سے ہمیشہ یہ شکایت ہوتی ہے کہ محبت و مہربانی کے ضمن میں محبوب کا دامن بہت تنگ ہے اور اُس کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں۔ لیکن مومن کہتے ہیں کہ بالفرض محبوب کا دامن دراز بھی ہوں اور اُس کی عنایات و نوازشات کی بارش بھی برس رہی ہو تو بھی عاشق ان سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ خود عاشق کا ہاتھ محبوب کے دامن تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔

مومن کے نزدیک یہ نارسائی غالباً ادب و احترام کے اُس جذبے کی وجہ سے ہے جو ہر عاشق کے دل میں محبوب کے لئے ہوتا ہے اور جس کے باعث میر کے بقول غبارِ میر بھی محبوب سے دور بیٹھتا ہے۔

شعر نمبر ۱۱: چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

تشریح ہجر و فراق میں دل کو جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں ہم جانتے ہیں کہ اُن کا علاج صرف اور صرف صبر ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جب تک تم نہیں ملتے اُس وقت تک دل کو صبر و قرار کی دولت حاصل نہیں ہوتی۔ یعنی دل کا علاج صبر اور صبر کے لئے تمہارا وصل ضروری ہے۔

شعر نمبر ۱۲: کیوں سنے عرضِ مضطرِ اے مومن — صنم آخر خدا نہیں ہوتا

تشریح مومن کہتے ہیں کہ تکلیف اور مصیبت کے وقت انسان جو دعا بھی مانگے اللہ تعالیٰ قبول کر لیتے ہیں لیکن ہمارا محبوب ہم بے چین و بے قرار لوگوں کے التماس پر توجہ نہیں دیتا اور آخر کیوں سنے خدا اور محبوب میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے اور وہ فرق یہی ہے کہ اللہ غمزدوں کی فریاد سن لیتا ہے لیکن محبوب نہیں سنتا۔

انتخاب مراثی نمبر ا

مرثیہ مرثیہ لفظ رثا سے ہے جس کے معنی کسی کی موت پر اظہار افسوس اور ماتم کرنے کے ہیں۔ آج کل مرثیہ کی دو اقسام رائج ہیں یعنی شخصی مرثیہ اور روایتی مرثیہ۔ شخصی مرثیہ میں کسی کو بھی موضوع بنایا جا سکتا ہے نیز اس کے لئے کوئی خاص ہیئت بھی مقرر نہیں جبکہ روایتی مرثیہ میں صرف میدانِ کربلا کے شہدا کی شہادت کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ابتداً روایتی مرثیے کے لئے بھی کوئی خاص ہیئت مقرر نہیں تھی لیکن بعد ازاں مرثیہ اور مسدس لازم و ملزوم قرار پا گئے اور اب یہ صنف اسی مقررہ ہیئت میں لکھی جاتی ہے۔ مقررہ ہیئت کے علاوہ مرثیے کے بعض فنی اجزاء بھی ہوتے ہیں مثلاً چہرہ، کربلا کی طرف آغاز سفر، حر سے ملاقات، کربلا میں آمد، ابنِ زیاد کی فوجوں سے مقابلہ۔ رجز، جنگ، شہادت اور بین وغیرہ۔ میر انیس کا قلم ان سبھی فنی اجزاء کے تقاضے نہایت کامیابی سے پورے کرتا ہے۔ فصاحت و بلاغت، منظر کشی، جذبات نگاری بے شمار لفظوں کا برمحل استعمال اس کے علاوہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرثیے بہت سے شعراء نے کہے لیکن اس بات میں جو کامیابی میر انیس کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔

حل لغات ارنی گوئے اوج طور۔ کوہِ طور کی بلندی پر اللہ تعالیٰ کے جلوے دیکھنے کی درخواست کرنے والا یعنی حضرت موسیٰؑ: پیدا۔ ظاہر۔ نمایاں۔ عیاں: قدرت۔ طاقت، زور، اختیار: ظہور۔ کسی چیز کا ظاہر ہونا، نمایاں ہونا: تسبیح خواں۔ تسبیح پڑھنے والے، اللہ کی تعریف کرنے والے: طیور۔ طائر کی جمع، پرندے: خجل۔ شرمندہ، نادم: مینو اساس۔ اپنی اصل کے اعتبار سے جنت جیسا: باس۔ خوشبو: لہک۔ لہلہاہٹ، سبزے کی حرکت: اطلس۔ ایک قسم کا ریشمی چمکدار کپڑا: زنگاری فلک۔ نیلے رنگ کا آسمان: برگ۔ پتی: جھلک۔ آب و تاب، رونق، روشنی، پرتو، عکس: یکتا۔ بے بدل۔ بے مثال: نثار۔ قربان: جواہر نگار۔ جن پر موتی جڑے ہوئے ہوں: صنعت۔ ہنر، دستکاری: آفریدگار۔ پیدا کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ: ورق۔ صفحہ، پتہ: صنعتِ ترصیع۔ علم بدیع کی ایک صورت جس میں مصرعوں کے الفاظ بالترتیب ہم وزن اور ہم قافیہ ہوتے ہیں: آشکار۔ ظاہر۔ عیاں: عاجز۔ مجبور، بے بس: فکرت۔ تخیل۔ دھیان، سوچ بچار کی صلاحیت: عباد۔ عبد کی جمع معنی بندے: مینا۔ مرصع کاری۔ جڑاؤ کا کام، سجاوٹ: مینو سواد۔ بہشت جیسا ذائقہ رکھنے والے: دراج، کبک، تیہو۔ مختلف پرندوں کے نام: طاؤس۔ مور: مرغان۔ پرندے: نوا۔ آواز، نغمہ: تھالے۔ وہ زمین جو کسی پودے اور درخت کی جڑ کے پاس ہوتی ہے: سبد۔ ٹوکری: گہر ہائے آب دار۔ چمک دمک رکھنے والے موتی: بالا۔ اوپر: نخل۔ درخت:

زہر۔ پودے، نخل: کٹورے۔ پیالے: قمری۔ ایک پرندے کا نام جو فاختہ سے مماثلت رکھتا ہے اور جسے سرد کا عاشق تصور کیا جاتا ہے: نالۂ حق سرۂ۔ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کی آواز: سُبحان ربنا۔ اللہ کی حمد، اے اللہ تو تمام عیوب سے پاک ہے: علی العموم۔ عام طور پر: رب علا۔ سب سے اعلیٰ و برتر پالنے والا، اللہ تعالیٰ: حمد۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف: نوکِ زباں ہونا۔ یاد ہونا، حفظ ہونا: دانہ کش۔ خوراک مہیا کرنے والا۔ خدا: رزاق۔ رزق دینے والا، خدا: یا حیٌ۔ اے ہمیشہ زندہ رہنے والے۔ اللہ تعالیٰ: یا قدیر۔ اے بہت زیادہ اختیار رکھنے والے، اللہ تعالیٰ: یا قدیر۔ اے بہت زیادہ اختیار رکھنے والے، اللہ تعالیٰ: تہلیل۔ کلمہ طیبہ کے پہلے حصّے کا ورد کرنا: کردگار۔ خالق، اللہ تعالیٰ: ہونک۔ شیر کی دھاڑ: کچھار۔ جنگلوں پہاڑوں میں شیر کے رہنے کی جگہ: ریاض۔ باغ، گلشن: خلد۔ جنت: عرض۔ چوڑائی: طول۔ لمبائی: ماہ عزا۔ محرم کا مہینہ: عشرۂ اوّل۔ مہینے کے پہلے دس دن: کاشانہ۔ گھر: بتول۔ حضرت فاطمہؓ:

بند نمبر ۱: وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

تشریح میر انیس نے میدان کربلا میں صبح کے وقت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے کہ صبح کا وقت تھا لیکن ابھی تمام ستارے غروب نہیں ہوئے تھے اور اُن کا پرتو زمین پر پڑ رہا تھا جس کے باعث ہر طرف نور اور روشنی دکھائی دیتی تھی اور یہ ایسا نور تھا کہ اگر حضرت موسیٰؑ جو کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کے نور کا نظارہ کرنے گئے تھے، اس نور کو دیکھتے تو یقیناً اس کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جاتے۔ اس وقت پھولوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کے اختیار کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ تمام میدان میں اُگے ہوئے درختوں پر پرندے بیٹھے اللہ تعالیٰ کی حمد پڑھ رہے تھے۔

یہ جنت نظیر وادی ایسی تھی کہ اِس کے سامنے باغ اور گلستان بھی شرمندہ و نادم تھے اس لئے کہ سارا جنگل پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

بند نمبر ۲: ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

تشریح میدانِ کربلا میں صبح کے وقت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے تمام سرسبز شاداب پودے اور سبزہ لہلہا رہے تھے اور زمین پر ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ نیلے رنگ کے قیمتی کپڑے کی مانند نظر آنے والا آسمان بھی اس منظر کے سامنے نادم و خجل تھا۔ ہوا کے باعث درخت جھوم رہے تھے اور پھولوں کی خوشبو نے سارے جنگل کو مہکا رکھا تھا جبکہ پھولوں کی ایک ایک پتی پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔

اور ان قطروں کو دیکھئے تو ان کی چمک دمک کے سامنے ہیروں کی کوئی حیثیت نہ تھی اور اس میں پائے جانے والے بے مثال موتیوں کو ان پر قربان کیا جا سکتا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ہر درخت کے پتوں کو ہیروں جواہرات سے مزین کیا گیا ہے۔

بند نمبر ۳: قربان صنعت قلم آفرید گار   تھی ہر ورق سے صنعت ترصیع آشکار

عاجز ہے فکرت شعرائے ہنر شعار   ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار

عالم تھا محو قدرت رب عباد پر

مینا کیا تھا وادیٔ مینو سواد پر

تشریح اللہ تعالیٰ کے قلم کی صناعی اور ہنرمندی پر قربان ہونے کو جی چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے درخت کے ایک ایک پتے پر مرصع کاری کی گئی ہو۔ کسی ہنرمند شاعر کا تخیل بھی اس نوعیت کی صنعتوں کو پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یوں بھی اللہ تعالیٰ کی ہنرمندی کا مقابلہ انسان کی عقل کے بس میں کہاں ہے!

ساری دنیا اپنے بندوں کو پالنے والے اللہ تعالیٰ کے اختیار اور طاقت کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے جنت کا سا دلفریب رکھنے والی وادی کی ایک ایک شے پر جڑاؤ کا کام کیا ہے۔

بند نمبر ۴: وہ نور اور وہ دشت سہانا سادہ فضا   دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا

وہ جوش گل و نالۂ مرغان خوش نوا   سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا!

پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے

تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

تشریح میر انیس کہتے ہیں کہ صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ایسے میں کربلا کا صحرا اور وہاں کی فضا بہت ہی خوب لگ رہی تھی۔ صحرا میں مختلف پرندوں مثلاً دراج، کبک، تیہو اور مور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چاروں طرف پھول کھلے ہوئے تھے جن کے آس پاس خوش آواز پرندے

نغمے گانے میں مصروف تھے ۔ صبح کے وقت چلنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے زیرِ اثر ایسی خنکی اور سردی محسوس ہوتی تھی جو جگر تک اثر انداز ہو رہی تھی ۔

صحرا میں اُگنے والے سرسبز و شاداب درخت پھولوں کی بہتات کی وجہ سے سرخ نظر آ رہے تھے اور درختوں کے تنے کے آس پاس کی زمین نے پھولوں کے گرنے اور پھولوں کی کثرت کی وجہ سے پھول بیچنے والوں کی ٹوکری کی حیثیت اختیار کر لی تھی ۔ یعنی جہاں بہت سے پھول ابھی درختوں پر موجود تھے وہاں بہت سے پھول درختوں سے جھڑ بھی چکے تھے ۔

بند نمبر ۵ ۔ وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار | پھولوں پر جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار | بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے زہرِ گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

تشریح اس صحرا میں صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور ہر طرف پھیلے ہوئے سبزے نے متاثر کن کیفیت پیدا کر رکھی تھی ۔ پھولوں کی پتیوں پر اعلیٰ درجے کی آب و تاب اور چمک دمک رکھنے والے موتیوں کی طرح شبنم کے قطرے نظر آ رہے تھے ۔ ہوا کے باعث درختوں کی شاخیں جھوم رہی تھی اور کبھی نیچے کو جاتی تھیں اور کبھی پھر اوپر اٹھتی تھیں ۔ درختوں کی یہ حالت یہ تھی کہ اگر کسی شاخ پر ایک پھول کھلا ہے تو اس گِرد گِرد ہزاروں کی تعداد میں بلبل موجود تھے ۔

اور چونکہ حضرت فاطمہؓ کے باغ کے پودے یعنی حضرت امام حسینؑ اور اُن کے عزیز و اقارب یزید کی ستم گر فوج کی طرف سے پانی بند کر دینے کے باعث پیاسے تھے لہٰذا شبنم نے انہیں پانی مہیا کرنے کے لئے گلاب کے پھولوں کے پیالوں کو پانی سے بھر دیا تھا ۔ یہ بند تشبیہات و استعارات اور حسنِ تعلیل کے باعث بہت خوبصورت ہے ۔

بند نمبر ۶ ۔ وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم | کو کو کا شور نالۂ حق سرہٗ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم | جاری تھے وہ جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِ علا کی حمد
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی حمد

تشریح قمریاں جو سرو کی عاشق تصور کی جاتی ہیں ، سرو کے پودوں پر ہجوم کی صورت میں موجود تھیں ۔ ان میں سے کوئی کو کو کا شور بلند کر رہی تھی اور کسی کی زبان پر اللہ کی حمد و ثنا تھی عام طور پر یہ آواز سنائی دے رہی تھی کہ اے اللہ تیری ذات ہر طرح کے معائب سے پاک ہے ۔ غرضیکہ ان پرندوں کی عبادات کے جو طریقے تھے وہ اُن کے مطابق مصروفِ عبادت تھے ۔

اعلیٰ و برتر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تعریف و توصیف میں صرف پھول ہی مصروف نہیں تھے بلکہ یوں لگتا تھا جیسے اللہ تعالیٰ کی تعریف، و توصیف کا سبق کانٹوں کو بھی زبانی یاد ہے جسے وہ کسی کی مدد کے بغیر دہرا رہے ہیں اور اپنے طریقے سے مصروفِ عبادت ہیں۔

بند نمبر۷: چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار — اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار

یا حی یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار — تہلیل تھی کہیں کہیں تسبیح کردگار!

طائر ہوا میں محو ہرن سبزہ زار میں

جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

تشریح: چیونٹی بھی اپنے انداز میں مصروفِ عبادت تھی اور اپنے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کہتی تھی کہ خوراک مہیا کرنے اور رزق عطا کرنے والے خدا میں تیرے قربان جاؤں۔ جنگل و صحرا میں جس طرف سنیے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان ہو رہی تھی کوئی یا حیّ کہہ کر اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مصروف تھا اور کوئی یا قدیر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اعتراف کر رہا تھا۔ کہیں کلمہ طیبہ کے پہلے حصے کا ورد جاری تھا اور کوئی اللہ تعالیٰ کی اس صفت کی تعریف میں رطب اللسان تھا جس کے تحت یہ ساری کائنات وجود میں آئی۔

پرندے ہوا میں اُڑتے ہوئے مصروفِ عبادت تھے اور ہرن سبزہ زاروں میں یہ فرض ادا کر رہے تھے جبکہ شیر جو اپنی اپنی کچھار میں تھے، وہاں بیٹھے دھاڑ رہے تھے اور اپنے انداز میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف کر رہے تھے۔

بند نمبر۸: کانٹوں میں اک طرف تھے ریاضِ نبیؐ کے پھول — خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول

دنیا کی زیب و زینت کا شانۂ بتولؓ — وہ باغ تھا لگائے تھے خود جسے رسولؐ

ماہِ عزا کے عشرۂ اول میں کٹ گیا!

وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں کٹ گیا

تشریح: اس صحرا کے خارزار میں سب سے الگ تھلگ ایک طرح آنحضرتؐ کے باغ کے سرسبز و شاداب پھول یعنی حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھی موجود تھے۔ یہ ایسے پھول تھے جن کی خوشبو سے سارے کا سارا جنگل جنت کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ بے شک حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے گھرانے کے یہ لوگ اس دنیا کی آرائش اور حسن و جمال کا سبب تھے۔ یہ ایسا باغ تھا جسے آنحضرتؐ نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا، پالا پوسا اور نہایت محبت سے پروان چڑھایا تھا۔

لیکن افسوس کہ اس گلستان کے تمام پودے اور اس گھرانے کے جملہ افراد ماہِ محرم کے پہلے دس

دونوں میں کربلا کے میدان میں شہید ہو گئے اور دین سے بغاوت کرنے والوں نے ان صاحب تکریم لوگوں کو جنگل میں شہید کر دیا۔

واضح ہو کہ اس بند کے پہلے مصرع میں لفظ "کانٹوں میں ہونا" حقیقی اور مجازی دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مجازی طور پر اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت امام حسینؓ اور اُن کے ساتھی مصیبت میں گرفتار تھے اور یزیدی فوج نے انھیں گھیر رکھا تھا۔

انتخاب مراثی نمبر۲

حل لغات برچھی۔ بلم، نیزہ، چھوٹا بھالا، قدیم زمانے میں آلاتِ حرب میں شامل تھا؛ تولنا۔ جانچنا؛ غول۔ انبوہ، گروہ، لشکر۔ بڑے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی بڑے لوگوں کا اجتماع؛ خوں خوار۔ خون پینے والا۔ ظالم، جلاد؛ اسوار۔ سوار، گھوڑوں والے سپاہی؛ چلہ۔ کمان کی تانت؛ کماندار۔ کمانوں اور تیروں سے لیس فوجی؛ شہ۔ بادشاہ، حضرت امام حسینؓ کی طرف اشارہ ہے؛ زنہار۔ تاکید کے لئے بولتے ہیں، ہرگز، بالکل؛ اسدِ حق۔ اللہ کا شیر، اشارہ ہے حضرت علیؓ کی طرف جنھیں شیرِ خدا کہا جاتا ہے؛ دستور۔ قاعدہ، آئین، طریقہ؛ نبی زادہ۔ نبی کی اولاد؛ سبقت۔ پہل، آغاز؛ سخن۔ بات؛ اعدا۔ دشمن؛ حجت۔ دلیل، تکرار، بحث؛ پسر۔ بیٹا؛ مصحفِ ناطق۔ بولتا ہوا قرآن؛ کلام۔ گفتگو، بات؛ موقوف کرنا، بند کرنا؛ قرنا۔ سینگ کا بگل، نرسنگا؛ خروش۔ شور وغل؛ طبل۔ بڑا ڈھول؛ وغا۔ جنگ؛ جلاجل۔ جھانجھ، دف؛ بجا نہ ہونا۔ درست نہ ہونا؛ سرود۔ موسیقی؛ ناساز۔ ناموافق، جو راس نہ ہو؛ ٹرمہ آواز۔ وہ چیز جو آواز بیٹھ جانے کا باعث ہو اور جس کی وجہ سے آواز نہ نکلے؛ غلغلہ۔ شور وغل؛ گہربار۔ موتی برسانے والا یہاں مراد ہے گفتگو کرنا؛ صف کشی۔ جنگ کرنا، حملہ کرنا؛ ناہنجار۔ بدچلن، کمینہ، بدذات؛ فرق۔ بندش؛ طور۔ طریقہ؛ خطا۔ غلطی؛ غربت، پردیس؛ مرقع۔ تصویروں کی کتاب مراد ہے دنیا؛ اُلٹ جانا۔ اوندھا ہو جانا، تباہ و برباد ہو جانا؛ سردار۔ افسر، حاکم؛ خلدِ بریں۔ جنت، بہشت؛ دودش۔ کندھا؛ مکین۔ مکان میں رہنے والا، صاحبِ خانہ؛ انگشت۔ انگوٹھی؛ پیغمبرِ خاتم۔ وہ پیغمبرؐ جن پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوا یعنی آنحضرتؐ؛ نگیں۔ نگ، نگینہ؛ نہاں۔ پوشیدہ؛ محفلِ عالمِ امکان۔ کائنات، دنیا؛ قلزم۔ سمندر؛ عز و شرف۔ عزت اور بزرگی؛ درِ شہوار۔ بادشاہوں کے لائق موتی؛ زیرِ نگیں۔ مفتوح، مملکت میں شامل، زیرِ حکومت؛ جہاندار۔ بادشاہ؛ ورثہ۔ میراث، ترکہ؛ مختار۔ اختیار رکھنے والا؛ تبرک۔ برکت حاصل کرنے کی مقدس اشیاء۔ بزرگانِ دین کی یادگاریں؛ سرکار۔ بادشاہی، شرفاء اور امرا کا گھر؛ قبا۔ ایک قسم کا لباس؛

دستار۔ پگڑی : زرہ۔ جنگ کے وقت پہنے جانے والا لوہے کا لباس : سینہ فگار۔ جس کا سینہ زخمی ہو، مصیبت زدہ، زخم اٹھایا ہوا : بر۔ جنگل : چار آئینہ۔ ایک طرح کا جنگی لباس : جوہر دار۔ جس پر ہیرے جواہرات لگے ہوں : راہوار۔ گھوڑا : خود۔ جنگ میں سر پہ پہننے والی فولادی ٹوپی : تیغ دو سر۔ دو دھاری تلوار : جری۔ جرأت مند، بہادر : سپر۔ ڈھال

بند نمبر ا: برچھیاں تول کے ہر غول سے خونخوار بڑھے — نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے

تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کماندار بڑھے — بولے شہ یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے

اسد حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں

میں نبی زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

تشریح: میر انیس جنگ کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یزیدی افواج کے گردہوں میں سے بہت سے ظالم نیزے اور برچھیاں جانچ کر اور حضرت امام حسینؓ کے رفقاء کو نشانے پرلے کر آگے بڑھے۔ اس کے ساتھ ہی جو لوگ گھوڑوں پر سوار تھے انہوں نے اپنے نیزے سنبھالے اور آگے بڑھے۔ جبکہ وہ لوگ جن کے پاس تیر کمانیں تھیں انھوں نے تیروں کو کمانوں کی تانتوں میں لگایا اور حملہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن حضرت امام حسینؓ نے فرمایا کہ بے شک دشمن حملے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں لیکن میرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی مجاہد ہرگز آگے نہ بڑھے۔

اس لئے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے خاندان کا یہ دستور نہیں ہے۔ اور میں آنحضرت صلی اللہ کا نواسہ ہوں اور اُن کے خاندان سے متعلق ہوں۔ میں ظلم کے جواب میں تلوار اٹھانے پر مجبور ہوں لیکن جنگ میں پہل کرنا مجھے قبول نہیں۔

بند نمبر ۲: یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام — اے سپاہ عرب و روم و رے و کوفہ و شام

تم پہ کرتا ہے حسین آخری حجت کو تمام — پسر مصحف ناطق ہوں سنو میرا کلام

سخن حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو

شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

تشریح: حضرت امام حسینؓ نے اپنے ساتھیوں سے یہ بات کہی اور پھر وہ اپنے دشمنوں سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے فرمایا کہ اے عرب، روم، رے، کوفہ اور شام کے علاقے سے آنے والے سپاہیو! اب حسینؓ جنگ کے خاتمے اور امن کو بحال رکھنے کی آخری کوشش کرتا ہے اور اسی سلسلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں بولتے ہوئے قرآن یعنی آنحضرتؐ کی اولاد سے ہوں لہٰذا میری گفتگو ذرا غور اور توجہ سے سنو۔

میں سچی بات کہنے جا رہا ہوں اسلئے میری بات پر توجہ کرو اور اگر مناسب سمجھو تو تم جنگ سے پہلے اپنے فوجیوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیئے جو باجے بجا رہے ہو، وہ بند کر دو

بند نمبر ۳۔ یہ صدا سنتے ہی خود رک گیا قرنا کا خروش — ختم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش

ہو گئے جوڑے کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش — کیا بجاتے کہ بجاتے نہ کسی شخص کے ہوش

چھیڑنا ان کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا

رعب فرزند علی سرمۂ آواز ہوا

تشریح حضرت امام حسینؓ کی آواز سن کر بگل خود بخود خاموش ہو گیا۔ جنگ سے پہلے جو بڑا ڈھول بجایا جاتا تھا وہ بھی چپ ہو گیا، جلاجل اور دف بھی خاموش ہو گئے اور اصل میں یہ سارے آلاتِ موسیقی اس لئے خاموش ہو گئے کہ حضرتِ امام کی آواز کے رعب کی وجہ سے سب لوگوں کے ہوش و حواس مختل ہو گئے تھے۔

ایسے میں اُن کے لئے ساز بجانا اور مختلف آوازیں پیدا کرنا ممکن نہ رہا۔ دراصل حضرت امام کی آواز کے دبدبے سے سب آوازیں بیٹھ گئیں یعنی لوگ خاموش ہو گئے اور آلاتِ غنا چپ ہو گئے۔

بند نمبر ۴۔ کم ہوا غلغلۂ فوج ستم جب اک بار — یوں گہر بار ہوئے شہ کے لب گوہر بار

صف کشی کس پہ ہے اے سپہ ناہنجار — قتل سادات کی لشکر میں یہ کیسی ہے پکار

وطن آواروں پہ یہ فرق ہے کیوں پانی کا

کیا زمانے میں یہی طور ہے مہمانی کا

تشریح جب ظالموں کی فوج کا شور و غل اور ہنگامہ ختم ہوا تو حضرتِ امام حسینؑ کے موتی برسانے والے ہونٹوں نے یوں موتی برسائے یعنی آپ نے فرمایا کہ اے بدچلن اور بداطوار فوج کے سپاہیو! ذرا غور کرو کہ تم صف بندی کر کے کس شخصیت کے خلاف آمادۂ جنگ ہو؟ اور سیدوں کے کے گھرانے کے افراد کو قتل کرنے کے لئے تمہاری افواج کیا شور و غوغا کر رہی ہیں۔

وہ لوگ جو اپنے وطن سے دور اور پردیسی ہیں آخر اُن پر پانی کیوں بند کر دیا گیا ہے؟ ذرا اپنے عمل پر غور کرو تو پتا چلے گا کہ کیا دنیا میں مہمانوں کے ساتھ یہی سلوک اور برتاؤ کیا جاتا ہے۔

بند نمبر ۵۔ مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو! — تیر جوڑے ہیں جو مجھ پر تو خطا کرتے ہو

کیوں نبی زادے پہ غربت میں جفا کرتے ہو — دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم، بُرا کرتے ہو

شمع ایماں ہوں اگر سر میرا کٹ جائے گا

یہ مرقع ابھی اک دم میں الٹ جائے گا

تشریح ذرا غور کرو کہ دنیا میں اُسی کے ساتھ جنگ کی جاتی ہے جو خود بھی جنگ پر آمادہ ہو جبکہ میں لڑنا نہیں چاہتا تو تم میرے ساتھیوں کو کیوں قتل کرنا چاہتے ہو! بے شک تم لڑائی کے لئے اِس حد تک تیار ہو کہ تم نے اپنی کمانوں میں تیر تک لگا لئے ہیں اور اب صرف ان کے چھوڑے جانے کی دیر ہے لیکن میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تم غلطی پر ہو، ذرا غور کرو کہ نبیؐ کے نواسے پر پردیس میں ظلم ڈھانے کی کیا وجہ ہے یعنی واقعتاً کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ دیکھو اور غور کرو تو معلوم ہو گا کہ یہ ظلم اچھا نہیں ہے اور نہ اِسے کوئی اچھا کہے گا لہٰذا تمہاری روش اور تمہارا طریقہ غلط ہے۔

میں اس دنیا میں اِس شمع کی حیثیت رکھتا ہوں جس کے سبب ساری دنیا میں ایمان اور دینداری کا نور پھیل رہا ہے۔ اگر میں شہید ہو گیا تو یاد رکھو کہ یہ دنیا ایک پل میں تباہ و برباد ہو جائے گی اور اس کا سارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔

بند نمبر۶: میں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں — میں ہوں خالق کی قسم دوش محمدؐ کا مکیں!
میں ہوں انگشتر پیغمبر خاتم کا نگیں! — مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں
ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہو جائے

تشریح آنحضرتؐ کی ایک حدیث کے مطابق حضرت امام حسینؓ کو جنت میں جانے والے نوجوانوں کا سردار اور حاکم کہا گیا ہے۔ اس کے پیش نظر حضرت امام حسینؓ نے فرمایا کہ اے یزیدی افواج! میں جنت کے گلستان کے نوجوانوں کا حاکم اور افسر ہوں۔ یعنی جو توقیر مجھے عطا ہوئی ہے وہ کسی دوسرے شخص کے حصے میں نہیں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں وہ شخص ہوں جو بچپن میں آنحضرتؐ کے مبارک کندھوں پر بیٹھتا اور سوار ہوتا تھا۔ اور یہ توقیر بھی سوائے حضرت امام حسینؓ کے اور کسی شخص کے حصے میں نہیں آئی۔ میری مثال ایسے نگینے کی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی میں جڑا ہو۔ میں ایسا شخص ہوں جس کی بدولت زمین و آسمان روشن ہیں۔

اگر بالفرض مجھے شہید کر دیا جائے اور میرا نور دنیا کی آنکھوں سے چھپ جائے تو اس ساری دنیا میں اندھیرا چھا جائے گا۔

بند نمبر۷: قلزم عز و شرف کا دُرِ شہوار ہوں میں — سب جہاں زیر نگیں ہے وہ جہاندار ہوں میں
آج گو مصلحتاً بیکس و ناچار ہوں میں — وارثِ احمد مختار کا مختار ہوں میں
بخدا دولت ایماں اسی دربار میں ہے
سب بزرگوں کا تبرک مری سرکار میں ہے

تشریح میں عزت و بزرگی کے سمندر میں موجود بادشاہوں کے لائق موتی ہوں یعنی تمام عزت و بزرگی میرے گھرانے کے لیئے ہے۔ میں ایسا بادشاہ ہوں جس کی حکومت سارے زمانے اور ساری دنیا پر ہے اگرچہ آج مشیتِ خداوندی اور مصلحت کی بنا پر میں بے بس اور لاچار و مجبور ہوں لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ آنحضرتؐ نے اس دنیا میں دینِ اسلام اور اپنے تبرکات کی صورت میں جو ترکہ چھوڑا ہے میں اُس کا حقدار اور امین ہوں۔

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایمان کی دولت کا راز میرے گھرانے کی محبت اور عقیدت میں پوشیدہ ہے، اور آج تک جس قدر بزرگ گزرے ہیں اُن کے مقدس نشانات میرے پاس موجود ہیں۔

بند نمبر ۸ بوبر قبا کس کی ہے بتلا دیں کس کی دستار
یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار!
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جوہر دار
کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے، یہ تیغ دو سر کس ہے کی
کس جری کی یہ کماں ہے، یہ سپر کس کی ہے

تشریح آپ نے اپنے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو اور بتاؤ کہ جو لباس اور جو پگڑی میں نے پہن رکھی ہے یہ کس کی ہے؟ یعنی یہ میری نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق آنحضرتؐ یا حضرت علی المرتضیٰؓ سے ہے۔ مجھ مصیبت زدہ شخص نے جو زرہ پہن رکھی ہے وہ بھی اپنی بزرگانِ سلف کی ہے۔ اور کربلا کے اس جنگل میں موتیوں سے سجایا ہوا یہ جنگل لباس، جو میں نے زیب تن کیا ہوا ہے، کس کا ہے اور جس گھوڑے پر میں سوار ہوں یہ گھوڑا کس کا ہے۔ یعنی یہ سب چیزیں انہی بزرگوں کی نشانیاں ہیں۔

میں نے سر پر جو خود سے رکھا ہے اور ہاتھ میں جو دو دھاری تلوار لے رکھی ہے یہ کس کی ملکیت ہے اور میرے پاس جو کمان اور ڈھال ہے وہ کس سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی یہ سب چیزیں آنحضرتؐ یا علی المرتضیٰؓ سے تعلق رکھتی ہیں۔

انتخاب مراثی نمبر ۳

حلِ لغات سوختہ۔ جلا ہوا۔ بمعنی دردمند؛ دھڑا دھڑی۔ لوٹ مار، سب مال لے جانا؛ بین۔ عورتوں کا مردے کے اوصاف دردناک انداز میں بیان کر کے رونا اور ماتم کرنا؛ لال۔ لڑکا، پیارا بیٹا؛ صدقے جانا۔ واری جانا، قربان؛ زانو۔ ران، پہلو، گھٹنا؛ تیغ۔ تلوار؛ سپر۔ ڈھال؛ آفت۔ مصیبت؛ آنچ آنا۔ دُکھ پہنچنا، تکلیف میں مبتلا ہونا؛ رن۔

میدانِ جنگ، جنگ : قرار۔ سکون : عمامہ۔ پگڑی، دستار : چونکو۔ ہوشیار ہونا، جاگنا :
نخل۔ پودا : ثمر۔ پھل : برگ۔ پتے : خوابِ مرگ۔ موت کی نیند، موت : سراغ۔ نشان، کھوج : اجل۔ موت : لحد۔ قبر : فگار۔ زخمی : تزک۔ ترتیب، انتظام، شان و شوکت :
سعید۔ خوش قسمت، کامیاب و کامران : غربت۔ پردیس : تشنگی۔ پیاس : صعوبت۔ مصیبت :
میان۔ بیچ، اندر، درمیان : مزار۔ قبر : پرسش۔ پوچھ گچھ، بازپرس : طاعت گزار۔ فرماں بردار، مطیع : بن۔ جنگل : کلام۔ گفتگو، بات : علمدار۔ حضرت عباسؓ کا خطاب جن کے پاس حضرت امام حسینؓ کا جھنڈا تھا : ہمشیر۔ بہن :

بند نمبر ۱:۔ لاشوں میں لائیں بیبیاں زینب کو تھام کر — ماتم کی صف پہ گر پڑی وہ سوختہ جگر
بولیں بڑھا کے دستِ مبارک ادھر ادھر — بچے کدھر ہیں مجھ کو کچھ آتا نہیں نظر

کیسی دھڑا دھڑی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
لوگو! نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں

تشریح بین کے باب میں میرانیس حضرت زینبؓ کے صاحبزادوں کی لاشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت زینبؓ کو خواتین اُن کے بچوں کی لاشوں پر پکڑ کر لائیں تو بد نصیب اور مصیبت کی ماری ماں ماتم کے لئے بچھائی گئی صف پر گر پڑیں۔ اس واقعہ سے اُن کے ہوش و حواس مختل ہو گئے اور کچھ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ محبت کی ماری نابیناؤں کی طرح اِدھر اُدھر اپنے ہاتھ بڑھا کر کہنے لگیں کہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ذرا مجھے بتاؤ کہ میرے بچے کدھر اور کہاں ہیں۔

یہ چاروں طرف کیسی لوٹ مچی ہوئی ہے اور یہ آہ و زاری اور مردوں کے اوصاف بیان کر کر کے رونے اور ماتم کرنے کا کیا سبب ہے؟ اے لوگو شور نہ مچاؤ کہ میرے پیارے بیٹے سو رہے ہیں۔

بند نمبر ۲:۔ ماں صدقے جائے تو میرے زانو پہ سر رکھو — اس بیکسی میں ماں کی بھی جانب نظر رکھو
لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو — آفت میں ماموں جان کی اپنے، خبر رکھو

دیکھو نہ آنچ آئے شہ خوش خصال پر
فوجوں کی پھر چڑھائی ہے زہراؓ کے لال پر

تشریح شدتِ جذبات میں حضرت زینبؓ اپنے بچوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں کہ اے بچو! میں تم پر قربان جاؤں میرے زانو پر سر رکھ لو۔ اس بیچارگی اور مجبوری کے عالم میں اپنی ماں کا بھی خیال رکھو۔ یہ ضروری نہیں کہ تم تلوار اور ڈھال چھوڑ دو لیکن اس مصیبت میں اپنے ماموں یعنی حضرت امام حسینؓ کے حالات سے بھی باخبر رہو یعنی اُن کی مصیبت میں اُن کا ہاتھ بٹاؤ۔

دیکھنا۔ خیال رکھنا، اچھی عادات اور اچھی خصلت رکھنے والے بادشاہ یعنی حضرت امام حسینؓ

کو کسی صورت کوئی تکلیف نہ ہو۔ جبکہ دشمن کی افواج حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کے پیارے بیٹے پر حملہ آور ہو رہی ہیں۔

بند نمبر ۳:۔ کیسی یہ نیند آج ہے پیارو اٹھو اٹھو — ماموں کے ساتھ رن میں سدھارو اٹھو اٹھو
کپڑے لہو بھرے یہ اتارو اٹھو اٹھو — گیسو الجھ گئے ہیں سنوارو اٹھو اٹھو!
ان پیاری پیاری آنکھوں پہ اماں نثار ہو
انگڑائیاں تو لو کہ جگر کو قرار ہو!

تشریح اے میرے پیارو بچو! تم آج کیسی نیند سو رہے ہو بس اب اٹھو اور جاگو۔ اٹھو اور اپنے ماموں جان یعنی حضرت امام حسینؓ کے ساتھ میدانِ جنگ میں جاؤ۔ اٹھو اور یہ اپنے خون میں بھرے ہوئے کپڑے اتار دو۔ تمہارے بال الجھ گئے ہیں اٹھو اور انہیں ٹھیک کرو۔

تمہاری خوبصورت آنکھوں پر تمہاری ماں قربان ہو۔ اگر تم اٹھتے نہیں ہو تو کم از کم انگڑائیاں تو لو تاکہ میرے بے قرار دل کو سکون حاصل ہو۔

بند نمبر ۴:۔ سینوں سے تو زمین پہ رکھو ہاتھ اتار کے — باندھو کھلے ہوئے یہ عمامے سنوار کے
اماں نثار گیسوؤں کے تار تار کے — چونکو اٹھو کلام کرو ماں سے پیار کے
نخلِ مراد میں نہ ثمر ہے نہ برگ ہے
اب مجھی میں یہ نیند نہیں خواب مرگ ہے

تشریح تمہارے ہاتھ سینوں پر بندھے ہوتے ہیں۔ ان ہاتھوں کو سینوں سے اتارو اور زمین پر رکھو۔ تمہاری پگڑیاں کھل گئی ہیں لہذا اٹھو اور اپنی پگڑیوں کو ٹھیک ٹھاک کر کے باندھو۔ تمہاری ماں تمہاری زلفوں کے ایک ایک بال پر قربان! جاگو، اٹھو اور اپنی ماں سے گفتگو کرو۔

میری تمناؤں اور چاہتوں کے درخت پر نہ تو پھل ہے اور نہ پتے یعنی یہ خزاں زدہ ہو گیا ہے۔ اور اب یہ بات میری سمجھ میں آئی ہے کہ تم لوگ سو نہیں رہے بلکہ تم فوت ہو چکے ہو اور اب موت کے خواب کے اسیر ہو۔

بند نمبر ۵:۔ کیونکر ملے گا ماں کو تمہارا سراغ ہائے — لوٹا اجل نے حیدؑ جعفرؑ کا باغ ہائے
یوں بجھ گئے ہماری لحد کے چراغ ہائے — میرا بڑھاپا اور یہ بچوں کے داغ ہائے
ہے ہے یہ گھر بھرا ہوا ویران کر گئے
اماں کی قبر بننے نہ پائی کہ مر گئے!

تشریح افسوس کہ اب تمہاری ماں کو تمہارا نشان دیتا اور کھوج کیسے ملے گا؟ افسوس کہ حضرت جعفرؓ اور حضرت علیؓ کے گلستان کو موت نے لوٹ لیا۔ ہماری قبروں کے چراغ بجھ گئے۔ یعنی تم

زندہ رہتے ہو تو ہمارے مرنے کے بعد ہماری قبروں پر چراغ روشن کرنے آتے لیکن اب ہمارے مرنے کے بعد یہ چراغ روشن کرنے والا کوئی نہ رہا۔ افسوس کہ میں اب بوڑھی ہو گئی ہوں اور اس عمر میں اپنے بچوں کی موت کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے جو انتہائی تکلیف دہ بات ہے۔

افسوس کہ تمہاری وجہ سے یہ گھر بہت بارونق لگتا تھا لیکن اب اجڑ گیا اور ویران ہو گیا۔ میں جو عمر کے تقاضے کے باعث مرنے کے لائق تھی ابھی زندہ ہوں لیکن تم انتقال کر گئے۔

بند نمبر ۶: کس طرح دیکھوں خاک میں چہرے اٹے ہوئے ۔۔۔ الجھے ہیں میرے ہاتھ کے گیسو بٹے ہوئے
سینے فگار چاند سے بازو کٹے ہوئے ۔۔۔ ہے ہے کفن بنے یہی کپڑے پھٹے ہوئے
نہ کچھ تزک نہ غسل شہیدوں کو چاہیے
مرنا یونہی جہاں میں سعیدوں کو چاہیے

تشریح تمہارے چہرے خاک میں لتھڑ گئے ہیں اور ان چہروں کو اس حالت میں دیکھنا میرے لئے انتہائی تکلیف دہ ہے۔ افسوس کہ جو گیسو میں نے سنوارے تھے وہ الجھے ہوئے ہیں۔ تمہارے سینے زخمی ہیں اور پہلی رات کے چاند کی طرح قوس بنانے والے بازو جنگ میں کٹ گئے ہیں اور افسوس کہ تمہارے کپڑے جو پھٹ چکے تھے، تمہارے لئے کفن بن گئے۔

بے شک خدا کے راستے میں شہید ہونے والے لوگوں کی تجہیز و تکفین اور تدفین میں نہ تو کچھ ترتیب و انتظام اور شان و شوکت کے اسباب درکار ہوتے ہیں اور نہ انہیں غسل دیا جاتا ہے اور حق تو یہ ہے کہ خوش قسمت اور کامیاب و کامران لوگوں کو اسی طرح مرنا چاہیے۔

بند نمبر ۷: بچو تمہیں بتاؤں میں غربت میں کیا کروں ۔۔۔ نے گھر ہے نے وطن ہے مصیبت میں کیا کروں
بھائی گھرا ہوا ہے اس آفت میں کیا کروں ۔۔۔ فاقوں میں تشنگی میں صعوبت میں کیا کروں
راحت نہ روح کو نہ کسی دل کو صبر ہے
پانی نہ غسل کو نہ کفن ہے نہ قبر ہے

تشریح اے بچو! تمہی میری بات کا جواب دو کہ میں پردیس میں ہوں اور یہاں پر تمہاری تدفین و تکفین کا کیا بندوبست کروں۔ نہ تو یہاں گھر ہے اور نہ میں اپنے وطن میں ہوں۔ مستزاد یہ کہ مصیبت زدہ ہوں۔ اس کے علاوہ میرا بھائی حسینؓ دشمنوں کے نرغے میں ہوں اور اس مصیبت میں کوئی انتظام و انصرام کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ ہمیں ضرورت کے مطابق کھانا اور پانی نہیں مل رہا جس کی وجہ سے ہم بھوکے اور پیاسے ہیں۔ بھلا ایسی مصیبت میں کیا کیا جا سکتا ہے اور میں کیا کر سکتی ہوں۔

ہم ایسی صورتِ حال سے دوچار ہیں کہ نہ ہماری روح کو آرام ہے اور نہ دلوں کو صبر و قرار اور سکون۔ یہی وجہ ہے کہ نہ بچوں کو نہانے اور غسل دینے کے لئے پانی مہیا ہو سکتا ہے نہ کفن

اور نہ قبر کا انتظام ممکن ہے ۔

بند نمبر ۸: سنتی ہوں اس سفر میں خطر بیشمار ہیں ! | جانیں وہی اسے جو میان مزار ہیں !
پرسش ہے روک ٹوک ہے جنگل ہے خار ہیں | وہ بھی ڈرے ہوئے ہیں جو طاعت گزار ہیں
منزل کا شب کی ماں کو بتا دے کے جائیو
قربان جاؤں ساتھ مجھے لے کے جائیو

تشریح: بچو! تم موت کے سفر پر روانہ ہو رہے ہو اور میں نے سنا ہے کہ اس سفر میں بے شمار خطرے ہیں ۔ لیکن میں اس باب میں کیا کہہ سکتی ہوں ؟ اس سفر کی سختیوں کو وہی لوگ جان سکتے ہیں جو فوت ہونے کے بعد اپنی قبروں میں چلے گئے ۔ سنا ہے کہ اس سفر میں جا بجا پوچھ گچھ اور حساب و کتاب ہوتا ہے اور جو لوگ اس حساب و کتاب میں کم عیار ثابت ہوں اُن پر وہی کیفیت گزرتی ہے جو کسی مسافر پر جنگل اور کانٹوں میں گزرتی ہے یعنی گناہگاروں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ گناہگار تو ایک طرف اِس حساب و کتاب سے تو وہ لوگ بھی ڈرتے ہیں جو اللہ کے فرمانبردار مطیع ہیں ۔

اے بچو! تم رات کے جس سفر پر روانہ ہو رہے ہو اپنی ماں کو اس سفر کے راستے میں آنے والی منزل کا پتا بتا کے جانا اور تنہا جانے کی بجائے اپنی ماں کو بھی ساتھ لے کے جانا ۔

بند نمبر ۹: دن ڈھل گیا قریب ہے شام اے مسافرو | کس بن میں شب کو ہوگا مقام اے مسافرو
کچھ تو کرو زباں سے کلام اے مسافرو | بھیجو گے کب پیام و سلام اے مسافرو
بیٹھوں گی پہلوؤں میں جو تم کو نہ پاؤں گی
میں شب کو ڈھونڈتی ہوئی جنگل میں آؤں گی

تشریح: اے بچو! تمہاری عمر کا دن ختم ہوا اور رات آگئی یعنی تم فوت ہو گئے ۔ مجھے بتاؤ کہ رات کو جنگل میں کس مقام پر قیام کرو گے ۔ اے سفر پر روانہ ہونے والو! کچھ تو بات کرو مجھے بتاؤ کہ منزل پر پہنچنے کے بعد اپنی خیریت کی اطلاع بھیجو گے ۔

جب میں رات کو سوؤں گی اور تم میرے قریب موجود نہ ہو گے تو میں ماتم کروں گی اور تمہیں ڈھونڈتی اور تلاش کرتی ہوئی رات کو جنگل میں آؤں گی ۔

بند نمبر ۱۰: یہ بین کر کے لاشوں سے لپٹی وہ نوحہ گر | غش آیا سانس الٹ گئی ٹکڑے ہوا جگر
اک حشر تھا کسی کو کسی کی نہ تھی خبر | بانو پکاری سوئے علم دار دیکھ کر
بچوں کے ساتھ ماں بھی جہاں سے گزر نہ جائے
لاشے اُٹھاؤ شاہ کی ہمشیر مر نہ جائے

تشریح حضرت زینبؓ اپنے بچوں کی لاشوں پر گریہ و ماتم کر کے ان سے لپٹ گئیں اور بے ہوش ہو گئیں سانس بے ترتیب اور بے قابو ہو گیا اور حضرت زینبؓ کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ دراصل یہاں پر قیامت برپا تھی اور قیامت کی طرح کسی کو کسی دوسرے کی خبر معلوم نہ تھی۔ لیکن حضرت امام حسینؓ کی بیوی حضرت بانو نے حضرت عباسؓ علمدار کی طرف دیکھا اور کہا۔ اے عباسؓ علمدار بچوں کی لاشوں کو اٹھاؤ ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں بچوں کے غم میں حضرتِ زینبؓ بھی فوت نہ ہو جائیں اور حضرتِ امام حسینؓ کی بہن وفات نہ پا جائے۔

نواب مرزا شوق

وصیّت نامہ

تعارف نواب مرزا شوق نے مثنوی نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ جذبات کے بے ساختہ اظہار کی خصوصیت شوق کی مثنویوں کی اولین خصوصیت ہے۔ اسی بنا پر ایک عرصے تک شوق کی شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی رہی۔ ان کے ہاں محاورہ اور زبان کی دیگر نزاکتیں بھی انتہائی پرلطف انداز میں نظم کی گئی ہیں۔

مرزا شوق دیگر مثنوی نگاروں کی طرح قدیم داستانوں کے اجزا کی بجائے ایک فرد کے سچے اور سیدھے سادے تجرباتِ عشق پیش کرتے ہیں اور یہی اُن کی انفرادیت ہے۔

حلِ لغات جائے۔ مقام، ٹھکانہ، جگہ؛ عبرت سرا۔ عبرت حاصل کرنے کا مقام؛ فانی۔ ختم ہونے والی؛ مورد۔ وارد ہونے کی جگہ؛ ناگہانی۔ بے وقت، اتفاقیہ، اچانک؛ گور۔ قبر؛ بالکل۔ تمام و کمال۔ سارے کا سارا؛ بوم۔ چغد، اُلو۔ منحوس، تنہائی کو پسند کرنے والا؛ نام۔ یادگار؛ نام کو نہ رہنا۔ بالکل نہ رہنا، ختم ہو جانا؛ نشان۔ آثار؛ بادشاہِ ہفت اقلیم۔ سات سلطنتوں کا بادشاہ یعنی بہت ہی بڑا بادشاہ؛ فرق۔ سر کے بالوں کی مانگ، مجازی طور پر سر مراد ہے؛ خودسر۔ سرکش، ضدی؛ خاک میں ملنا۔ ختم ہونا؛ چرخ۔ آسمان؛ استخواں۔ ہڈی؛ قیصر۔ سلطان، بادشاہ، رومی بادشاہوں کا لقب؛ فغفور۔ چینی بادشاہوں کا لقب؛ کاسۂ سر۔ کھوپڑی، سر کے پیالے؛ رشکِ یوسف۔ یوسف کے لئے باعثِ غیرت، یعنی بہت ہی زیادہ حسین؛ منقلب۔ بدلنے والا؛ کوہ کن۔ پہاڑ کھودنے والا مراد فرہاد؛ نل دمن۔ شیریں و فرہاد اور لیلیٰ مجنوں کی طرح یہ بھی عشقیہ کردار ہیں؛ طائرانِ خوش الحان۔ خوش آواز پرندے؛ کل من علیہا فان۔

دنیا کی ہر چیز کو فنا ہے ؛ رستگاری ۔ نجات ، رہائی ، چھٹکارہ ؛ بے ثبات ۔ غیر منتقل ، ناپائیدار ؛ عین ۔ ٹھیک ، خاص ، اصل ، بجنسہٖ ؛ سم ۔ زہر ؛ ہجولی ۔ ہم عصر ، ساتھی ، دوست ؛ وصیت ۔ مرتے یا سفر پر جاتے وقت کی گئی نصیحت ؛ ملال ۔ غم ؛ اقربا ۔ عزیز ، رشتہ دار ؛ جی کھونا ۔ ہمت ہارنا ، جان دینا ؛ تابوت ۔ وہ صندوق جس میں مردے کو لٹا کر دفن کرتے ہیں ؛ منت ۔ عاجزی ، خوشامد ۔ احسان ؛ آتش کے پرکالے ۔ آگ کا ٹکڑا ، چالاک ، ہوشیار ؛ گھوٹ گھوٹ کے ۔ بمعنی گھٹ گھٹ کے ، رک رک کے ، زیادہ تکلیف اٹھا کر ؛ بھڑاس ۔ دل کا غبار ؛ تربت ۔ قبر ؛ زبوں تحوار ، برا ، ذلیل ؛ کل ۔ آرام ، سکون ، چین ؛ مرقد ۔ قبر ؛ ہاتھ اٹھانا ۔ باز آنا ۔ ترک کر دینا ؛ مٹی دینا دفن کرنا ؛

نوٹ :۔ مثنوی زہر عشق کا قصہ کچھ اسطرح ہے کہ مرزا شوق اور اُن کے محبوب کی ملاقات ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے بارے میں اپنے دلوں میں نرم گوشہ محسوس کرنے لگتے ہیں ۔ کوشش کے باوجود اُن کے روابط صیغہ راز میں نہیں رہتے ۔ جس پر محبوب کے اقرباء اُسے بنارس بھیجنے کا فیصلہ کرتے ہیں ۔ اس فیصلے کے بعد ملاقات میں محبوب کہتا ہے کہ بنارس جا کر ہجر و فراق کے صدمات سہنے کی نسبت زہر کھا کر مرجانا آسان ہے ۔ اِسی سلسلے میں وہ مرزا شوق کو کچھ نصیحتیں کرتی اور سمجھاتی بجھاتی ہے ۔ یہیں سے پیش نظر ٹکڑا لیا گیا ہے جو شامل نصاب ہے ۔

شعر نمبر ۱ :۔ جائے عبرت سرائے فانی ہے — مورد مرگ ناگہانی ہے

تشریح: محبوب عاشق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ دنیا ایسا مقام اور ایسی جگہ ہے جو اپنی فنا اور خاتمے کی طرف بڑھ رہی ہے اور روز و شب یہاں پر ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ اگر انسان غور کرے تو اُسے خاصی عبرت حاصل ہو ۔ یہ دنیا ایسا مقام ہے جہاں جانداروں کو اچانک موت آتی ہے ۔ اور اس کے بارے میں انسان پہلے سے بالکل بے خبر ہوتا ہے ۔

شعر نمبر ۲ :۔ اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

تشریح: مثلاً وہ لوگ جنہوں نے اپنے رہنے کے لئے اونچے اونچے اور عالیشان مکان بنوائے ، فنا کا شکار ہو کر اپنی تنگ قبروں میں محصور ہیں اور انتہائی بے بسی کی حالت میں اپنے مکانات سے محروم ہو کر یہاں پڑے ہوئے ہیں ۔

شعر نمبر ۳ :۔ کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے

تشریح: جس مقام پر کل تک باغات اور گلستان تھے اور ہر طرف سرسبزی و شادابی تھی ، آج دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ باغات اجڑ گئے ، گلستان تباہ ہو گئے اور اُن کی جگہ کانٹے اُگ گئے ۔ یعنی انقلاب زمانہ سے عیش و عشرت اور ناز و نعم میں پرورش پانے والے لوگ پلک جھپکنے میں مصائب و

تکالیف کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شعر نمبر ۴ :۔ جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

تشریح :۔ جس مقام پر چمن اور گلستان موجود تھے طرح طرح کے پھول کھلے تھے اور اُن پھولوں کے گرد بلبل نالہ و زاری اور نغمے گانے میں مصروف رہتے تھے۔ آج وہ تمام گلستان اُجڑ گئے اور وہاں پر اُلو نے اپنا گھر بنا لیا۔ واضح ہو کہ جس طرح چمن اور بلبل آبادی اور انجمن آرائی کی علامتیں ہیں اسی طرح اُلو اور اس کے قیام کی جگہ بربادی، اجاڑ اور تنہائی کو ظاہر کرتی ہے یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ محفلیں ایک پل میں اجڑ جاتی ہیں۔

شعر نمبر ۵ :۔ بات کل کی ہے نوجواں تھے جو — صاحب نوبت و نشاں تھے جو

۶ :۔ آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشاں باقی

تشریح :۔ کل یعنی ماضی میں جو لوگ نوجوان تھے اور جن کے دل حوصلوں اور امنگوں سے معمور تھے۔ جن کے آگے آگے ڈھول بجتے تھے اور جن کی سواری کے ساتھ جھنڈے اور علم ہوتے تھے یعنی جو صاحب عزت و وقار تھے۔ آج وہ خود بھی باقی نہیں رہے اور موت کا شکار ہو گئے۔ اور اُن کے معمولی سے آثار بھی باقی نہیں ہیں۔ یعنی فنا اور موت ان سب چیزوں کو کھا گئی ہے۔

شعر نمبر ۷ :۔ غیرت حور مہ جبیں نہ رہے — ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

تشریح :۔ وہ لوگ جو اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے حوروں کے لئے باعث رشک تھے اور جن کی پیشانیاں چاند کی طرح منور تھیں وہ بھی اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ اگرچہ ان کے مکانات اور ان کی یادگاریں دنیا میں موجود بھی ہیں لیکن ان مکانوں میں رہنے والے وفات پا چکے ہیں۔

شعر نمبر ۸ :۔ جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم — ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم

۹ :۔ کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام — کون سی گور میں گیا بہرام

۱۰ :۔ اب نہ رستم نہ سام باقی ہے — اک فقط نام ہی نام باقی ہے

تشریح :۔ وہ لوگ جو سات سلطنتوں کے حکمران تھے یعنی بہت ہی عظیم بادشاہ تھے وہ بھی اپنی عملداری، حکومت اور سلطنت کو چھوڑ کر زمین کے اندر قیام پذیر ہو گئے یعنی مر گئے اور دفن ہو گئے۔ اب ایسے عظیم بادشاہوں کا کوئی شخص نام تک نہیں لیتا اور لوگ یہ تک بھول چکے ہیں کہ یہ لوگ کہاں دفن ہیں۔ اب نہ تو رستم ہی باقی رہا ہے اور نہ ہی سام۔ بس ان لوگوں کا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔

شعر نمبر ۱۱ :۔ کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج — آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

تشریح: وہ لوگ جو کل تک بادشاہ تھے اور جن کے سروں پر تاج تھے۔ آج اُن کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھنے اور انھیں ثواب پہنچانے والا بھی کوئی نہیں۔

شعر نمبر ۱۲: وہ تھے جو خود سر جہان میں مشہور — خاک میں مل گیا ہے ان کا غرور

تشریح: وہ لوگ جو اپنی زندگی میں انتہائی ضدی، سرکش اور باغی تصور کئے جاتے تھے اور اس سلسلے میں شہرت رکھتے تھے، موت کے ساتھ ہی اُن کا غرور و افتخار ختم ہو گیا اور تمام دبدبہ اور تمکنت اُن کے کام نہ آئی۔

شعر نمبر ۱۳: عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے! — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

۱۴: وہ گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے

تشریح: وہ لوگ جن کے جسموں کو کبھی مٹی چھو کر نہیں گزری تھی اور وہ اپنی نفاستِ طبع کی بنا پر مٹی سے تیار کردہ عطر بھی استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے اور جو اس قدر نازک تھے کہ باہر دھوپ میں نکلنا بھی اُن کے لئے گراں اور دشوار تھا، وہ بھی آسمان اور تقدیر کے چکر یعنی انقلابِ زمانہ کے باعث مر گئے۔ یہاں تک کہ دفن ہو کر اُن کے جسموں کی ہڈیاں مٹی میں تبدیل ہو گئیں یعنی گل سڑ گئیں۔

شعر نمبر ۱۵: وہ تھے جو مشہور قیصر و فغفور! — باقی ان کا نہیں نشان قبور

تشریح: وہ لوگ جو اپنی عزت و توقیر کے باعث قدیم رومی اور چینی بادشاہوں کے برابر تھے آج دنیا میں ان لوگوں کی قبروں تک کے نشانات موجود نہیں۔ آتشؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

؎ نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا! — مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

شعر نمبر ۱۶: وہ تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر

تشریح: وہ بادشاہ اور عظیم لوگ جن کے تاج میں گوہر اور موتی ٹانکے جاتے تھے آج اُن کی کھوپڑیاں لوگوں کی ٹھوکروں میں ہیں اور انتہائی ذلت سے دوچار ہیں۔

شعر نمبر ۱۷: وہ رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں — کھا گئے اُن کو آسمان و زمین

تشریح: وہ لوگ جو حضرت یوسفؑ کی طرح انتہائی حسین و جمیل تھے بلکہ ان کے لئے بھی باعث غیرت تھے۔ انھیں بھی زمین و آسمان کھا گئے مراد یہ کہ وہ بھی فوت ہو گئے اور اب اُن کا نام و نشان تک باقی نہیں۔

شعر نمبر ۱۸: وہ ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے

تشریح: زمانہ اور وقت یعنی یہ دنیا ہمہ وقت تبدیل ہو رہی ہے۔ ہر لمحہ اس میں تغیر اور انقلاب آتے رہتے ہیں اور غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس دنیا کا عمومی طریقہ بھی یہی ہے

یہاں کوئی چیز مستقل اور ثابت نہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

ع ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

شعر نمبر ۱۹: ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ — نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ مثلاً آپ دیکھیے نہ اس دنیا میں فرہاد کا پتا ملتا ہے اور نہ شیریں کا وجود باقی ہے حالانکہ شیریں اپنی زندگی میں اس قدر مشہور تھی کہ فرہاد نے اُس کے لیے کوہ بے ستون کو کاٹ کر نہر نکالی۔ اسی طرح فرہاد اتنا بڑا عاشق تھا کہ شدید محنت کے باوجود اُسے شیریں نہ ملی تو اُس نے اپنے سر میں تیشہ مارا اور یوں موت قبول کر لی۔ لیکن آج لوگ نہ شیریں کو جانتے ہیں نہ فرہاد کو۔ اس طرح ہندوستان کے دو عشقیہ کردار نل اور دمن بھی ہمارے ذہنوں سے اتر گئے اور اپنا وجود کھو بیٹھے ہیں۔

شعر نمبر ۲۰: بو تے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے

تشریح: بے شک لیلیٰ اور مجنوں کے عشق اور عشق میں استقلال کی داستانیں ساری دنیا میں مشہور ہیں لیکن خود لیلیٰ اور قیس اس دنیا میں موجود نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ موت نے انھیں بے نام و نشان کر دیا۔

شعر نمبر ۲۱: صبح کو طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

تشریح: صبح ہی صبح دیکھیے تو تمام خوش آواز پرندے قرآن شریف کی ایک آیت تلاوت کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ "دنیا کی ہر چیز فنا ہونے کے لئے ہے۔" یعنی ہماری صبح کا آغاز ہی اس سبق سے ہوتا ہے اور سب سے پہلے ہمارا اسی حقیقت سے سابقہ پڑتا ہے۔

شعر نمبر ۲۲: موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے

تشریح: اس طرح دیکھا جائے تو دنیا میں کون ہے جو موت سے نجات پانے کا دعویٰ کر سکے اور کون ہے جسے موت چھوڑ دے۔ البتہ یہ ہے ایک شخص آج فوت ہو گیا، دوسرا کل ہو جائے گا، ہم سب فنا کی طرف بڑھ رہے ہیں بس تقدیم و تاخیر کا فرق ہے۔ مجید امجد کہتے ہیں

ے عدم کے راستے پر آگے پیچھے — کوئی آگے رواں ہے کوئی پیچھے

شعر نمبر ۲۳: زندگی بے ثبات ہے اس میں — موت عین حیات ہے اس میں

تشریح: اس دنیا میں زندگی غیر مستقل اور ناپائیدار ہے آج ہے کل نہیں ہو گی اور غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس دنیا میں موت بجنسہٖ زندگی ہے۔ یعنی زندگی کو موت سے مفر نہیں اور ہر زندگی کی تاک میں موت موجود ہے۔ مر کر ہی انسان کو ثبات حاصل ہو تو ہو زندگی میں نہیں ہو سکتا۔

شعر نمبر ۲۴: ہم بھی گر جان دیں کھا کر سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم

تشریح محبوب موت وحیات کا فلسفہ بیان کرنے اور عاشق کو ذہنی طور پر زندگی پر موت کی حاکمیت کے اصول کا قائل کرنے کے بعد کہتا ہے کہ اگر ہم بھی زہر کھا کر مر جائیں اور زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لیں تو تم مت رونا اور ہماری موت پر اظہار افسوس نہ کرنا۔

شعر نمبر ۲۵: دل کو ہم جولیوں میں بہلانا — یا مری قبر پر چلے آنا!

تشریح مجھے اندازہ ہے کہ میری موت کے بعد تم اداس اور مغموم ہو جاؤ گے لہذا اپنے ہم عصروں اور ساتھیوں کے ساتھ مصروف رہ کر اپنے دل کو بہلانے اور غم غلط کرنے کی کوشش کرنا۔ اسطرح بھی قرار نہ ملے تو پھر مری قبر پر آجایا کرنا۔

شعر نمبر ۲۶: جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور — ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور

۲۷: روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی! — ڈھونڈنے کس طرف کو جائے گی

تشریح جس مکان میں اب رہتے ہو یہ مکان اور یہ شہر چھوڑ کر کسی اور جگہ رہائش اختیار نہ کرنا، ایسا نہ ہو کہ ہم مر جائیں تو تم سمجھو کہ چلو نجات ملی۔ مرنے کے بعد میری روح اسی مکان میں تمہاری تلاش میں آیا کرے گی اور اگر تم کہیں چلے گئے تو میری روح کو بھٹکنا پڑے گا۔ اور تمہارا پتا معلوم نہ ہو گا تو پھر میری روح تمہیں کہاں تلاش کرے گی؟

شعر نمبر ۲۸: روکے رہنا بہت طبیعت کو — یاد رکھنا مری وصیت کو!

تشریح مجھے معلوم ہے کہ میرے مرنے کے بعد تم بے اختیار ہو کر گریہ و ماتم کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے لیکن خدارا اپنی طبیعت کو روکنا اور سنبھلنے کی کوشش کرنا اور میری وصیت کو یاد رکھنا۔

شعر نمبر ۲۹: ضبط کرنا اگر ملال رہے — میری رسوائی کا خیال رہے

تشریح اگر دل غمگین ہو تو غم کا اظہار کرنے کی بجائے صبر و ضبط سے کام لینا۔ ایسا نہ ہو کہ تم بے اختیار ہو کر ماتم شروع کر دو اور یوں میں بدنام و رسوا ہو جاؤں۔

شعر نمبر ۳۰: میرے مرنے کی جب خبر پانا — یوں نہ دوڑے ہوئے چلے جانا

۳۱: جمع ہو لیں سب اقربا جس دم — رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم

تشریح جب تمہیں میرے مرنے کی خبر ملے تو گھبراہٹ کے عالم میں فوراً ہی بھاگے ہوئے نہ چلے آنا بلکہ جب میرے تمام عزیز و اقارب جمع ہو جائیں تب میرے مکان پر آنا۔

شعر نمبر ۳۲: کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم! — ساتھ تابوت کے نہ رونا تم

۳۳: ہو گئے تم اگرچہ سودائی — دور پہنچے گی اس کی رسوائی

تشریح میں پہلے ہی نصیحت کر رہی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد بے انتہا غم واندوہ کے باعث ہمت نہ ہار بیٹھنا اور بے اختیار ہو کر میری میت کے لئے استعمال میں آنے

والے صندوق کیساتھ لگ کر رونے لگ جانا اسلئے کہ اگر تم نے دیوانہ بن کر ماتم وزاری کی تو پھر میں رسوا ہو جاؤں گی اور دور دور تک میری بدنامی ہوگی۔

شعر نمبر ۳۴:۔ لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے　　　لوگ عاشق ہمارا جانیں گے

تشریح: پھر اگر تم اپنی اور میری صفائی میں کچھ کہو گے بھی تو لوگ اس کا یقین نہ کریں گے اور تمہارے اطوار اور رویے سے وہ تمہیں میرا عاشق قرار دیں گے۔

شعر نمبر ۳۵:۔ طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر　　　قبر پہ بیٹھنا نہ ہو کے فقیر!

تشریح: سب امیر و غریب اور چھوٹے بڑے تمہارے اور ہمارے روابط کو آڑے بنا کر طعنے دیں گے۔ لہٰذا تم فقیر بن کر اور جوگ اختیار کر کے میری قبر پر مت بیٹھ جانا کہ اس سے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔

شعر نمبر ۳۶:۔ سامنا ہو ہزار آفت کا　　　پاس رکھنا ہماری عزت کا

تشریح: تم سے التماس ہے کہ ہر حال میں ہماری عزت کا خیال رکھنا اور ہمیں بدنام نہ ہونے دینا خواہ اس کے لئے تمہیں ہزاروں مشکلات و مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔

شعر نمبر ۳۷:۔ جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں　　　آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں

تشریح: میرے مرنے کے بعد جب میرے عزیز و اقارب میرا جنازہ اٹھائیں اور مجھے دفن کرنے کے لئے چلیں تو جہاں اور دوسرے بہت سے لوگ روئیں گے آپ اُن میں ہرگز شامل نہ ہوں۔ اس لئے کہ وہ رونے والے تو میرے عزیز ہوں گے اور آپ سے بظاہر کوئی عزیزداری نہیں لہٰذا لوگ شک و شبہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔

شعر نمبر ۳۸:۔ میری منت پہ دھیان رکھیے گا　　　بند اپنی زبان رکھیئے گا

۳۹:۔ تذکرہ کچھ نہ کیجئے گا مرا　　　نام منہ سے نہ لیجئے گا مرا

تشریح: میں جو نہایت عاجزی سے آپ کی منت سماجت کر رہی ہوں ذرا اس کا خیال رکھیئے گا۔ اور کوشش کیجئے کہ میرے ساتھ تعلق میں آپ کی زبان سے کوئی بات نہ نکلے۔ لوگوں کے سامنے میرا ذکر نہ کیجئے گا اور نہ ہی لوگوں کے سامنے اپنی زبان پر میرا نام آنے دیجئے کہ اس طرح میں رسوا ہو جاؤں گی۔

شعر نمبر ۴۰:۔ اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا　　　ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا

تشریح: میرے مرنے پر آپ مت روئیے اور بالکل غیروں کی طرح غیر متعلق ہو کر ہمارے گھر سے قبرستان تک جائیے تاکہ لوگوں کو شبہ نہ ہو۔

شعر نمبر ۴۱:۔ آپ کاندھا نہ دیجئے گا مجھے　　　سب میں رسوا نہ کیجئے گا مجھے

تشریح جب میرا جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا جائے تو آپ بالکل غیر بنے رہیں اور عزیزوں کی طرح میری میت کو کاندھا نہ دیں۔ اس لئے کہ اس طرح میری رسوائی اور بدنامی کا سامان ہوگا۔

شعر نمبر ۴۲: رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں — منہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں

تشریح ایسا نہ ہو کہ میرے دیگر اعزاء کی طرح میری موت پر تمہارے چہرے کا رنگ بھی بدل جائے یعنی چہرہ فق ہو اور تمہارے منہ سے گریہ و زاری اور نالے نکلیں۔ لوگ سنیں گے تو باتیں بنائیں گے۔

شعر نمبر ۴۳: ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے — تا کسی شخص پر نہ حال کھلے

تشریح غم و اندوہ اور ماتم و گریہ کے موقع پر لوگ بال کھول لیتے ہیں اور بالوں کا الجھنا بجائے خود از حد پریشانی کو ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا تم کھلے بالوں کے ساتھ میرے جنازے کے ہمراہ نہ جانا تاکہ کسی پر ہمارے روابط کا حال نہ کھلے اور کوئی حقیقت نہ جان سکے۔

شعر نمبر ۴۴: ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے — تاڑ جلتے ہیں تاڑنے والے

تشریح لوگ انتہائی چالاک و ہوشیار ہوتے ہیں اور اگر تم سے ذرا بھی غلطی ہوئی تو یہ اپنی چالاکی کی وجہ سے حقیقتِ حال تک پہنچ جائیں گے۔

شعر نمبر ۴۵: ہو بیاں گر کسی جگہ مرا حال — تم نہ کرنا کچھ اس طرف کو خیال

تشریح بالفرض کچھ لوگ بیٹھ کر میرا تذکرہ کرنے لگیں اور میری موت پر اظہارِ افسوس کریں یا میری کیفیت پر اظہارِ خیال کریں تو تم اس طرف توجہ نہ دینا۔ اس لئے کہ متوجہ ہونا بجائے خود ایک گونہ دلچسپی اور تعلق کی غمازی کرتا ہے۔

شعر نمبر ۴۶: ذکر سن کر نہ میرا رو دینا — میری عزت نہ یوں ڈبو دینا

تشریح ایسا نہ ہو کہ لوگ میرا ذکر کریں اور تم رونے لگو۔ اس طرح لوگوں کو شک ہوگا اور میری عزت و ناموس خطرے میں پڑ جائے گی اور میں بدنام ہو جاؤں گی۔

شعر نمبر ۴۷: رنج فرقت مرا اٹھا لینا — جی کسی اور جا لگا لینا

تشریح میری جدائی کا دُکھ انتہائی صبر و تحمل سے برداشت کر لینا اور میری عدم موجودگی سے کسی اور کو اپنے دل کے جذبات کا محور و مرکز بنا لینا اور کسی دوسرے محبوب سے محبت کر لینا۔

شعر نمبر ۴۸: ہو گا کچھ میری یاد سے نہ حصول — دل کو کر لینا اور سے مشغول

تشریح اگر تم میرے مرنے کے بعد مجھے یاد کروگے تو تمہیں اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا لہذا اپنے دل کو کسی اور جگہ معروف کرلینا۔

شعر نمبر ۴۹:۔ رنج کرنا نہ میرا میں قرباں   سن لو گر اپنی جان ہے تو جہاں

تشریح میں تمہارے نثار جاؤں میرے مرنے کا بہت زیادہ غم نہ کرنا۔ اس لئے کہ بے حد غم و اندوہ کے باعث تمہاری جان کو خطرہ لاحق ہو جائے گا جبکہ مثل مشہور ہے کہ اگر جان ہے تو جہان ہے یعنی دنیا کی عیش و عشرت زندگی کے وجود سے وابستہ ہے۔ زندگی نہ رہے تو سب کچھ بیکار ہے۔

شعر نمبر ۵۰:۔ دے نہ اس کو خدا کبھی کوئی درد   ہوتا نازک کمال ہے دل مرد

تشریح خدا کبھی کسی مرد کے دل کو اداس اور غمگین نہ کرے اس لئے کہ مردوں کا دل بہت ہی نازک اور حساس ہوتا ہے اور اس میں غم و آلام برداشت کی قوت نہیں ہوتی۔

شعر نمبر ۵۱:۔ دل میں کڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو   جان دینا نہ گھوٹ گھوٹ کے تو

تشریح مجھ سے بچھڑ کر تم اپنا دل نہ جلانا اور گھٹ گھٹ کر مر نہ جانا۔

شعر نمبر ۵۲:۔ آکے رو لینا میری قبر کے پاس   تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس

تشریح اگر تمہارا دل بہت ہی زیادہ اداس اور غمزدہ ہو تو میری قبر کے پاس آجانا۔ اس طرح تمہارے دل کو قدرے تسلی اور سکون حاصل ہوگا اور تمہارے دل کا غبار نکل جائے گا اور گھٹن کو اپنے اظہار کے لئے راستہ مل جائے گا۔

شعر نمبر ۵۳:۔ آنسو چپکے سے دو بہا لینا   قبر میری گلے لگا لینا!

تشریح میری قبر پر آکر نہایت خاموشی سے اور لوگوں پر ظاہر کئے بغیر تھوڑا بہت رو لینا اور شدت محبت میں زیادہ بے اختیاری آئے تو میری قبر کو گلے سے لگا لینا۔

شعر نمبر ۵۴:۔ اگر آجائے کچھ طبیعت پر   پڑھنا قرآن میری تربت پر

تشریح اگر دل میں کچھ خیال پیدا ہو اور تمہیں میری محبت کا احساس ہو تو میری قبر پر بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کرنا۔ یعنی اس سے ایک طرف تو تمہیں سکون ملے گا اور دوسری طرف مجھے ثواب پہنچے گا۔

شعر نمبر ۵۵:۔ غنچۂ دل مرا کھلا جانا!   پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

تشریح جب کبھی میری قبر پر آؤ تو آتے ہوئے قبر کے لئے کچھ پھول لے آیا کرنا، اگر تم ایسا کروگے تو اس سے میرا دل خوش اور مطمئن ہوگا۔

شعر نمبر ۵۶:۔ رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں   تا نہ ہو جائے دشمنوں کو جنوں

تشریح میری فرقت میں رو رو کر اپنی حالت بے حد خراب نہ کر لینا، اس لئے کہ اس میں یہ اندیشہ رہے گا کہ کہیں تمہیں جنون و دیوانگی نہ ہو جائے اور تم سودائی نہ ہو جاؤ۔

شعر نمبر ۵۷: دیکھیے کس طرح پڑے گی کل سخت ہوتی ہے منزل اوّل

تشریح معلوم نہیں خود مجھے کیسے اطمینان اور چین میسر آئے گا اس لئے کہ مرنے کے لئے قبر کی اولین منزل بہت سخت اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔

شعر نمبر ۵۸: میرے مرقد پہ روز آنا تم فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم

تشریح لہٰذا تم مہربانی کرنا اور روزانہ میری قبر پہ آیا کرنا اور سورۃ فاتحہ اور قرآن شریف کی کچھ آیات کی تلاوت کر کے اس کا ثواب میری روح کو پہنچایا کرنا اور دیکھنا اس عمل کو ترک نہ کر دینا۔

شعر نمبر ۵۹: ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

تشریح یہ تمام باتیں جو میں نے تمہیں کہی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد تم خود اپنے ہاتھوں سے میری قبر پر مٹی ڈالنا یعنی میری تجہیز و تکفین اور تدفین میں شرکت کرنا۔

شعر نمبر ۶۰: عمر بھر کون کس کو روتا ہے کون صاحب کسی کا ہوتا ہے

تشریح ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد دو چار روز میں لوگ اپنے عزیز ترین رشتوں کو بھی بھول جاتے ہیں اور یوں بھی عمر بھر کون کسی کو یاد رکھ سکتا ہے اور اس دنیا میں کون ہے جو کسی کے لئے واقعی جان قربان کر کے اپنائیت کا ثبوت دے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم

داستان تاج الملوک شہزادہ اور زین الملوک بادشاہ مشرق کی

تعارف میر حسن اور مرزا شوق کے ساتھ ساتھ دیا شنکر نسیم اردو مثنوی کے ایک انتہائی معتبر شاعر ہیں۔ یہ خواجہ حیدر علی آتش سے اصلاح لیتے تھے اور انہی کے مشورے پر مثنوی گلزارِ نسیم کی ضخامت کم کی گئی۔

اس مثنوی میں افسانوی و داستانی عناصر کے علاوہ اصل لطف صنائع بدائع کا ہے جن کی نظم میں بہتات ہے لیکن صنائع بدائع کی خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس مثنوی کی ایک اور اہم خوبی اس کا اختصار ہے۔ نسیم بعض واقعات بیان کرنے کے لئے محض چند لفظ لکھتے ہیں لیکن ان کے چند ہی لفظ واقعہ کی مکمل تصویر بنا دیتے ہیں۔

جس طرح باغ و بہار کے جواب میں فسانۂ عجائب لکھی گئی بالکل اسی طرح سحرالبیان کے مقابلے میں گلزار نسیم سامنے آئی اور واقعہ یہ ہے کہ گلزار نسیم میں دبستان لکھنؤ کی جملہ خصوصیات موجود ہیں۔

حل لغات روداد۔ کیفیت، حالت ؛ زمانِ پاستانی۔ ماضی، گزرا ہوا زمانہ، قدیم زمانہ ؛ نقل۔ تحریر ؛ خامہ۔ قلم ؛ پورب۔ مشرق، وہ علاقہ جو دریائے گنگا کے مشرق میں واقع ہے ؛ ذی جاہ۔ عظمت والا ؛ لشکرکش۔ بہت سی فوج رکھنے والا ؛ دشمن کش۔ دشمنوں کو مارنے والا ؛ شہر یار۔ بادشاہ ؛ دانا۔ دانائی رکھنے والا ؛ دانش مند۔ عاقل، عقل رکھنے والا ؛ ذکی۔ ہوشیار، زودفہم، ذہین ؛ خردمند۔ عقل مند ؛ پس ماندہ۔ بچا ہوا، پیچھے رہا ہوا ؛ پیش خیمہ۔ ہراول، ہرکارہ، تمہید ؛ نخل۔ پودا، درخت ؛ بار۔ پھل، نتیجہ ؛ مہر۔ سورج ؛ انور۔ بہت زیادہ روشن ؛ پسر۔ بیٹا ؛ چشمک۔ مخالفت، رنجش ؛ پدر۔ باپ ؛ طفل۔ بچہ ؛ ستارہ بیں۔ ستارہ شناس، نجومی ؛ ابتر۔ بدحال ؛ سرشک۔ آنسو ؛ افسر۔ سردار ؛ خسرو۔ ایران کا ایک بادشاہ مراد بادشاہ ؛ گلفام۔ پھولوں جیسا نرم و نازک اور سرخ رنگ والا ؛ رواں۔ بہتا ہوا۔ ماہر ؛ ناگاہ۔ اچانک ؛ صاد۔ تصدیق، اقرار ؛ مہرلب۔ خاموش ہونا، گفتگو نہ کرنا ؛ نوربصر۔ بصارت کا نور، بینائی ؛ چشم پوشی۔ درگزر کرنا، ٹال جانا ؛ رونمائی۔ منہ دکھائی، سلامی، وہ رقم جو دلہن یا کسی عزیز کو پہلی دفعہ ملتے ہوئے دی جاتی ہے ؛ بھائی۔ پسند آئی ؛ دیدہ کور۔ اندھی آنکھ ؛ بینا۔ دیکھنے کے قابل ؛ مختار۔ اختیار رکھنے والا ؛

شعر نمبر ۱: روداد زمانِ پاستانی   یوں نقل ہے خامے کی زبانی

۲: پورب میں تھا اک شہنشاہ   سلطان زین الملوک ذی جاہ

تشریح قلم نے اپنی زبان سے پرانے زمانے کی کہانی بیان کرتے ہوئے یوں لکھا ہے یعنی ماضی سے متعلق ایک کہانی ملتی ہے کہ مشرق میں یا دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ بہت ہی زیادہ عظمت اور جاہ و جلال رکھنے والا بادشاہ تھا اور اُس کا نام زین الملوک تھا۔

شعر نمبر ۳: لشکرکش و تاجدار تھا وہ   دشمن کش و شہر یار تھا وہ

تشریح اُس کی افواج کی تعداد بے پناہ تھی اور وہ صاحب تاج و تخت تھا۔ وہ بادشاہ تھا۔ اور اپنے دشمنوں کو ختم کر دیا کرتا تھا۔

شعر نمبر ۴: خالق نے دیئے تھے چار فرزند   دانا، عاقل، ذکی، خردمند

تشریح اللہ تعالیٰ نے سلطان زین الملک کو چار لڑکے عطا کئے تھے جو بہت ہی دانش مند، عقلمند، ذہین و ہوشیار اور خردمند تھے۔ نسیم نے اس شعر میں ان لڑکوں کی تعریف کی ہے گو آگے چل کر یہ سب ... بے وقوف ثابت ہوئے۔

شعر نمبر ۵: نقشہ ایک اور نے جمایا　　پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا

تشریح: ان چار کے بعد بادشاہ کے ہاں ایک اور صاحبزادے کی ولادت متوقع ہوئی اور جو اولادیں ابھی تک نہیں ہوئی تھیں ان کا ہراول آیا۔ یا یہ کہ بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کے جو لواحقین اور عزیز زندہ بچتے اُن کے سردار کی آمد آمد ہوئی۔

شعر نمبر ۶: امید کے نخل نے دیا بار!　　خورشید حمل ہوا نمودار

تشریح: آخر کار امیدوں اور آرزوؤں کے شجر پر پھل آیا اور بادشاہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔

شعر نمبر ۷: وہ نور کہ صدقے مہر انور　　وہ رخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر

تشریح: اس بچے کے چہرے پر ایسا نور تھا کہ اسے انتہائی روشن سورج قرار دیا جاسکتا تھا اور حسن و جمال کے اعتبار سے بچے کا چہرہ ایسا تھا کہ اس پر دیکھنے والے کی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

شعر نمبر ۸: نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو　　چشمک تھی نصیب اس پدر کو

تشریح: پنڈت نسیم کہتے ہیں کہ گو بیٹے کو عام طور پر والدین کی آنکھوں کا نور قرار دیا جاتا ہے لیکن بادشاہ تاج الملوک کی قسمت میں اس بیٹے کے ہاتھوں رنج والم اٹھانا لکھے تھے۔

شعر نمبر ۹: خوش ہوتے ہی طفل مہ جبیں سے　　ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے

۱۰: پیارا یہ، وہ ہے کہ دیکھ اس کو　　پھر دیکھ نہ سکیے گا کسی کو

تشریح: لہذا بیٹے کے پیدا ہونے کی خوشخبری کے ساتھ بادشاہ کو نجومیوں کی طرف سے یہ اطلاع بھی ملی کہ پیدا ہونے والا عزیز بیٹا ایسا ہے کہ اگر آپ نے اسے دیکھ لیا تو پھر اور کسی کو نہیں دیکھ سکیں گے یعنی بادشاہ کی بینائی جاتی رہے گی اور بادشاہ اندھا ہو جائے گا۔

شعر نمبر ۱۱: نظروں سے گرا وہ طفل ابتر　　مانند سرشک دیدۂ تر

تشریح: چنانچہ نجومیوں کی طرف سے یہ اطلاع ملتے ہی یہ بدحال چھوٹا سا بچہ بھیگی ہوئی آنکھوں کے بے قیمت آنسو کی طرح نظر سے گر گیا۔ یعنی عام حالات میں جس طرح آنسوؤں کی قدر نہیں کی جاتی اسی طرح بادشاہ کی بھی اس بچے پر توجہ نہ رہی۔

شعر نمبر ۱۲: پردے سے نہ دایہ نے نکالا　　پتلی سی نگاہ رکھ کے پالا

تشریح: نجومی کی اطلاع کے باعث بچے کی دایہ نے بچے کو سخت پابندیوں میں رکھا اور اُسے پردے سے نکلنے نہ دیا اور جس طرح بچے کی پرورش سخت نگرانی میں ہوئی اور اس کی دیکھ بھال اس طرح کی گئی جیسے لوگ آنکھوں کی پتلی اور اپنی بصارت کی حفاظت کرتے ہیں۔

شعر نمبر ۱۳: تھا افسر خسرواں وہ گلفام　　پالا تاج الملوک رکھ نام

تشریح یہ لڑکا جو سرخ و سپید اور پھول جیسا نازک بدن تھا۔ اپنی عادات و اطوار کے اعتبار سے بادشاہوں کا بھی حاکم لگتا تھا۔ لہٰذا اس کا نام تاج الملوک رکھا گیا۔

شعر نمبر ۱۴۔ جب نام خدا جواں ہوا وہ — مانند نظر رواں ہوا وہ

تشریح جب بفضلِ تعالیٰ یہ لڑکا جوان ہوا تو یہ نظر کی طرح ہر کام میں ماہر ہو گیا یعنی اس نے ہر طرح کی تعلیم و تربیت حاصل کر لی۔

شعر نمبر ۱۵۔ آتا تھا شکار گاہ سے شاہ — نظارہ کیا پسر کا ناگاہ

تشریح ایک دن اتفاق سے بادشاہ شکار گاہ سے شکار کھیل کر آ رہا تھا کہ اچانک لڑکا سامنے آ گیا اور یوں بادشاہ نے اپنے بیٹے تاج الملوک کو دیکھ لیا۔

شعر نمبر ۱۶۔ صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی — بینائی کے چہرے پر نظر کی
۱۷۔ مہر لب شہ ہوئی خموشی — کی نور بصر نے چشم پوشی

تشریح بادشاہ زین الملوک نے تاج الملوک کو دیکھا اور اس امر کی تصدیق ہونے کے بعد جیسے ہی اپنی بینائی اور قوتِ بصارت کا جائزہ لینا چاہا تو بادشاہ کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی یعنی بادشاہ خاموش ہو گیا اس لئے کہ اُس کی بصارت اور بینائی رخصت ہو چکی تھی گویا نجومی کی پیش گوئی پوری ہو گئی اور بیٹے کو دیکھتے ہی زین الملوک اندھا ہو گیا۔

شعر نمبر ۱۸۔ دی آنکھ جو شہ نے رونمائی — چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی

تشریح قاعدہ ہے کہ کسی عزیز ترین رشتہ دار کو پہلی دفعہ دیکھنے پر کچھ رقم یا تحفہ دیا جاتا ہے، چنانچہ بادشاہ نے رونمائی اور منہ دکھائی پر تاج الملوک کو اپنی بینائی کا تحفہ دیا۔ لیکن بادشاہ کا یہ تحفہ تاج الملوک کے بھائیوں کو اپنی رنجش اور دلی کدورت کے باعث پسند نہ آیا یعنی تاج الملوک کے چاروں بھائی جو پہلے ہی شہزادے کے دشمن تھے، اس واقع سے فائدہ اٹھا کر دشمنی پر اُتر آئے۔

شعر نمبر ۱۹۔ ہر چند کہ بادشاہ نے ٹالا — اس ماہ کو شہر سے نکالا

تشریح لہٰذا بادشاہ کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود انہوں نے شہزادے تاج الملوک کو شہر بدر اور جلا وطن کر دیا۔

شعر نمبر ۲۰۔ گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور — خارج ہوا نور دیدۂ کور

تشریح تاج الملوک کو نکالا گیا تو ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ایک ایک گھر میں یہ شور بلند ہوا کہ اندھی آنکھوں کا نور رخصت ہو گیا۔ یعنی جو پہلے ہی نظروں سے گر گیا تھا اور جسے کمتر و ابتر خیال کیا جاتا تھا وہ اب شہر سے بھی نکال دیا گیا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ بادشاہ کے

اندھے ہونے کے چرچے گھر گھر ہوتے ملے ۔ لطف یہ ہے کہ پہلے معنی گزشتہ شعر سے متعلق ہیں جبکہ دوسرے معنی آئندہ آنے والے شعر سے پیوست ہیں ۔

شعر نمبر ۲۱: آیا کوئی لے کے نسخۂ نور لایا کوئی جا کے سرمۂ طور

تشریح لہذا بادشاہ کے اندھا ہونے کی خبر پھیلنے کے ساتھ ہی بہت سے لوگ بادشاہ کی خدمت میں آنے لگے ۔ کوئی بینائی بحال کرنے کی دوائیں اور نسخے لیکر آتا اور کسی آنے والے کے پاس کوہِ طور کا سرمہ ہوتا ، جسے آنکھوں میں لگایا جائے تو بینائی بحال ہونے کا امکان تھا ۔

شعر نمبر ۲۲: تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور

۲۳: ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے مختار ہے جس طرح نباہے

تشریح لیکن کس کی طاقت ہے کہ قسمت کے سامنے دم مار سکے یہاں پر انسان بے بس ہو جاتا ہے لہذا ہر طرح کے علاج معالجے کے باوجود زین الملوک کی اندھی آنکھوں کی بینائی بحال نہ ہو سکی ۔ دراصل اس دنیا میں وہی کچھ ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے اور انسان کی مرضی نہیں چل سکتی ۔ اس لئے کہ تمام اختیار اللہ ہی کے پاس ہیں اور یہ اُس کی مرضی ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھے ؛

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

حلِ لغات

الم ۔ غم ؛ بلبلِ خامہ ۔ قلم کا بلبل یعنی قلم ؛ نغمہ زن ۔ نغمے گاتا ؛ گلچیں ۔ پھول توڑنے والا ؛ اڑایا ۔ لوٹا ، چوری کیا ؛ کھلکھلایا ۔ ہنسا ، مسکرایا ؛ گل اندام ۔ پھول جیسے نازک اعضاء والا ؛ نکہت ۔ خوشبو ؛ ہوا ہونا ۔ غائب ہونا ، فنا ہونا ؛ گل کھلنا ۔ کوئی انوکھی بات واقع ہونا ؛ جل دینا ۔ دھوکا دینا ؛ داغ دینا ۔ رنج دینا ۔ تکلیف دینا ؛ نرگس ۔ ایک پھول ؛ سوسن ۔ ایک پھول جس کا رنگ آسمانی ہوتا ہے اور جسے زبان سے تشبیہہ دی جاتی ہے ؛ سنبل ایک قسم کا خوشبودار گھاس ؛ شمشاد ۔ ایک اونچا درخت ؛ خواصیں ۔ کنیزیں ؛ بید ۔ ایک درخت جس کی شاخیں بے حد لچکدار ہوتی ہیں ؛ نگاہ بازی ۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے کرنا ؛ زباں درازی کرنا ۔ گستاخی کرنا ، بدزبانی ، بے باکی ؛ بیگانہ ۔ غیر ، واضح ہو کہ سبزے کو بھی بیگانہ کہا جاتا ہے ؛ اوپرا ۔ غیر ۔ باہر سے ، بلندی ؛ کف ۔ ہتھیلی ، ہاتھ ؛ داغ ہونا ۔ صدمہ ہونا ، جل کر زخمی ہونا ؛ چراغ گل ہونا ۔ بیٹے کا مر جانا ، نسل کا خاتمہ ہونا ۔ تباہی و بربادی ہونا ؛ اوس پڑنا ۔ بے رونق ہونا ، شرمندہ ہونا ؛ ہوا دینا ۔ پتا نہ دینا ۔ اشتعال دینا ، ذراسی تکلیف دینا ؛ چنگل ۔ پنجہ ؛ مشکیں کسنا ۔ باندھنا ، گرفتار کرنا ؛ کہرام ۔ آہ و زاری ،

ماتم، رونا پیٹنا؛ راست۔ سیدھے؛ مو۔ بال؛ لبِ جو۔ ندی کا کنارہ؛ دم بخود۔ حیران و ششدر، خاموش، چپ؛ برگ۔ پتے؛ ہاتھ ملنا۔ افسوس کرنا؛

شعر نمبر ۲۴: گل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبل خامہ نغمہ زن ہے

تشریح ایک ایک گلستان میں پھول کے چوری ہونے کے غم کے سلسلے میں قلم کا بلبل یہ کہانی سنا رہا ہے۔ یعنی جب تاج الملوک نے گل بکاؤلی حاصل کر لیا تو بکاؤلی اور باغ کے دیگر لوگوں پر گزرنے والی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

شعر نمبر ۲۵: گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا!

۲۶: وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گل اندام

۲۷: جاگی مرغ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرش گل سے

تشریح پھول توڑنے والے نے جب وہ پھول توڑ لیا اور صبح ہوئی اور ہر طرف روشنی پھیلی تو نازک بدن اور خوبصورت بکاؤلی جو اس باغ کی حقیقی زیب و زینت تھی اور سو رہی تھی، باغ میں چہچہانے والے پرندوں کی آوازوں اور شور سے جاگی اور اپنے بستر سے اس طرح نکلی جس طرح خوشبو پھول سے نکل کر ہر طرف پھیل جاتی ہے۔

شعر نمبر ۲۸: منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشم حوض پائی

تشریح بیدار ہونے کے بعد وہ حوض کی جانب منہ دھونے کے لئے آئی تو اس نے دیکھا کہ حوض پانی سے بھرا ہوا ہے۔ شاعر نے حوض کی چشم کے ساتھ پُر آب استعمال کر کے اُس کے غمگین ہونے کا تصور دیا ہے۔

شعر نمبر ۲۹: دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

تشریح اُس نے دیکھا کہ گل بکاؤلی حوض میں نہیں ہے اور وہاں سے غائب ہو چکا ہے اور ایک نہایت انوکھا اور عجب واقعہ رونما ہو چکا ہے یعنی پھول چوری کر لیا گیا ہے۔

شعر نمبر ۳۰: گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل؟ — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل

تشریح جب بکاؤلی نے پھول کو غائب پایا تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ اُسے پریشانی یہ تھی کہ پھول کہاں چلا گیا۔ اُسے اس بات پر بہت غصہ آیا کہ کون شخص دھوکا دے کر پھول اُڑا لے گیا۔

شعر نمبر ۳۱: ہے ہے مرا پھول لے گیا کون! — ہے ہے مجھے داغ دے گیا کون

تشریح اُس نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ کون میرا پھول چرا لے گیا اور وہ کون شخص ہے جس نے مجھے رنج و تکلیف پہنچائی۔

شعر نمبر ۳۲:۔ ہاتھ اس پر اگر پڑا نہیں ہے　　　بُو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

تشریح: بکاؤلی کہتی ہے کہ یقیناً پھول کو کسی نے چرایا ہے۔ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کسی نے اُسے نہیں توڑا تو پھر آخر پھول کہاں گیا؟ پھول ہوا بن کر اُڑ اور غائب تو ہو ہی نہیں سکتا۔

شعر نمبر ۳۳:۔ نرگس تو دکھا کدھر گیا گل　　　سوسن تو بتا کدھر گیا گل

تشریح: بکاؤلی نرگس سے مخاطب ہو کہتی ہے کہ اے نرگس تو رہنمائی کر کہ پھول کہاں گیا اور اے سوسن تو بتا کہ پھول کون لے گیا۔ شعراء نرگس کو آنکھ اور سوسن کو زبان سے تشبیہ دیتے ہیں اس لئے نرگس کے ساتھ دکھانا اور سوسن کے ساتھ بتلانے کا ذکر آیا۔ گویا ساتھ ہی شک کا اظہار بھی کر دیا گیا کہ باہر سے تو کوئی آیا نہیں پھر یہ پھول نرگس اور سوسن کے سوا کون چرا سکتا ہے۔

شعر نمبر ۳۴:۔ سنبل مرا تازیانہ لانا　　　شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا

تشریح: اس لئے کہا گیا اے سنبل ذرا میرا چابک لاؤ اور اے شمشاد کے بہت ہی اونچے درخت تو ان کو یعنی نرگس اور سوسن کو چوری کی سزا دے اور سولی پر چڑھا دے۔

شعر نمبر ۳۵:۔ تھرائیں خواصیں صورت بید　　　ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

تشریح: بکاؤلی کی خاص کنیزیں اور خدمتگاریں پھول کی چوری اور بکاؤلی کی خفگی کے ڈر سے انتہائی نرم و نازک اور لچکیلے درخت بید کی طرح کانپنے لگیں اور ہر ایک دوسرے سے پوچھنے لگی کہ آخر پھول کی چوری میں کیا راز پوشیدہ ہے یعنی اوّل یہ سب حقیقتِ حال سے بے خبر ہیں اس لئے استفسار کر رہی ہیں اور دوسرے وہ چور کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہیں۔

شعر نمبر ۳۶:۔ نرگس نے نگاہ بازیاں کیں　　　سوسن نے زبان درازیاں کیں

تشریح: ایسی کیفیت میں نرگس جو بول نہیں سکتی تھی آنکھوں میں باتیں کرنے لگیں جبکہ سوسن جو صاحبِ زبان تھی، گستاخانہ گفتگو پر اتر آئی اور اُس نے زبان درازی کرنی شروع کر دی کہ ہمیں کیا علم گل بکاؤلی کدھر گیا اور اُسے کون لے گیا ہے۔

شعر نمبر ۳۷:۔ پتا بھی پتے کو جب نہ پایا　　　کہنے لگی، کیا ہوا خدایا

تشریح: لیکن تفتیش و تحقیق کے باوجود پھول تو کجا بکاؤلی کو پھول کا پتا تک نہ مل سکا کہ اس سے چوری کا احوال اُس پر کھل سکتا اور وہ چوری کے بارے میں کچھ اندازہ لگا سکتی۔ چنانچہ اِس صورتِ حال سے پریشان ہو کر وہ سوچنے لگی کہ اے خدایا آخر کیا ہوا اور پھول کہاں چلا گیا۔

شعر نمبر ۳۸:۔ اپنوں میں سے پھول لے گیا کون　　　بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون

تشریح اس باغ میں رہنے والے لوگ جو کسی نہ کسی طرح مجھ سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے پھول کس نے چرایا اور دیکھا جائے تو اس باغ میں سبھی اپنے لوگ ہیں بیگانہ اور غیر تو کوئی ہے ہی نہیں۔ سوائے اس کے کہ عام محاورے میں سبزے کو سبزۂ بیگانہ قرار دیا جاتا ہے۔

شعر نمبر ۳۹: شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا

تشریح یا پھر پھول کی چور شبنم ہے کہ وہی یہاں کے لئے غیر ہے اور باہر سے آتی ہے۔ باقی سب لوگ تو میرے باغ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ شبنم کے لئے اوپر کا لفظ نہایت مناسب ہے۔ غیریت کے معانی دینے کے لئے بھی اور بلندی کے معانی دینے کے لئے بھی۔

شعر نمبر ۴۰: جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

تشریح بے بسی کے عالم میں بکاؤلی بد دعائیں دیتے ہوئے کہتی ہے کہ جو شخص پھول چرا کرلے گیا ہے اور اب وہ پھول جس شخص کے قبضے میں ہے خدا کرے اُسے شدید صدمہ پہنچے یا وہ جل کر زخمی ہو جائے اور میرا پھول جس گھر میں موجود ہے خدا کرے کہ اُس گھر میں آگ لگ جائے یعنی گھر تباہ و برباد ہو جائے۔

شعر نمبر ۴۱: بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

تشریح بکاؤلی نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ بے شک میری غفلت اور بے پروائی سے پھول چوری ہوا اور میرا باغ بے رونق ہو گیا۔ گویا باغ کی ساری رونق اسی پھول کے دم سے تھی۔

شعر نمبر ۴۲: آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا

تشریح بکاؤلی کہتی ہے کہ یہ پھول تو مجھے اپنی آنکھوں سے بھی زیادہ عزیز تھا اور واقعتاً اگر میرے باغ کے حوض کو آنکھ فرض کیا جائے تو حوض میں اس پھول کی وہی حیثیت تھی جو آنکھوں میں پتلی کی ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح پتلی کے بغیر آنکھ بے کار ہے اسی طرح پھول کے بغیر یہ حوض بے قیمت ہے۔

شعر نمبر ۴۳: نام اس کا صبا نہ لیتی تھی ہیچ — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی پیچ

تشریح اے صبا میں تو اس پھول کا کہیں نام تک نہیں لیتی تھی یعنی اس کا معمولی سا ذکر بھی نہیں کرتی تھی کہ مبادا لوگوں کو اس کے وجود کی خبر ہو جائے اور لوگ اس کے درپے ہو جائیں اور مجھے اس پھول کو ذرا سی تکلیف دینا بھی منظور نہ تھا۔

شعر نمبر ۴۴: گلچیں کا جو پائے ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

تشریح افسوس کہ جب پھول توڑنے والے نے اسے توڑا تو غنچہ بھی کچھ نہیں بولا اور نہ اس نے توڑنے والے کو منع کیا۔ پھوٹنا، بولنے کے لئے ازراہ تحقیر آیا ہے اور چونکہ غنچہ کو گفتگو

کرتے ہوئے لبوں اور منہ سے تشبیہ دی جاتی ہے، لہٰذا یہ مضمون پیدا کیا گیا۔

شعر نمبر ۴۵: او خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

تشریح اے کانٹے! تو نے بھی بے پروائی کی اور پھول توڑنے والے کو اپنے پنجے میں گرفتار نہیں کیا اور اے سنبل! تو نے بھی اپنی رسیوں میں اس چور کو نہیں پکڑا۔ سنبل کے لانبے پتوں کو زلفوں اور رسیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے اس سے گرفتاری کی رعایت پیدا کی گئی ہے۔

شعر نمبر ۴۶: او بادِ صبا! ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا

تشریح اے بادِ صبا! بے شک پھول کی مہک کی وجہ سے تو پھول کا پتا جانتی ہے لیکن بے شک تو مجھے یہ پتا نہ بتا لیکن چلتے اتنی ہی مہربانی کر کہ اُس کی خوشبو ہی سنگھا دے تاکہ مجھے قدرے اطمینان حاصل ہو جائے۔

شعر نمبر ۴۷: بلبل! تو چہک اگر خبر ہے — گل! تو ہی مہک بتا کدھر ہے

تشریح اے بلبل! اگر سب تو پھول کے بارے میں کچھ خبر نہیں رکھتے لیکن اگر تجھے کچھ پتا ہے تو تُو ہی بتا دے ورنہ اے پھول تُو ہی اپنی خوشبو پھیلا تاکہ خوشبو کے ذریعے میں تجھ تک پہنچ سکوں۔

شعر نمبر ۴۸: لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزے سے راست مو بر اندام

تشریح بکاؤلی جس انداز میں پھول کی گمشدگی پر ماتم و زاری کر رہی تھی، زمین بھی اس کا منظر دیکھ کر خوف سے لرز رہی تھی اور زمین کے جسم پر کھڑا ہوا سبزہ بالکل سیدھا ہو گیا تھا۔

شعر نمبر ۴۹: انگلی لبِ جو پہ رکھ کے شمشاد — تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد

تشریح شمشاد کا درخت بکاؤلی کی یہ حالتِ زار دیکھ کر نہر کے کنارے اِس طرح کھڑا تھا جیسے کسی نے نہر کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی ہو شمشاد بجائے خود خاموشی کی علامت ہے۔ بہر حال شمشاد کا درخت بکاؤلی کی فریاد سن کر دم سادھے چپ چاپ کھڑا تھا۔

شعر نمبر ۵۰: جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

تشریح تمام درخت حیران و پریشان تھے اور سوچ رہے تھے کہ پھول کس نے چرایا اور بکاؤلی کی کس طرح مدد کریں۔ اسی طرح درختوں کے پتے بھی بکاؤلی کی حالت اور پھول کی چوری پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔

مرزا خاں داغ دہلوی

حل لغات غضب ۔ غضب اردو میں بہت سے معانی میں مستعمل ہے ۔ اس شعر میں سادگی، غلطی وغیرہ کے معانی میں استعمال ہوا ہے ؛ اعتبار ۔ یقین، بھروسہ، اعتماد ؛ اشکبار ۔ آنسو برسانے والا، رونے والا ؛ جتانا ۔ بتانا، یاد دلانا ؛ آشکار ۔ ظاہر، عیاں ؛ تغافل ۔ وہ غفلت جو جان بوجھ کر روا رکھی جائے ؛ رقیب ۔ دشمن، غیر ؛ شیوہ ۔ طریقہ، ڈھنگ ؛ داور محشر ۔ قیامت کے دن انصاف کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ ؛ مہر ۔ سورج ؛ خال ۔ تل ؛ سیہ رُو ۔ کالے چہرے والا، بدبخت، منحوس ؛

شعر نمبر ۱ : غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا　　　تمام رات قیامت کا انتظار کیا

تشریح داغ کہتے ہیں کہ محبوب نے ہمارے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا ۔ لہٰذا ہم شام سے اُس کا انتظار کرنے لگے لیکن شام سے رات اور رات سے صبح ہو گئی لیکن محبوب نہیں آیا گویا اُس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور حسبِ سابق وعدہ خلافی کی ۔ اس طرح دیکھا جائے تو ہمیں محبوب کا اعتبار ہی نہیں کرنا چاہیے تھا اس لئے کہ وہ ہمیشہ وعدے کرتا ہے اور پورے نہیں کرتا ۔ یہ ہماری سادگی اور غلطی تھی کہ ہم نے محبوب کے وعدے کا اعتبار کر لیا اور اس اعتماد کی وجہ سے تمام رات پریشان ہوتے ۔ شاعر نے قیامت کے انتظار کا ذکر کیا ہے اور محبوب کو قیامت قرار دیا ہے ۔

شعر نمبر ۲ : کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا　　　مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا

تشریح میں نے اپنی محبت اور اپنی وفا کا محبوب کو ہزارہا طریقوں سے یقین دلانے کی کوشش کی لیکن کسی طرح بھی محبوب نے ہماری محبت اور وفا کا اعتبار نہیں کیا اور یوں ہم ہمیشہ اپنی وفا کے جذبے کے سامنے شرمندہ اور نادم ہوتے رہے ۔ یعنی ہم وفائیں کرتے رہے اور محبوب نے بے وفائی کی اور ہمارے ہاتھ سوائے شرم و ندامت کے کچھ نہ آیا ۔

شعر نمبر ۳ : ہنسا ہنسا کے شبِ وصل اشکبار کیا　　　تسلیاں مجھے دے دے کر بیقرار کیا

تشریح محبوب ہم پر مہربان ہوا اور ہمیں شبِ وصل میسر آئی ۔ اس رات مارے خوشی کے یا محبوب کی گفتگو کے باعث ہم خوب ہنستے رہے لیکن ہنسنے ہی میں خوب روئے بھی ۔ انسان بے تحاشا ہنسے تو آنکھوں میں بھی بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں اور یہ رونا نہیں ہوتا لیکن شاعر نے اسے رونے سے تعبیر کیا ۔ گویا یوں خوشی کے موقع پر بھی خوشی میسر نہ آ سکی اور غم کا پہلو شاملِ حال رہا ۔ اسی طرح محبوب کے آنے پر ہمیں قرار آنا چاہیے تھا لیکن محبوب ہمیں تسلیاں دیتا رہا اور اپنی محبت

کا یقین دلاتا رہا اور یوں ہمارا اضطراب و بے قراری بڑھتے چلے گئے اور شب وصل سکون و قرار کی بجائے بے قراری نصیب ہوئی۔

شعر نمبر ۴: تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا — یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا

تشریح اے محبوب! ہم تیرے عاشق ہیں۔ لہٰذا تجھے چاہیے تھا کہ تو بھی صرف ہمیں اپنا حسن و جمال دکھانے کا وعدہ کرتا لیکن یہ کیا مصیبت ہے کہ تو نے تو ہماری بجائے ایک زمانے سے دیدار کے وعدے کر لیے ہیں جس کے نتیجے میں ساری دنیا تمہاری خواہاں ہو گئی ہے اور معلوم ہے کہ جس چیز پر سب کا دعویٰ ہو وہ کسی کی نہیں ہوتی۔ پس اے محبوب ہم تجھے اپنا سمجھتے تھے لیکن پتا چلا کہ تو ہمارا نہیں ہے اور بھی بہت سے لوگ تیرے دعویدار ہیں۔ گویا یوں تیرے دعوے ہمارے لئے بے کار ہو گئے۔

شعر نمبر ۵: بھلا بھلا کے جتایا ہے ان کو راز نہاں — چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا

تشریح ہم محبوب کے سامنے اپنی پوشیدہ محبت کا حال بیان کرتے تھے اور محبوب بھول جاتا تھا۔ ہم پھر اسے یاد دلاتے تھے اور وہ پھر بھول جاتا تھا۔ اس طرح ہم نے اپنی پوشیدہ محبت کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر اور واشگاف انداز میں اظہار مدعا کرنے کی بجائے اشارے کنائے میں محبوب پر ظاہر کیا۔ تاکہ اول تو محبوب کو ناراض ہونے کا کوئی موقع نہ ملے دوسرے ہم رسوائی اور بدنامی سے محفوظ رہیں۔

شعر نمبر ۶: ہم ایسے محو نظارہ نہ تھے جو ہوش آتا — مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا

تشریح اے محبوب! ہم لوگوں کی طرح محض سرسری طور پر ترا دیدار نہیں کر رہے تھے بلکہ ہم تو اس میں مگن تھے اس طرح کہ ہمیں اپنے نیک و بد کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔ اور اگر حالات یہی رہتے تو ہرگز ہمیں اچھے برے میں امتیاز نہ رہتا لیکن تو نے جان بوجھ کر ہم سے غفلت برتی اور تیری اس غفلت نے ہمیں چونکا دیا اور ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم خواہ مخواہ تیری محبت کے اسیر ہیں حالانکہ تجھ پر اس کا ذرا بھی اثر نہیں۔ یعنی اگر تو تغافل نہ برتتا تو ہم ساری عمر تیری محبت میں مبتلا رہتے اور حقیقت حال ہم پر کبھی نہ کھلتی۔

شعر نمبر ۷: رقیب و شیوۂ الفت خدا کی قدرت ہے — وہ اور عشق بھلا تم نے اعتبار کیا

تشریح رقیب نے محبوب کے سامنے اظہار عشق کیا لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو وہ ناکام رہا۔ اس صورت میں داغ کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ رقیب کے لئے وفا کا دستور نبھانا ناممکنات میں سے ہے اور وہ اس کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتا لیے محبوب! یہ تو تم ہی تھے کہ جس نے بغیر کسی امتحان کے رقیب کی باتوں اور اس کے دعوائے عشق کا یقین کر لیا۔

"خدا کی قدرت ہے" کا ٹکڑا واقعہ کے انوکھے پن کو ظاہر کرتا ہے۔

شعر نمبر۸:۔ تری نگہ کے تصور میں ہم نے اے قاتل — لگا لگا کے گلے سے چھری کو پیار کیا

تشریح: اے محبوب! ہم تیری نگاہوں کے ذریعے قتل ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمیں حسب خواہش یہ موقع میسر نہیں آتا۔ لہٰذا چھری اٹھاتے ہیں اسے اپنے گلے سے لگاتے اور پھر اسے چومتے ہیں اس لئے کہ ہم اسے بھی تیری نگاہ سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں تیری آنکھوں کی طرح قتل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چھری کو گلے لگانا بہت پُر لطف ہے۔ یعنی ایک طرف تو شاعر نے محبوب کی نگاہ کو چھری قرار دیا۔ پھر چھری کو گلے سے لگایا اور چھری گلا کاٹ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ گلے سے لگانا محاورہ ہے یعنی بے حد پیار کرنا اور کسی کو محبوب جاننا۔

شعر نمبر۹:۔ کچھ آگئے داور محشر سے ہے امید مجھے — کچھ آپ نے میرے کہنے کا اعتبار کیا

تشریح: داغ کہتے ہیں کہ اے محبوب بے شک تو نے میری بہت سی آرزوئیں پوری کیں اور میں جو کچھ کہتا رہا تم اُس کا یقین کرتے رہے لیکن اس کے باوجود میرے دل کی ساری خواہش پوری نہیں ہو سکیں اور بے شمار تمنائیں تاحال دل میں حسرتوں کی شکل میں موجود ہیں۔ اور یہ خواہشیں صرف قیامت کے دن اللہ تعالےٰ کے حضور پوری ہو سکتی ہیں لہٰذا اب خدا سے امید لگائے بیٹھا ہوں۔ غالبؔ نے یہی مفہوم بہت پر لطف انداز میں پیش کیا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

شعر نمبر۱۰:۔ بنے گا مہر قیامت بھی ایک خال سیاہ — جو چہرہ داغ سیہ رو نے آشکار کیا

تشریح: داغ کہتے ہیں کہ میں اتنا بدنصیب اور تیرہ بخت ہوں کہ اگر قیامت کے دن سامنے آگیا تو میری بدبختی کے باعث قیامت کے دن طلوع ہونے والا سورج بھی جس کی حدت و روشنی مثالی تصور کی جاتی ہے، ایک کالے تل کی حیثیت اختیار کرے گا اور اس کی آب و تاب بھی جاتی رہے گی۔

امیر مینائی

شعر نمبر۱:۔ گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں — مٹا ہوا سا نشان سر مزار ہوں میں

تشریح: امیر مینائی کہتے ہیں کہ میں اُن درویشوں اور قلندروں کی نشانی ہوں یعنی اُن کے اخلاف میں سے ہوں جو اب اس دنیا میں نہیں رہے اور یہاں سے کوچ کر گئے۔ اس طرح دیکھا جائے تو میں قبر کے سرہانے پر بنائے گئے مٹے ہوئے نشان کی حیثیت رکھتا ہوں۔ یعنی میری اپنی حیثیت کچھ

نہیں ہاں اگر ہے تو صرف اُن لوگوں کے باعث جو اب زیرِ خاک محوِ خواب ہیں۔

لفظ خاک نشیں بہت خوب استعمال ہوا ہے۔ ایک طرف اس کے معنی درویشوں قلندروں اور منکسر المزاج لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں دوسری طرف یہ موت کا استعارہ ہے اس لئے کہ قبر میں جانے کے بعد ہر شخص خاک نشیں ہی ہوتا ہے۔

شعر نمبر۲ :- نگاہِ کرم سے مجھ کو نہ دیکھ لے دوزخ ۔۔۔ خبر نہیں تجھے کس کا گناہگار ہوں میں

تشریح اے جہنم! تو مجھے غصّے اور قہر کی نظر سے نہ دیکھ۔ شاید تجھے معلوم نہیں کہ میں کس کا گناہگار ہوں اور کس نے مجھے سزا دی ہے۔ یعنی میں نے اللہ تعالیٰ کی حدود توڑیں اور اللہ ہی کی طرف سے سزا پائی ہے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ رحیم وکریم ہے لہٰذا وہ کسی بھی وقت مجھے معاف کر سکتا ہے۔ اور اگر اللہ نے معاف کر دیا تو پھر تجھے اپنے غصّے اور قہر کی وجہ سے پشیمان ہونا پڑے گا۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ابھی ہمارے ساتھ بہتر سلوک روا رکھ۔

شعر نمبر۳ :- پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے ۔۔۔ گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں

تشریح امیر مینائی کہتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے نیک وبد کے لئے جزا و سزا مقرر کر رکھی ہے لیکن یہ اُسی وقت تک ہے جب انسان خود اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ندامت اور پشیمانی کا اظہار نہ کر دے۔ ورنہ وہ کریم ہے اور اگر کوئی اپنی خطا کا اعتراف کرے تو اُس کی شانِ کریمی جوش میں آجاتی ہے جس کے سبب بڑے سے بڑے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی بدبخت ہو اور اعتراف نہ کرے تو پھر ابلیس اپنے کئے کی سزا آج تک بھگت رہا ہے۔ مختلف شعرا نے اللہ تعالیٰ کے کرم اور مہربانی کا ذکر بہت ہی اچھے انداز میں کیا ہے مثلاً گرامی کہتے ہیں۔

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما ۔۔۔ ایں را نہایت است نہ آں را نہایتے

شعر نمبر۴ :- جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے ۔۔۔ پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں

تشریح شاعر کہتا ہے کہ اوّل تو ساقی کے الطاف واکرام کے باعث کوئی میخوار ہوش میں آتا ہی نہیں لیکن اگر بالفرض کوئی شرابی اور مست ہوش میں آنے کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اُس کے ہوش میں آنے سے پہلے ساقی پکار اُٹھتا ہے کہ میں بھی ہوشیار ہوں اور اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوں یعنی تمہیں ہوش میں آنے نہیں دوں گا۔

شعر نمبر۵ :- وہ بے قرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری ۔۔۔ قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

تشریح میں ایسے بے قرار و بے سکون لوگوں میں شامل ہوں کہ اگر میری تڑپ صبر و سکون بھی دیکھے تو وہ بھی میری حالتِ زار کا اندازہ کر کے بے چین و بے قرار ہو جائے اور تڑپ اُٹھے۔

شعر نمبر۶ :- بڑے مزے میں گزرتی ہے بیخودی میں امیر ۔۔۔ وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

تشریح اے امیر! سرمستی اور مدہوشی کے عالم میں کسی طرح کی فکر نہیں ستاتی۔ کوئی اندیشہ پریشان نہیں کرتا اور یوں زندگی بڑے مزے سے گزر رہی ہے۔ خدا نہ کرے کہ وہ دن آئے جب میری مدہوشی ختم ہو اور میں ہوش کی باتیں کرنے لگوں۔ اس لئے کہ ایسا دن اپنے ساتھ ہزاروں بلائیں اور مصائب لے کر آئے گا جو مجھے منظور نہیں اور جن سے میں بچنا چاہتا ہوں۔

مولانا الطاف حسین حالی

سوانحی حالات الطاف حسین نام اور حالیؔ تخلص تھا۔ حالیؔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے محلہ انصاریاں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا جو محکمہ نمک میں ملازم تھے۔ حالیؔ کا سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد بلبن کے زمانے میں ہندوستان آئے اور حکومت وقت کی طرف سے پانی پت کا کچھ علاقہ جاگیر کے طور پر ملا۔ صرف نو برس کی عمر میں حالیؔ یتیم ہو گئے۔ ان کی پرورش برادرِ بزرگ اور ہمشیرہ کے زیرِ سایہ ہوئی۔ سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی محمد ابراہیم سے عربی کی تعلیم حاصل کی، سترہ برس کی عمر میں حالیؔ کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کر دی گئی۔ مگر علم کی پیاس سے مجبور ہو کر انہوں نے خاموشی سے گھر چھوڑا اور دہلی پہنچے اور دہلی کالج میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۵۶ء میں تحصیلِ علم کے بعد حالی حصار کے کلکٹر کے دفتر میں ملازم ہو گئے مگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران اس ملازمت کو چھوڑنا پڑا۔ کچھ عرصہ پانی پت گزارنے کے بعد حالی دوبارہ دہلی آئے اور غالبؔ کے شاگرد ہو گئے۔ اس وقت جہانگیر آباد کے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ بھی غالبؔ کے شاگرد تھے۔ نواب شیفتہؔ نے حالیؔ کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کیا اور اس طرح حالیؔ کو مالی فراغت نصیب ہوئی اور ادبی ذوق کی تسکین کے لئے نواب صاحب کے کتب خانے تک رسائی حاصل ہوئی۔ مگر ۱۸۶۲ء میں نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد حالیؔ نے دہلی آ کر مدرّسی شروع کی مگر یہاں کا ماحول بھی حالیؔ کو راس نہ آیا اور انہوں نے لاہور کے لئے رختِ سفر باندھا اور گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے جہاں اُن کے سپرد انگریزی سے ترجمہ ہونے والی کتب کی عبارت کی اصلاح کی خدمت تھی۔ اس طرح حالیؔ کو مغربی ادب اور تنقید سے آگاہی ہوئی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب انگریزی سرکار کی سرپرستی میں لاہور میں انجمن پنجاب قائم ہوئی۔ جس میں کرنل ہالرائڈ کے ایما پر حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ نے اردو شاعری کی اصلاح کی تحریک چلائی اور اس طرح اردو نظم کو حیاتِ نو نصیب ہوئی۔ اسی زمانے میں حالیؔ کی سرسید احمد خان سے ملاقات ہوئی اور حالیؔ نے ان کے زیرِ اثر قومی اصلاحی شاعری کا آغاز کیا اور مدّ و جزرِ اسلام جیسی معرکہ آرا مسدس تصنیف کی۔

سچ تو یہ ہے کہ سرسید کی تحریک کی کامیابی میں حالی کی اِس خدمت کو بڑا دخل ہے۔ حالی کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومتِ وقت نے ۱۹۰۴ء میں انھیں شمس العلماء کا خطاب دیا۔ آخری عمر میں حالی بینائی سے محروم ہو گئے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کی رات اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

محاسنِ کلام

مولانا حالی اردو کے پہلے مسلمان شاعر ہیں جنہوں نے سرسید کی اصلاحی تحریک کو فروغ دینے کے لئے شاعری کو ذریعہ بنایا۔ غلامی کے اس دور میں ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنوں پر تکلف، مبالغے اور منافقت کے جو گہرے بادل چھا گئے تھے حالی انہیں ہٹانا چاہتے تھے انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز اگرچہ ایک غزل گو شاعر کے طور پر کیا اور اُن کی ابتدائی غزلیں بھی قدیم روایتی رنگ لئے ہوئے ہیں مگر جلد ہی انہوں نے قدیم شاعری کے مضر اثرات کا شعور پاتے ہی اپنی شاعری کو جدید قومی تقاضوں کے راستے پر ڈال دیا۔ اس طرح حالی ہمیں قدیم و جدید شاعری کے سنگم پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

قدیم رنگِ تغزل

حالی اپنی سادہ طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے وضع دار اور قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ یہی وضع داری، قدامت پسندی اور روایت پرستی اُن کی قدیم شاعری کا خاصہ ہے۔ انہوں نے دورِ اوّل کے اساتذہ کی تقلید میں قدیم مضامین و خیالات کو اپنے خاص انداز میں اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے۔

~ اور اعتبار کھوتے ہو اپنا رہا سہا ۔ پس آ گیا یقیں ہمیں قسمیں نہ کھائیے!

~ اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا ۔ اُس کے بھی دل پہ تو نے چرکا لگا کے چھوڑا

~ ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی ۔ دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

وارداتِ حسن و عشق

حالی کی قدیم شاعری تقریباً وارداتِ عشق سے بریز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کا یہ ابتدائی عشق کا تجربہ انسانی خواہشات کی تکمیل کا سفر ہے۔ اس دور میں وہ اپنے جوان جذبات و محسوسات کا اثاثہ لئے شہرِ آرزو میں سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں۔ مگر قدیم شاعری میں بھی حالی اپنے عشق کے تمام تر والہانہ جذبوں کے باوجود شعور کی پختگی کی منزل پر پہنچے ہوتے ہیں۔

~ قلق اور دل کا سوا ہو گیا ۔ دلاسہ تمہارا بلا ہو گیا

~ ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال ۔ کہاں سادہ دل مبتلا ہو گیا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

جدید رنگِ تغزل

حالی جیسے حساس دل کے مالک کے لئے ۱۸۵۷ء کا خونی ہنگامہ ایک قیامت کا واقعہ تھا اُن کا دل و دماغ قوم کی بے بسی پر خون کے آنسو رونے لگا۔ انہوں نے قدیم غزل کی روایت پرستی اور مبالغہ آرائی کو ترک کر کے اردو شاعری کو حقیقت پسندی، سادگی، مقصدیت اور قومی شعور کے راستے پر گامزن کیا اور ان کی جدید غزل اُن کے حقیقی جذبات اور دلی کیفیات کی سچی تصویریں پیش کرنے لگی۔

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن — راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا — یہی ایک دن کام کر جائے گی
اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا — جس گھر میں سر اٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا

درسِ اخلاق اور پیغامِ عمل

سرسید کی تحریک سے وابستہ ہونے کے ناطے حالی ادب برائے زندگی کے قائل ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی ذلت و رسوائی اور زوال پذیری پر وہ خون کے آنسو روئے اور اب حالی ایک نئے حالی بن گئے۔ اُن کی شاعری درسِ اخلاق اور پند و نصائح کی امین بن گئی۔ اگرچہ حالی کی اس دور کی نظمیں اور غزلیں بھی رعنائی و زیبائی اور تغزل کا پیکر ہیں۔ مگر اس حسین پیکر میں بھی وہ دعوتِ فکر و عمل دیتے نظر آتے ہیں۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے — جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

زبان و بیاں کی سادگی

حالی کے کلام میں سادگی، صفائی، سلاست اور حسن کا احساس ملتا ہے۔ ساتھ ہی اُن کے اس سادہ طرزِ بیاں میں درد اور کسک کی لطیف لہریں بھی جاری و ساری ہیں۔ وہ زبان اور روز مرّہ کے استعمال میں بھی بہت احتیاط و اہتمام کے قائل تھے۔ اسی لئے اُن کے کلام میں لذتِ بیان کی خوشگوار چاشنی اور زورِ بیاں کا جادو موجود ہے جو انسانی شعور اور استدلال کو ہموار کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

۱۔ عقل پچھلی پر نہ سمٹی حرص و آز انساں کی — لے نہ اب نام آدمیت کا، اگر انسان ہے

۲۔ اس سے ناداں ہی بن کر ملئے — کچھ اجارہ نہیں دانائی کا!

۳۔ حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا — کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہیں رہے

۴۔ سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم! — ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے!

سوز و گداز | حالی کو غم روزگار کے تلخ تجربات سے گزرنا پڑا پھر ۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامے نے آشوب ذات کو آشوبِ زمانہ میں ڈھال دیا جس کے نتیجے میں اُن کے کلام میں سوز و گداز کا عنصر نمایاں ہوتا چلا گیا۔ بعض اوقات اُن کی وارداتِ دل اسقدر بے ساختہ اور پُر درد ہوتی ہے کہ گداز دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔

۔ اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

۔ اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا — بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

۔ اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ — وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

غزل نمبر۱

حلِ لغات | جستجو۔ تلاش، تجسس؛ خوب۔ اچھا، عمدہ؛ خوب تر۔ زیادہ اچھا؛ نظر۔ تمیز، جانچ پرکھ، توجہ، اُمید، توقع، انتخاب؛ دورِ جام۔ شراب کے پیالے کی گردش؛ خودی۔ انانیت، غرور، تکبر، ہوش و حواس؛ اختلاط۔ ربط و ضبط، میل جول، پیار، اخلاص، محبت؛ ربط، تعلق؛ گوارا۔ قابلِ برداشت، منظور، پسند خاطر؛ نیش۔ نوک دانی، ڈنک، زہر؛ کسل۔ تلخی، تھکاوٹ؛ نامہ بر۔ ڈاکیا، قاصد؛ کون و مکان۔ کائنات، دنیا؛ وحشی۔ گھبرایا ہوا، غیر مانوس۔ بھڑکنے والا؛ کنارہ گیر۔ علیحدہ۔ جدائی، قطع تعلق؛ خانماں خراب۔ تباہ حال، برباد، پریشان؛ نشاط۔ خوشی، مسرت، عیش و عشرت، فرحت، مزہ؛

شعر نمبر۱: ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ۔ اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

تشریح حالی کہتے ہیں کہ مجھے ہمیشہ یہ تلاش رہی ہے کہ ایک سے ایک اچھے سے اچھے محبوب تک رسائی حاصل کروں۔ اگر ایک محبوب خوبصورت ہے تو اس سے زیادہ خوبصورت محبوب کا عاشق بنوں۔ اسی جستجو نے مجھے ایک در چھوڑ کر دوسرے اور دوسرا در چھوڑ کر تیسرے پر جانے کے لئے مجبور کیا۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہا۔ اب معلوم نہیں کہ میری نگاہوں کا مرکز کون قرار پائے اور کون شخص میرے معیار پر پورا اترے۔

حق یہ ہے کہ حالی کا یہ شعر انسان کے جس جذبے کو سامنے لاتا ہے وہی جذبہ اس ساری کائنات کے ارتقاء اور انسان کی تمام کامیابیوں کا ذمہ دار ہے۔ انسان ازل سے قناعت پسند نہیں ہے اور اسے اعلیٰ سے اعلیٰ تر چیزوں کی تلاش رہتی ہے اور اسی سفر میں انسان نے وہ سب کچھ پایا ہے جو آج ہمارے گردوپیش موجود ہے۔

شعر نمبر۲:- ہیں دورِ جام اول شب میں خودی سے دور ۔ ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

تشریح ہم اس بات کے خواہاں تھے کہ محبوب کی محفل میں زیادہ سے زیادہ شراب پئیں لیکن ہمارے ظرف کا یہ عالم ہے کہ محبوب کی بزم میں جب شراب کا پیالہ گردش میں آیا تو ہم پہلے ہی پیالے یا پہلی ہی گردش میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور بیخود ہو گئے۔ اس صورتحال میں پریشانی یہ ہے یا ہمیں سوچنا یہ چاہیے کہ اگر یہی کیفیت رہی اور شراب کا سلسلہ جاری رہا تو معلوم نہیں صبح تک ہم کس حال کو پہنچیں گے!

شعر نمبر۳:- یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر! تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

تشریح حالی کہتے ہیں کہ ہمارا محبوب ہمارے حال پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ نہ وہ ہم پر مہربان تھا اور نہ ہم سے تعلقات اور میل جول بڑھانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر وہ اچانک ہم پر مہربان ہو گیا۔ محبوب کی اس قلبِ ماہیئت پر ہم حیران ہیں اور ڈر رہے ہیں کہ خدا کرے یہ اختلاط اور میل جول کی برائی اور نقصان پر منتج نہ ہو۔ اس لئے کہ محبوب نے جو اچانک تعلقات بڑھائے ہیں تو یقیناً اس کی کوئی اہم وجہ ہو گی جو ہمارے لئے مفید نہیں ہو سکتی۔

اس شعر میں انسان کی اس نفسی کیفیت کا نقشہ پیش کیا ہے جس کے تحت انسان دوسروں کے بدلتے ہوئے رویوں کو فوراً قبول کرنے کی بجائے چونک اٹھتا ہے اور انجام کے بارے میں متفکر ہو جاتا ہے۔ اسی مضمون کو غالب نے بھی بہت پُرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

شعر نمبر۴:- اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

تشریح حالی کہتے ہیں کہ عشق کے زہر، ڈنک، نشتر اور تکالیف و مصائب کو برداشت کرنا معمولی

بات نہیں ہے ۔ اس کے عادی ہونے کے لئے ایک طویل عمر درکار ہے ۔ یعنی انسان عشق میں لمبی عمر گزارے تو عشق کی تکالیف کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ موجودہ زمانے میں اپنے بے تحاشا مسائل و مشکلات کے باعث انسان عشق کی بدولت ہونے والے جگر کے زخموں سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتا ۔

شعر نمبر ۵: بس ہو چکا بیاں کسل و رنج راہ کا ‏ ‏ ‏ خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

تشریح ایک فطری بات ہے کہ قاصد پہلے اُن مشکلات و مصائب کا بیان کرنا چاہے گا جو سفر میں اُسے پیش آئیں تاکہ اُس کے حقیقی کارنامے کی قدر و اہمیت واضح ہو سکے ۔ دوسری طرف عاشق ہے جو ان سب چیزوں سے لاتعلق ہے اور اُس کے نزدیک زیادہ اہم چیز محبوب کے نام اُس کا خط اور محبوب کا جواب ہے ۔ لہذا عاشق قاصد کو کہتا ہے کہ آپ سفر کی تھکان ، تلخی اور مصیبتوں کا بہت ذکر کر چکے ہیں لہذا اب انہیں چھوڑیئے اور یہ بتایئے کہ محبوب نے میرے خط کا کیا جواب دیا ۔ نیز محبوب کا خط کہاں ہے ! مجھے وہ خط دیجئے تاکہ میں اپنا مقصد حاصل کر سکوں ۔

شعر نمبر ۶: کون و مکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر ‏ ‏ ‏ اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

تشریح میرا اس دنیا اور یہاں کے رویوں سے نامانوس دل ساری کائنات سے نفور اور لاتعلق ہونا چاہتا ہے اور یہ اس دنیا میں اپنے لئے کوئی کشش محسوس نہیں کرتا اور کوئی اپنے گھر کو اُس صورت میں چھوڑتا ہے جب اُسے دوسرا زیادہ اچھا گھر مل جائے لہذا میرے برباد و تباہ حال دل نے اس دنیا سے لاتعلقی اختیار کر لی ہے اور اس کمبخت نے آخر کار محبوب کے گھر کو اپنا مطمع نظر بنا لیا ہے ۔

شعر نمبر ۷: ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور ‏ ‏ ‏ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

تشریح اگر کسی عاشق سے یہ پوچھا جائے کہ تم اپنے محبوب سے کیوں عشق کرتے ہو ! تو شاید وہ کوئی ایک بھی ایسی خصوصیت نہ بتا سکے جو دوسرے عام لوگوں میں نہیں پائی جاتی اور آخر کار اُسے یہ کہنا پڑے کہ بس ایک بات ہے جو میرے محبوب میں ہے اور دوسرے کسی شخص میں نہیں ہے ۔ حالی نے بھی اس شعر میں عاشق کی اس نفسی صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اے محبوب تم جیسے ناک نقشے ، قد و قامت ، اور حسن و جمال والے بے شمار لوگ اس دنیا میں موجود ہیں ۔ اس کے باوجود ایک ایسی شے تم میں موجود ہے جو دوسرے کسی محبوب میں نہیں ، اور ہم اسی غیر محسوس چیز کی وجہ سے آپ کے عشق میں مبتلا ہیں ۔

صرف عاشق ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کسی ایک چیز کے مقابلے میں کسی دوسری چیز کو ترجیح دیتے ہوئے اکثر اوقات ہمارے پاس کافی وجوہات نہیں ہوتیں اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ

بس یہ چیز ہمیں پسند آگئی۔ یہی بات حالی کے شعر میں موجود ہے۔

شعر نمبر ۸: ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

تشریح حالی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص عشق ترک کرنے کی دعا کرے تو یہ دعا شرفِ قبولیت حاصل نہیں کرتی اور چونکہ عشق چھوڑ دینے کی دعا پوری نہیں ہوتی لہٰذا عشق سے بھی چھٹکارا نہیں ہو پاتا لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ترکِ عشق کی دعا قبول کیوں نہیں ہوتی؟ حالی اس کا سبب بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ دراصل دعا کرنے والا دعا کے معاملے میں خود مخلص نہیں ہوتا اور اُس کا دل عشق ترک کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ترکِ عشق سے متعلق دعا دل کی گہرائیوں سے نہیں کرتا اور چونکہ دعا خلوص سے نہیں کی جاتی لہٰذا پوری بھی نہیں ہوتی۔ اقبال نے ذرا مختلف انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ہے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

چونکہ ترکِ عشق کی دعا نہ پر رکھتی ہے نہ طاقتِ پرواز لہٰذا قبول بھی نہیں ہوتی۔

شعر نمبر ۹: حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب — آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

تشریح اے حالی تم اب صبح کے وقت میخانے میں آئے ہو اور یہاں اس وقت اگر نغمہ و شراب کا مزہ تلاش کر رہے ہو۔ حالانکہ نغمہ و شراب کی محفل تو رات کو جمی تھی اور رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ تم اب وقتِ صبح آئے ہو جب محفل ختم ہو چکی ہو۔ بھلا تم رات بھر کہاں غائب رہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حالی کے اس شعر میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے زوال کو موضوع بنایا گیا ہے۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات واں۔ وہاں؛ پرسش۔ پوچھ گچھ، دیکھ بھال، عزت، تعظیم، آؤ بھگت؛ یاں۔ یہاں؛ تابِ سخن۔ بات کرنے کی طاقت؛ موج زن۔ ٹھاٹھیں مارنے والا؛ صحبت۔ مجلس؛ محفل۔ دوستی؛ بناوٹ۔ تکلف، تصنع، مکر و فریب؛ درکار۔ ضرورت؛ دل شکن۔ دل توڑنے والی؛ عدم۔ نیستی، موت؛ راہ زن۔ ڈاکو، راستے میں لوٹنے والے؛ نظروں سے گرنا۔ ذلیل و حقیر ہونا، بے قدر ہونا؛ کہن۔ پرانی؛ حسنِ ظن۔ نیک خیال؛

شعر نمبر ۱: واں پرسش، نہ یاں تابِ سخن ہے — محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے

تشریح مولانا حالی کہتے ہیں کہ ہمارے دل میں محبت ٹھاٹھیں مار رہی ہے اور ہم اس جذبے کو کسی صورت دبا نہیں سکتے اور یہ ہر صورت میں اپنا اظہار چاہتا ہے لیکن ہماری بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ نہ تو ہمارا محبوب ہماری آؤ بھگت اور عزت و تعظیم کے لئے آمادہ ہے، نہ وہ ہمارا حال پوچھتا ہے کہ اُس کے سوال کے جواب میں ہم اظہارِ مدعا کر سکیں اور اگر بالفرض وہ پوچھ بھی لے تو ہم میں گفتگو کی طاقت نہیں

کر اپنا حال بتا سکیں۔ یوں گویا ہم دوگونہ عذاب میں مبتلا ہیں، ایک طرف محبت اپنا اظہار چاہتی ہے۔ دوسری طرف محبت کو ظاہر کرنے کا کوئی وسیلہ ہمارے پاس نہیں۔

شعر نمبر ۲: بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی — وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

تشریح عاشق ہمیشہ محبوب کی محفل میں رہنا چاہتا ہے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں کہ محبوب کی محفل میں ہمارا دل خوب لگتا ہے اور ہم وہاں سے اٹھنا نہیں چاہتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اول تو محبوب کی محفل ہمیشہ آراستہ رہتی ہے اور لوگوں کی دلچسپ گفتگو میں جاری رہتی ہیں لیکن اگر یہ بھی نہ ہو تو محبوب ایسی شخصیت کا مالک ہے کہ وہ تنہا اور اکیلا بھی ہو تو بھی اُس کے ساتھ مل بیٹھ کر انجمن میں بیٹھنے کا لطف حاصل ہوتا ہے اور اُس کے رنگین جلوے اور شیریں باتیں کسی اور طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتیں۔

شعر نمبر ۳: بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات — مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے

تشریح عام طور پر دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں یا تو ایسے جو بہت ہی مکار، فریب کار اور پُر تصنع ہوں یا ایسے کہ انتہائی سادہ دل ہوں۔ لیکن حالی کہتے ہیں کہ ہمارا محبوب بیک وقت ان دونوں خصوصیات کا حامل ہے، ایک طرف اُس کی کوئی بات تکلف اور تصنع سے خالی نہیں جبکہ دوسری طرف اُس کی ہر بات میں سادگی پائی جاتی ہے۔ محبوب کی یہی خصوصیت مرزا غالب نے بہت اچھے انداز میں پیش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

؎ سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

شعر نمبر ۴: بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار — تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے

تشریح حالی کہتے ہیں کہ اے محبوب! تمہاری ہر بات ایسی ہے جو ہمارا دل توڑ دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں تمہاری محفل میں آنے اور باتیں سننے کا اشتیاق بھی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تمہارے عاشق کے پاس بہت سے دل ہوں جو تمہاری باتوں پر ٹوٹتے رہیں اور عاشق غموں کو برداشت کرتا رہے۔

قدرے مختلف انداز میں مرزا غالب نے بھی یہی بات کہی ہے کہتے ہیں۔

؎ میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

شعر نمبر ۵: عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی — مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے

تشریح حالی کہتے ہیں کہ ہم کبھی کے یعنی بہت عرصہ پہلے زندگی کا سفر ختم کر کے موت کی وادی میں چلے جاتے لیکن کیا کریں کہ اس راہ میں عزیزوں، دوستوں، بھائیوں، بہنوں اور بچوں وغیرہ کی یاد رہزنی کے فرائض ادا کرتی ہے اور ہمارا قافلہ لٹ جاتا ہے اور جو قافلے

راستے میں ٹُوٹ جائیں وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچتے پہنچیں بھی تو بہت تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا زندگی کا سفر ختم نہیں ہو رہا۔ یعنی حالی کے نزدیک عزیزوں اور رشتہ داروں کی محبت انسان کو مرنے سے روکتی اور زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

شعر نمبر ۶:- گرچہ سب نظروں سے سب باتیں پرانی   مگر الفت کہ اک رسم کہن ہے

تشریح: حالی کہتے ہیں کہ نئی تہذیب، نئی معاشرت اور نئے رویوں کے باعث رفتہ رفتہ تمام پرانی چیزیں اپنی قدر و قیمت کھو چکیں اور اب ان میں سے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ البتہ ایک محبت ہے کہ زمانہ بدل جانے کے باوجود اور حد درجہ قدیم ہونے کے باوجود ہم سے چھوٹ نہیں سکتی اور زمانے کی یہ پرانی رسم آج تک ہم سنبھالتے چلے جا رہے ہیں۔

شعر نمبر ۷:- بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی   یہ سب تم صاحبوں کا حسن ظن ہے

تشریح: حالی جس دور میں پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے اردگرد جو کچھ دیکھا اس کی وجہ سے وہ عشق کے بہت خلاف ہو گئے تھے۔ اسی بناء پر اُن کے کلام میں اس طرح کے شعر ملتے ہیں۔

ے   اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا   جس گھر سے سر اُٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا

اسی نقطہ نظر کے باعث اُن کے نزدیک، وہ آدمی اچھا ہے جو محبت و عشق میں گرفتار نہیں اس پس منظر میں حالی کے مقطع کے معنی یہ ہوئے کہ اے لوگوں تم مجھے محبت سے خالی اور تہی دست سمجھتے ہو لیکن یہ تمہارا حسنِ ظن اور نیک خیال ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حالی جیسا بظاہر پارسا نظر آنے والا شخص بھی اس کے چنگل سے نجات نہیں پا سکا۔

قطعات

حلِ لغات: نکتہ چینی۔ عیب گری، مین میخ نکالنا، برائی نکالنا، تنقید؛ نام پیدا کرنا۔ شہرت حاصل کرنا؛ تالیف۔ مضامین و کتب مرتب کرنا؛ سعیٔ بلیغ۔ بے انتہا کوشش؛ لہو پسینہ ایک کرنا۔ سخت محنت اور جد و جہد کرنا؛ سخن۔ بات، شاعری؛ انشا۔ عبارت لکھنا، عبارت۔ تحریر؛ لیاقت۔ قابلیت؛ منشیوں۔ منشار، نثر لکھنے والے، ادیب؛

نکتہ چینی

قطعہ نمبر ۱:- باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں   جس طرح بن آئے بیٹا! نام پیدا کیجئے

کیجئے تصنیف اور تالیف میں سعیٔ بلیغ   اس میں ایک اپنا پسینہ اور لہو کر دیجئے

دیجیئے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا | اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجئے
اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں | شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجئے

تشریح ایک باپ نے اپنے بیٹوں کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو علم و فضل کے میدان میں شہرت حاصل کرو۔ کتابیں لکھنے اور مختلف کتابوں کو مرتب کرنے کی سخت اور بے انتہا کوشش کرو اور اس سلسلے میں خوب جدوجہد کرو۔ کوشش کرو کہ تمہاری شاعری اور نثر اپنی معنویت اور معنی آفرینی کے باعث بے انتہا پسند کی جائے اور تمہیں اعلیٰ درجے کا شاعر و ادیب مان لیا جائے۔ ایسی شاعری کرو کہ ہر بوڑھا اور ہر جوان تمہاری شعری صلاحیتوں کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائے۔

لیکن بالفرض اگر شاعری اور عبارت آرائی یعنی نثر لکھنے کی قابلیت تم میں نہ ہو اور آپ یہ کام نہ کر سکو تو پھر شہرت حاصل کرنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ شاعروں اور ادیبوں پر تنقید شروع کر دو اور اُن کے کلام میں جا بجا برائیاں نکالنے لگو۔

گویا حالیؔ بھی اپنے عہد کے ناقدین سے تنگ تھے۔ اُن کے نزدیک تنقید کرنا نہایت آسان ہے اور کوئی ادبی جملہ تحریر لکھنا انتہائی مشکل۔ اس کے ساتھ ساتھ حالیؔ کے نزدیک تنقید کرنا شہرت حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ لیکن آج کل معیارات بدل گئے ہیں اور شاعری و نثر نگاری کے مقابلے میں تنقید بھی کم اہم نہیں رہی۔

اسراف (قطعہ نمبر ۲)

حلِ لغات مُسرف۔ فضول خرچ؛ مُمسک۔ پکڑنے والا، بخیل، کنجوس، حریص؛ حبِ مال و زر۔ دولت کی محبت؛ سدا۔ ہمیشہ؛ سادہ لوح۔ بے وقوف، نادان؛

قطعہ نمبر ۲

ایک مسرف نے یہ ممسک سے کہا | کب تک اے ناداں یہ حبِ مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ | ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر
ہنس کے ممسک نے کہا اے سادہ لوح | زر لٹانا رائیگاں اور اس قدر
آج ہی گویا، نصیبِ دشمناں | آپ کا دنیا سے عزمِ سفر

تشریح یہ ایک مکالماتی قطعہ ہے جس میں ایک فضول خرچ آدمی کنجوس سے کہتا ہے کہ اے بے وقوف اور نادان آدمی آخر کب تک مال و دولت سے محبت کرتے رہو گے یعنی ایک وقت آئیگا جب تو مر جائے گا اور یہ دولت تیرے کام نہیں آئے گی اور بیکار پڑی رہے گی۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ تو روپے پیسے کو اس طرح جوڑ جوڑ کر اور جمع کر کے رکھتا ہے جیسے ہمیشہ اس دنیا میں رہنا ہے۔ حالانکہ انسان فانی ہے اور بہت جلد اس کی موت واقع ہو جائے گی لہٰذا جس قدر

ممکن ہو انسان کو عیش کر لینا چاہیے گویا وہ کہتا ہے کہ :-

مصرع — بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جز رس اور بخیل آدمی فضول خرچ انسان کی یہ بات سُن کر جواب دیتا ہے کہ بے وقوف اور سادہ دل شخص تو اپنی دولت کو بیکار ضائع کرتا ہے اور وہ بھی اس انداز میں جیسے تم کو اس دنیا میں بالکل نہیں رہنا اور تم آج ہی یہاں سے رخصت ہو رہے ہو۔

دیکھا جائے تو مولانا حالیؔ نے دونوں رویوں کی کجی ظاہر کر دی ہے۔ یعنی نہ تو حد سے زیادہ فضول خرچی اچھی ہے اور نہ حد سے زیادہ کنجوسی۔ انسان کو معتدل مزاج ہونا چاہیے اور مستقبل کے لئے کچھ نہ کچھ بچا کر رکھنا چاہیے۔

سخن سازی (قطعہ نمبر ۳)

حلِ لغات مرد - آدمی، انسان، شخص ؛ سخن ساز۔ چرب زبان، باتیں بنانے والا، فریبی، مکار ؛ سخن گو۔ شاعر ؛ ہیچ - معدوم، قلیل، نکما، ناکارہ ؛

قطعہ نمبر ۳:

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز — پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو
موجود سخن گو ہوں جہاں واں ہیں طبیب آپ — اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو
دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ — پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونو

تشریح مولانا حالیؔ کہتے ہیں کہ باتونی اور چرب زبان شخص بھی خوب چیز ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ دنیا کی کسی بھی محفل میں بیٹھا ہو ہر جگہ اپنی طویل الکلامی کے باعث محفل پر چھایا رہے گا۔ کہیں وہ شاعر و ادیب بن کر گفتگو کرے گا کہیں حکیم و طبیب اور معالج بن کر گفتگو کرے گا اور بالفرض اگر کوئی ایسی مجلس آراستہ ہو جس میں کوئی شاعر بیٹھا ہو تو پھر وہ شاعر ہونے کا دعویٰ کرنے کی بجائے معالج بن کر اپنی برتری ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا اور اگر محفل میں کوئی طبیب اور معالج بیٹھا ہو تو وہ فوراً شاعر کی حیثیت سے گفتگو شروع کر دے گا تاکہ کوئی اُسے روک ٹوک نہ کر سکے اور اُس پر حرف گیری کا کسی کو موقع نہ ملے۔ اگر محفل میں نہ کوئی شاعر ہو نہ طبیب تو پھر بھی ذات شریف ہوں گے۔ اور محفل پر چھاتے رہیں گے لیکن اگر بالفرض شاعر و ادیب اور معالج دونوں موجود ہوں تو پھر یہ صاحب صرف نکمے ثابت ہوں گے اور کسی بھی موضوع پر گفتگو نہیں کر سکیں گے۔ گویا حالیؔ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کو باتوں کا دھنی بننے کی بجائے کسی فن میں مہارت پیدا کرنی چاہیئے۔ صرف اِس طرح وہ اپنی عزت و وقار برقرار رکھ سکتا ہے۔

مسدس حالی سے انتخاب

حل لغات خطہ ، ملک ، حصہ ، زمین ، زمانہ : برِ اعظم ۔ زمین کا بڑا ٹکڑا ، زمین : محکم ۔ مضبوط ، مستحکم ، پائیدار : ۔ بِنا ۔ جڑ ، بنیاد ، اصل ، آغاز ، ابتدا : معمور ۔ بھرا ہوا : سر ۔ چوٹی : کوہ آدم ۔ لنکا کا ایک پہاڑ جس کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ حضرت آدمؑ اس پہاڑ پر اُترے تھے : کوہ بیضا ۔ وہ پہاڑ جس پر حضرت موسیٰؑ نے اللہ کا جلوہ دیکھا تھا ، کوہ طور : کھوج ۔ " ، نشان : سنگین ۔ پتھر سے بنے ہوئے : مرقد ۔ مقبرے : طلائی ۔ جس پر سونے کا کام کیا گیا ہو : معبد ۔ عبادت گاہ : یکسر ۔ تمام تر ، پورے کا پورا : نشانات : بیت حمرا ۔ غرناطہ کی مشہور عمارت جو اندلس کے مسلم حکمرانوں نے تعمیر کرائی تھی ۔ عدنان ۔ حضرت اسماعیل کی اولاد سے ایک شخص جس تک پیغمبر کا نسب نامہ مسلسل چلتا ہے : بانی ۔ بنیاد ڈالنے والا ، بنیاد رکھنے والا : ہویدا ۔ ظاہر ، عیاں ، نمایاں : شوکت ۔ زور ، قوت و دبدبہ ، رُعب : قدرت ۔ طاقت ، زور ، حوصلہ : نصیب ۔ مقدر ، تقدیر ، قسمت : رونا ۔ ماتم : محراب ۔ لغوی معنی ہتھیار ، وہ قوس یا کمان نما جگہ جہاں امام کھڑا ہو کر نماز پڑھاتا ہے : در ۔ دروازہ ، پھاٹک ، چوکھٹ : زبر و زبر ۔ تہہ و بالا ، تباہ و برباد : جلال ۔ رعب و دبدبہ : کندن ۔ خالص سونا : بلدہ ۔ شہر ، نگر ، بستی : بلاد ۔ شہروں ، بلد کی جمع : سکہ رواں ہونا ۔ حکم چلنا ، حکومت ہونا : نشان ۔ علم ، جھنڈا ، پرچم : رشک جناں ۔ بہشت کے لئے باعث غیرت : بادِ پندار ۔ غرور و تکبر کی ہوا : سیل تاتار ۔ تاتاریوں کا سیلاب جس نے مسلمان حکومت کا خاتمہ کیا : لقمان ۔ ایک مشہور حکیم اور دانا جس کے اقوال اور حکایت بہت مشہور ہیں اور اس کا ذکر قرآن شریف میں بھی آیا ہے : سقراط ۔ مشہور یونانی حکیم جسے زہر کا پیالہ پینا پڑا : دُرِ مکنون ۔ چھپے ہوئے جواہر اور موتی : اسرار ۔ راز ، بھید : بقراط ۔ سقراط کا استاد : فلاطون ۔ سقراط کا شاگرد مشہور عالم یونانی فلسفی : ارسطو ۔ افلاطون کا شاگرد مشہور یونانی فلسفی : سولن ۔ یونان کا مشہور قانون داں : کہنہ ۔ پرانا : مدفون ۔ دفن کئے ہوئے : سکوت ۔ خاموشی : مجروح ۔ زخمی : باراں ۔ بارش : حریم خلافت ۔ خلیفہ کے محلات : دفتر ۔ کتابیں ، رجسٹر ، کتب خانہ : لمعہ انگن ۔ روشنی پیدا کرنے والے : نوشتوں ۔ تحریروں : مزین ۔ آراستہ ، سجا ہوا : غلغلہ ۔ شور ، شہرت : کشور ۔ سلطنت ، مملکت : رصدگاہ ۔ ستاروں کی گردش کی جگہ : سواد ۔ گرد و نواح ، آس پاس : رصد ۔ مشاہدہ ۔ دیکھ بھال ، منجم ۔ ستارے دیکھنے والے ، فلکیات کے ماہر : مورخ ۔ تاریخ لکھنے والے : تحقیق ۔ اصلیت معلوم کرنا ۔ سچائی دریافت کرنا ، جانچ پڑتال ، تفحص ۔ جستجو ، تلاش :

آئین۔ دستور، قاعدے، طریقے ؛ نرالے۔ عجیب و غریب، انوکھے ؛ عالم۔ دنیا ؛ دفتر۔ رجسٹر، کتابیں ؛ سربسر۔ تمام تر، پورے کے پورے، سارے ؛ طرارے۔ چلانگ، گھوڑے کی جست، پھرتی، چستی، شیخی ؛ روایت۔ کسی کے حوالے سے کسی بات کو نقل کرنا، حکایت ؛ درایت۔ وہ اصول جن کی مدد سے کسی روایت کو عقلی طور پر پرکھا جاتا ہے ؛ شہادت۔ گواہی ؛ بحر۔ سمندر ؛ بر۔ خشکی ؛ خازن۔ خزانچی، جمع کرنے والا ؛ بشر۔ آدمی، انسان ؛ خبر۔ اطلاع و واقفیت، آگاہی، نشان، سراغ، علوم ظاہری ؛ اثر۔ تاثیر، علوم باطنی، نشان ؛ کسوٹی۔ امتحان، جانچ، پرکھ، وہ پتھر جس پر سونے کو کس کر دیکھتے ہیں ؛ راوی۔ روایت کرنے والا، بیان کرنے والا ؛ مناقب۔ تعریفیں، خوبیاں، اچھائیاں، اوصاف ؛ مثالب۔ برائیاں، نقائص، عیب ؛ تایا۔ پرکھا، جانچا ؛ مشائخ۔ بزرگ، اکابر، صوفیا ؛ قبح۔ قباحت، برائی۔ جتایا۔ واضح کیا ؛ ائمہ۔ امامت کرنے والے، پیشوا، ہادی ؛ طلسم۔ جادو ؛ ورع۔ پرہیزگاری، نیکوکاری ؛ صفا۔ پاکیزہ۔ مجلا، صیقل کیا ہوا ؛ سررشتہ۔ دستور، رواج، حکمہ، تعلق ؛ دین ہدیٰ۔ ہدایت دینے والا دین ؛ ہما۔ ایک خیالی و تصوراتی پرندہ جسے خوش نصیبی کا نشان سمجھا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ جس پر ہما کا سایہ پڑ جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے ؛ بخت و اقبال، اختیار و اقتدار ؛ ثروت۔ مال و دولت کی فراوانی، تونگری، دولت مندی ؛ اقبال۔ خوش قسمتی، عروج ؛ دنگل۔ مجمع ؛ زیر و زبر۔ تہہ و بالا ؛ ہر سو۔ ہر سمت، ہر طرف ؛ باغ رضواں۔ جنت ؛ خنداں۔ ہنستے، مسکراتے ؛ طراوت۔ نمی، تری، رطوبت، سرسبز و شاداب ؛ برگ۔ پتے ؛ پھول پھل ؛ ہونہار۔ وہ جس میں لیاقت اور قابلیت کے آثار پائے جائیں ؛ روکھ۔ درخت، شجر ؛ باراں۔ بارش ؛ ابر نیساں۔ بہار کا موسم ؛ تردد۔ فکر ؛

بند نمبر ۱۔ نہیں اس طبق میں کوئی بر اعظم — نہ ہوں جس میں اُن کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم — بناؤں سے ہیں اُن کی معمور عالم
سر کوہ آدم سے تا کوہ بیضا
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے اُن کا

تشریح واضح رہے کہ نصاب میں شامل بندوں میں مولانا حالی مسلمانوں کے عروج و زوال اور اس کی کیفیت و اسباب بیان کر رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کچھ خصائص و اوصاف ایسے تھے جن کی بنیاد پر مسلمانوں نے رہتے عالم پر انمٹ نقوش چھوڑے لیکن جب مسلمان اپنی خوبیوں سے محروم ہو گئے تو خود اُن کے آثار بھی باقی نہ رہے۔

پہلے بند میں مسلمانوں کے عروج اور بخت و اقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں خشکی کا کوئی ٹکڑا یعنی کوئی ملک ایسا نہیں تھا جہاں مسلمانوں نے انتہائی پختہ و استوار اور مضبوط عمارات تعمیر نہ کی ہوں، مولانا حالی کچھ علاقوں، شہروں اور ملکوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خواہ عرب ہو، ہندوستان ہو، مصر ہو یا اندلس، شام اور دیلم کے علاقے ہوں ہر جگہ مسلمانوں کے نقوش نظر آئیں گے اور ان کی تعمیرات کی بنیادیں ملیں گی۔

حالی کہتے ہیں کہ کوہِ آدم جس پر حضرت آدمؑ کو اتارا گیا تھا، سے لیکر کوہِ بیضا تک جہاں دیکھیئے مسلمانوں کے سراغ اور نشانات مل جاتے ہیں یعنی روئے ارض پر کوئی علاقہ ان کے آثار سے خالی نہیں۔

بند نمبر ۲: وہ سنگیں محل اور وہ اُن کی صفائی — جمی جن کے کھنڈروں پہ ہے آج کائی
وہ مرقد کہ گنبد تھے جن کے طلائی — وہ معبد جہاں جلوہ گر تھی خدائی
زمانہ نے گو اُن کی برکت اٹھالی
نہیں کوئی ویرانہ پر اُن سے خالی

تشریح مولانا حالی کہتے ہیں کہ پتھروں سے بنے ہوئے خوبصورت محلات اور انکی تراش و خراش اور بناوٹ میں اعلیٰ درجے کی نفاست موجود تھی لیکن بدقسمتی سے جب مسلمان زوال پذیر ہوئے اور اُن کا اقتدار مٹ گیا تو آج انہی عمارات پر وقت گذرنے کیساتھ ساتھ گرد و غبار اور کائی جم گئی یعنی یہ تباہ و ویران ہو گئے۔ حالی کہتے ہیں کہ مسلمان اکابر کے تعمیر کردہ وہ سنہری گنبدوں والے وہ مقبرے اور مساجد جہاں ایک زمانے میں کثیر تعداد میں لوگ رجوع کرتے اور عبادات میں معروف رہا کرتے تھے آج ویران ہو گئے اور اُن کی خیر و برکت ختم ہو گئی۔ لیکن اب بھی دنیا کا کوئی ویران سے ویران گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جو اُن سے خالی اور تہی دامن ہو یعنی یہ آثار ہر جگہ پر ملتے ہیں۔

بند نمبر ۳: ہوا اندلس اُن سے گلزار یکسر — جہاں اُن کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر — یہ ہے بیت حمرا کی گویا زباں پر
کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

تشریح مولانا حالی کہتے ہیں کہ مسلمان طارق بن زیاد کی سرکردگی میں ہسپانیہ پہنچے اور یہاں پر بنو امیہ کی حکمرانی قائم ہوئی جس کے بعد عربوں نے سارے اندلس کو ایک سرسبز و شاداب باغ میں بدل دیا۔ گو صدیوں پہلے یہاں سے مسلمانوں کی حکمرانی ختم ہو گئی لیکن اب تک اُن کے آثار و

نشانات باقی ہیں ۔ کوئی دیکھنا چاہے تو آج بھی اندلس جا کر اُن آثار و شواہد کو دیکھ سکتا ہے ۔ مثلاً غرناطہ کا بیت الحمراء آج بھی زبان حال سے اپنے دیکھنے والوں کو یہ کہتا نظر آتا ہے کہ خاندانِ قریش کے جدِ امجد عدنان کی آل و اولاد سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں نے مجھے تعمیر کیا تھا اور یہ کہ اندلس کی سرزمین پر میں انہی عربوں کی نشانی کی حیثیت سے موجود ہوں ۔

بند نمبر ۴ ۔ ہویدا ہے غرناطہ سے شوکت اُن کی — عیاں ہے بلنسیہ سے قدرت اُن کی
بطلیموس کو یاد ہے عظمت اُن کی — ٹپکتی ہے قادس میں سرحسرت اُن کی
نصیب اُن کا اشبیلیہ میں ہے سوتا
شب و روز ہے قرطبہ اُن کو روتا

تشریح آج کوئی غرناطہ کو دیکھے تو اُسے اندازہ ہو گا کہ اسکے بام و در سے مسلمانوں کی شان و شوکت عیاں ہے ۔ اندلس کا ایک اور شہر بلنسیہ میں آج تک مسلمانوں کے اختیار و حکمرانی کے نشان پائے جاتے ہیں ۔ بطلیموس جیسے شہر کو آج تک مسلمانوں کی عظمت و برتری کی کہانی یاد ہے اور وہ اسے نہیں بھولا ۔ قادس کے علاقے میں آج تک مسلمانوں کی ناتمام اور کبھی پوری نہ ہونے والی آرزوئیں حسرت بن کر موجود ہیں ۔ اشبیلیہ جیسے مقام کو دیکھئے تو پتا چلے گا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کی قسمت اور مقدر سو گیا اور قرطبہ رات دن مسلمانوں کے ماتم میں مصروف ہے یعنی یہ شہر مسلمانوں کی عزت و عظمت کو نہیں بھول پایا ۔

بند نمبر ۵ ۔ کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے — مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے — خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

تشریح اگر آج کوئی شخص قرطبہ جائے تو مسلمانوں کے دور کی وہ عمارات دیکھے جو اب تباہ و برباد ہو کر کھنڈروں میں بدل چکی ہیں ۔ مسلمانوں نے قرطبہ میں جو عظیم الشان مساجد تعمیر کیں اُن کے دروازے اور محرابیں دیکھے ۔ مسلمان عرب امراء اور بادشاہوں نے اپنے لئے جو گھر بنائے تھے وہ دیکھے اور مسلمانوں کا نظام حکومت جسے نیابت اور خلافت کہا جاتا ہے ، اُس کے تہ و بالا ہونے کی کیفیت کا مشاہدہ کرے ۔

اس کو معلوم ہو گا کہ آج بھی ان عمارات کے کھنڈروں سے عرب مسلمانوں کا رعب و دبدبہ اس طرح ظاہر ہوتا ہے جیسے مٹی میں خالص سونا چھپا نہیں رہ سکتا اور دور سے نظر آجاتا ہے ۔

بند نمبر ۶ ۔ وہ بلدہ کہ فخر بلادِ جہاں تھا — تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا

گڑا جس میں عباسیوں کا نشاں تھا — عراق عرب جس سے رشک جناں تھا
اُڑا لے گئی بادِ پندار جس کو
بہا لے گئی سیل تاتار جس کو

تشریح — مولانا حالی اندلس کے بعد بغداد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ شہر جو دنیا کے تمام شہروں کے لئے ہر اعتبار سے باعثِ فخر تھا اور دنیا کے ایک ایک گوشے پر جس شہر کی یا جس شہر میں رہنے والوں کی حکمرانی قائم تھی اور جہاں مسلمانوں کے عباسی خاندان نے حکومت قائم کر رکھی تھی اور جس شہر کی وجہ سے پورا عرب خطہ بطور خاص عراق جنت کا نمونہ بن گیا تھا، اُسے بھی غرور و تکبر کی ہوا نے تباہ و برباد کر دیا اور چنگیز خاں و ہلاکو خان کی قیادت میں آنے والے تاتاریوں کے سیلاب نے اس شہر اور یہاں کی حکومت کو تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا۔

بند نمبر ۷:۔ وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں — وہ اسرار بقراط و درس فلاطوں
ارسطو کی تعلیم سولن کے قانوں — پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مہر سکوت اُن کی ٹوٹی
اسی باغ رعنا سے بو اُن کی پھوٹی

تشریح — لقمان حکیم اور سقراط جیسے عظیم یونانی فلسفیوں کے خیالات اگرچہ موجود تھے لیکن چھپے ہوئے تھے اور اُن تک لوگوں کی رسائی نہ تھی۔ اس طرح بقراط کی حکمت کے اسرار و رموز، افلاطون کے اسباق، ارسطو کی تعلیمات اور سولن کے مدون کئے ہوئے قانون سب کے سب اِس طرح پڑے تھے جیسے کسی پرانی قبر میں کوئی فراموش شدہ مردہ دفن ہو۔

ان سب فلسفیوں اور ان کی تعلیمات پر جو خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی یہیں بغداد میں وہ مُہر ٹوٹ سکی اور اسی سرسبز و شاداب باغ میں منتقل ہونے کے بعد چار دانگ عالم میں ان فلسفیوں کی شہرت ہوئی۔ حالی کا مطلب یہ ہے کہ جب عربوں نے ان مشہور فلاسفہ کا ترجمہ کیا تو ان کے خیالات عام ہوئے اور علمی دنیا میں نئے سرے سے متعارف ہوئے ورنہ اہل علم انہیں بھول چکے تھے اور بڑی حد تک واقعہ بھی یہی ہے۔

بند نمبر ۸:۔ یہ تھا علم پرواں توجہ کا عالم — کہ ہو جیسے مجروح جویائے مرہم
کسی طرح پیاس اُن کی ہوتی نہ تھی کم — بجھاتا تھا آگ اُن کی باراں نہ شبنم
حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یونان کے دفتر

تشریح — حالی کہتے ہیں کہ بغداد میں عربوں نے علم و تعلیم پر اس قدر توجہ دی جیسے کوئی بیمار اور زخمی

شخص اپنے علاج کے لئے دوا اور مرہم کو تلاش کرتا ہے۔ مسلمان علماء کی پیاس کسی صورت کم نہ ہوتی تھی۔ علم کی تلاش کے لئے ان کے سینے میں جذب و شوق نے جو آگ روشن کر رکھی تھی وہ نہ تو بارش سے بجھ پاتی تھی نہ شبنم سے

کیفیت یہ تھی کہ مصر اور یونان نے پرانے زمانے میں جس قدر علمی ترقی کی تھی اور وہاں پر جس قدر کتب تصنیف کی گئی تھیں اور جو وقت کیساتھ ساتھ صرف الماریوں کی زینت بن گئی تھیں، اونٹوں پر لد لد کر بغداد پہنچیں اور یہاں خلیفۂ وقت نے بذاتِ خود ان کی قدردانی کی۔

بند نمبر ۹:۔ وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن   پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزین   کتب خانۂ پیرس و روم و لندن
بڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

تشریح مولانا حالی مسلمان علماء کو ستاروں سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ ستارے مشرق کی سرزمین پر روشن تھے لیکن ان کی روشنی صرف مشرق تک محدود نہ تھی بلکہ ان کی کرنوں سے مشرق سے مغرب تک سارا عالم منور تھا۔ گو سینکڑوں سال گزر گئے لیکن ان علماء کی کتابیں اب تک پیرس روم اور لندن کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

وہ لوگ جن کی لیاقت و قابلیت کا مختلف ملکوں میں شہرہ تھا وہ آج بغداد کی قبروں میں پڑے نہایت خاموشی سے محوِ خواب ہیں۔

بند نمبر ۱۰:۔ سمرقند سے اندلس تک سراسر   انھیں کی رصد گاہیں تھیں جلوہ گستر
سو دا مراغہ میں اور قاسیوں پر   زمین سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

تشریح حالی کہتے ہیں کہ وسط ایشیا کے شہر سمرقند سے اندلس کی سرزمین تک انہی مسلمانوں کی وہ تجربہ گاہیں موجود تھیں جن کے ذریعے یہ لوگ آسمان اور ستاروں کا مشاہدہ کرتے علم فلکیات سے اپنی دلچسپی ظاہر کرتے تھے۔ مراغہ کے گرد و نواح سے لے کر قاسیوں تک زمین سے مسلسل یہ آواز آ رہی ہے کہ جن کی فلکیات سے متعلق رصد گاہوں کے آثار جا بجا بکھرے پڑے ہیں وہ مسلمان ستارہ شناس اور علم فلکیات کے ماہر کہاں چلے گئے یعنی اب دنیا میں نہیں رہے اور اُن کا دور ختم ہو گیا۔

بند نمبر ۱۱:۔ مورخ جو ہیں آج تحقیق والے   تفحص کے ہیں جن کے آئین نرالے

جنہوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے　　زمیں کے طبق سربسر چھان ڈالے

عرب ہی نے دل اُن کے جا کے اُبھارے

عرب ہی سے وہ بھرنے سیکھے ترارے!

تشریح حالیؔ کہتے ہیں کہ موجودہ دور کے وہ تاریخ داں جو ہر بات کی حقیقت تک پہنچنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں بے انتہا چھان پھٹک کرتے ہیں اور جنہوں نے تلاش و جستجو کے بالکل نئے اور انوکھے اصول رائج کئے ہیں۔ جنہوں نے ساری دنیا کی کتابیں پڑھ لی ہیں اور جنہوں نے روئے عروض کا ایک ایک خطہ اور علاقہ چھان مارا ہے۔ ان لوگوں کے دلوں میں عربوں ہی نے اس تحقیق و جستجو کا شوق پیدا کیا تھا اور عربوں ہی کی وجہ سے یہ لوگ اِس میدان میں آگے آئے اور چست و چالاک ہوئے۔ گویا حالیؔ بجا طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ عربوں سے پہلے یورپ اور دیگر دنیا میں تحقیق و جستجو کی یہ کیفیت نہ تھی عربوں کی وجہ سے اس میدان میں ترقیوں کے دروازے کھلے۔

شعر نمبر ۱۲۸ اندھیرا تو اریخ پر چھا رہا تھا　　ستارہ روایت کا گہنا رہا تھا

ہدایت کے سورج پر ابر آ رہا تھا　　شہادت کا میدان دھندلا رہا تھا

سرِ رہ چراغ اک عرب نے جلایا

ہر اک قافلے نے نشان جس سے پایا

تشریح حالیؔ کہتے ہیں کہ عربوں کی علمی دنیا میں آمد سے قبل کیفیت یہ تھی کہ تاریخ پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ یعنی اس علم کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں رہی تھی اور اس کے اصول بھی مدون نہیں کئے گئے تھے۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ　روایت کے ستارے کو گہن لگ گیا اور اس کی روشنی ختم ہو گئی تھی یعنی مختلف لوگوں کے قول اور بیانات کے طریقوں کو نقل کرنے کے اصول اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ اس کے علاوہ درایت یعنی عقلی بنیادوں پر اقوال و واقعات کو پرکھنے کے اصول بھی ختم ہو گئے تھے اور عام طور پر یہ طریق کار ترک کر دیا گیا تھا۔

لیکن ایسے میں ایک عرب مورخ سامنے آیا جس نے انتہائی ناساعد حالات میں تاریخ کے اصول مدون کئے جس کی بدولت انسانی تاریخ میں گزرنے والے مختلف واقعات اور مختلف انسانی نسلوں کی کہانی ہمارے علم میں آ سکی۔ غالباً اس شعر میں ابن خلدون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بند نمبر ۱۳۸ اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو　　اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو

سنا خازن علم دیں جس بشر کو　　لیا اُس سے جا کر خبر اور اثر کو

پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پر رکھ کر
دیا اور کو خود مزا اُس کا چکھ کر

تشریح ان عربوں نے علم حاصل کرنے کی شدید خواہش اور اس جنون و عشق میں اپنے ہر سفر کو آسان بنایا یعنی ہر طرح کے سفر اختیار کیے۔ اس کے لئے خواہ انھیں خشکی کا سفر کرنا پڑا خواہ سمندروں کا وہ ہرگز نہیں گھبرائے۔ انھوں نے علم کے حامل جس شخص کے بارے میں سنا اُس کے پاس پہنچ گئے اور یوں ہر علم کی ظاہری و باطنی خصوصیات تک رسائی حاصل کی۔

پھر اس علم کو خود بھی جانچا اور پرکھا۔ اس کے معائب و خوبیاں معلوم کیں۔ اس کے بعد اسے ساری دنیا میں عام کیا اور اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا یعنی پہلے خود علم حاصل کیا اور پھر تعلیم دینے بیٹھ گئے اور علم عام کرنے میں کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لیا۔

بند نمبر ۱۴۸: کیا فاش راوی میں جو عیب پایا　　مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا!　　ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا

طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ مُلّا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

تشریح مسلمانوں نے مختلف واقعات کے روایت کرنے والوں میں جو نقص محسوس کیا اُسے چھپانے کی بجائے برملا بیان کیا۔ روایتوں میں مختلف اشخاص کی جو خوبیاں بیان کی گئی تھیں انھیں پرکھا اور جن برائیوں کا ذکر کیا گیا تھا انھیں بھی سامنے لایا گیا۔ عام لوگ تو درکنار بزرگوں میں بھی کوئی برائی دیکھی تو اُسے بیان کر دیا گیا۔ اسی طرح مذہبی رہنماؤں میں جو نقص نظر آیا وہ لوگوں کے سامنے لے آئے۔

وہ لوگ جو تقدیس کا لبادہ اوڑھ کر پاکباز بنے ہوئے تھے اُن کی پاکبازی اور پرہیزگاری کے جادو کو توڑا اور اس سلسلے میں نہ اُن سے کوئی مولوی بچا اور نہ کوئی صوفی۔

شعر نمبر ۱۵۰: یہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا کا　　گیا چھوٹ سررشتہ دین ہدیٰ کا
رہا سر پہ باقی نہ سایہ ہما کا　　تو پورا ہوا عہد جو تھا خدا کا

کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

تشریح لیکن جب پاک وصاف اور شفاف و صیقل کیا ہوا چشمہ گدلا ہو گیا اور مسلمان اپنے اصولوں سے ہٹ گئے تو ان کے ہاتھ سے ہدایت دینے والا دین جاتا رہا۔ ان کا بخت و اقبال اور اختیار و اقتدار جاتا رہا۔ تو خدا کا وہ وعدہ بھی از خود پورا ہو گیا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ

نے فرمایا ہے کہ ہم نے آج تک کسی قوم کو تباہ و برباد نہیں کیا جب تک اُس نے اپنی تباہی کا سامان از خود فراہم نہیں کیا اور اُس نے اپنی زندگی کے سنہری اصول نہیں چھوڑ دیئے اور اُس کی عام زندگی میں برائیاں راہ نہیں پا گئیں۔

بند نمبر ۱۶: نہ ثروت رہی اُن کی قائم نہ عزت — گئے چھوڑ ساتھ اُن کا اقبال و دولت
ہوئے علم و فن اُن سے ایک ایک رخصت — مٹیں خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت

رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

تشریح جب مسلمان بگڑ گئے اور انہوں نے اپنے اصولوں کو ترک کر دیا تو خدا نے بھی انہیں سزا دینے کا فیصلہ کر لیا جس کے نتیجے میں نہ ان کی دولت مندی ہی باقی رہی اور نہ باقی اقوام کے مقابلے میں اُن کی عزت و توقیر رہی۔ ان کا بخت و اقبال جاتا رہا اور جو علم و فنون انھیں آتے تھے اور جن کے باعث یہ ساری دنیا پر چھا گئے تھے، ایک ایک کر کے وہ سب بھی رخصت ہو گئے۔ ان میں اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی طور پر جو خوبیاں اور خصوصیات موجود تھیں آہستہ آہستہ وہ بھی ختم ہو گئیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ نہ دین و مذہب کے اصول باقی رہے اور نہ اسلام کے اصولوں پر مسلمان پہلے جیسی سختی سے کاربند رہے اور بدقسمتی سے یہ لوگ صرف نام کے مسلمان باقی رہ گئے۔

بند نمبر ۱۷: ملے کوئی ٹیلہ اگر ایسا اونچا — کہ آتی ہو واں سے نظر ساری دنیا
چڑھے اُس پہ پھر اک خردمند دانا — کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا

تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ
کہ عالم کو زیر و زبر پائے گا وہ!

تشریح مولانا حالیؔ ایک تخیل کے ذریعے مسلمانوں کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا اونچا ٹیلہ مل جائے جس پر چڑھ کر تمام دنیا اور اقوام کے حالات کا مشاہدہ کرنا ممکن ہو اور اس ٹیلے پر کوئی صاحبِ نظر، عاقل و بالغ انسان چڑھے اور قوموں کے عروج و زوال کی کیفیت کو دیکھے تو دنیا کی بے شمار قوموں میں اُسے بے انتہا فرق نظر آئے گا اور وہ دیکھے گا کہ اُس کی نظروں کے سامنے ساری دنیا تہہ و بالا ہے۔ یعنی وقت کے ساتھ ساتھ جو قومیں زوال پذیر تھیں اُنھیں عروج حاصل ہو گیا، جو عروج پر تھیں وہ زوال آشنا ہو گئیں۔ جو صاحبِ عزت و توقیر تھیں وہ ذلیل و خوار ہو گئیں اور جو ذلیل و خوار تھیں وہ صاحبِ بخت و اقبال بن گئیں۔

بند نمبر ۱۸:۔ وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن واں — بہت تازہ تر صورتِ باغِ رضواں
بہت اُن سے کمتر پہ سر سبز و خنداں — بہت خشک اور بے طراوت مگر ہاں
نہیں لائے گو برگ و بار اُن کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار اُن کے پودے

تشریح: یہ مردِ دانا اُس اونچے ٹیلے پر چڑھ کر اپنے ارد گرد ہزاروں باغات دیکھے گا۔ بہت سے باغات انتہائی سرسبز و شاداب ہوں گے یہاں تک کہ جنت کے لئے بھی باعث رشک ہوں گے۔ کچھ باغات اگرچہ ان کی نسبت کم بارونق ہوں گے لیکن اس کے باوجود تروتازہ ہوں گے لیکن کچھ باغات ایسے بھی ہوں گے جو خشک ہو چکے ہونگے اور سرسبز و شاداب نہیں ہونگے گو ان باغات کے پودوں پر پتے اور پھل پھول نہیں ہونگے اس کے باوجود مستقبل میں ان سے اچھی امیدیں قائم کی جا سکیں گی اور یہ باصلاحیت نظر آئیں گے یعنی کچھ قومیں انتہائی ترقی یافتہ نظر آئیں گی۔ کچھ ترقی کی منازل میں ہوں گی اور کچھ قوموں میں ترقی اور عروج کے امکانات پوشیدہ نظر آئیں گے۔

بند نمبر ۱۹:۔ پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر — جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر — ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

تشریح: پھر اس مردِ دانا کی نظر ایک ایسے باغ پر پڑے گی جو بالکل اجڑ چکا ہے جہاں سرسبز و شادابی نام کو بھی نہیں اور ہر طرف ویرانی و بربادی کی وجہ سے خاک اڑ رہی ہے۔ اس باغ میں نام کی حد تک یعنی معمولی سی تازگی بھی نہیں ہے۔ کسی زمانے میں اس باغ کے درختوں پر جو سرسبز و شاداب اور ہری بھری شاخیں ہوں گی وہ اس وقت سوکھ کر جھڑ چکی ہو نگی۔

اس باغ کی ایسی حالت ہے کہ اس میں پھول پھل آنے کا کوئی امکان موجود نہیں یہاں تک کہ اس کے درخت اب صرف جلانے کے کام آ سکتے ہیں اور بس۔

بند نمبر ۲۰:۔ جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں — جہاں آکے دیتا ہے رو ابر نیساں
تردد سے جو اور ہوتا ہے ویراں — نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

تشریح: اس باغ کی حالت یہ ہے کہ اگر یہاں پر بارش ہو تو وہ بھی اسے سرسبز و شاداب کرنے کی بجائے باغ کے لئے زہر کا کام کرتی ہے۔ موسم بہار کا بادل اس باغ کی ویرانی پر روتا

اور افسوس کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس باغ کی تعمیر و ترقی کے لئے جد و جہد اور کوشش و کاوش کرے تو اس کے نتیجے میں باغ میں مزید ویرانی پھیلتی ہے یہ ایسا باغ ہے جسے نہ خزاں راس ہے اور نہ بہار۔

اس باغ میں سے ایک آواز مسلسل آ رہی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا ویران ہو جانے والا باغ ہی ہے۔ گویا مولانا حالی کہتے ہیں کہ مسلمان تباہ و برباد ہو گئے اس حد تک کہ اب ان کی ترقی کے بھی امکانات موجود نہیں۔ بلکہ ترقی کی کوششوں کے نتیجے میں مزید انتشار اور ابتری پھیلتی ہے۔

اکبر الہ آبادی

سوانحی حالات اکبر حسین نام اور اکبر تخلص تھا۔ والدِ گرامی کا نام میر تفضل حسین تھا جو حضرت محمد قاسم داناپوری کے عقیدت مند تھے۔ اکبر کے آباء اجداد نیشاپور سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور الہ آباد کے ایک قصبے بارہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اکبر کی ولادت بھی ۱۸۴۶ء میں اسی قصبے میں ہوئی۔ اکبر بچپن سے ہی بہت ذہین تھے اور انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کے مختلف درجے بھی نہایت امتیاز سے پاس کئے۔ لیکن والد کے تارک الدنیا ہو جانے سے مالی وسائل محدود رہ گئے اور اکبر کی تعلیم جاری نہ رہ سکی مگر اکبر نے ہمت نہ ہاری اور ۱۸۸۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیل دار ہو گئے اور ترقی کر کے جج کے عہدے تک پہنچے اور اسی منصب سے ریٹائر ہوئے۔ حکومتِ وقت کی طرف سے انہیں خان بہادر کا خطاب بھی عطا ہوا۔ اکبر بچپن سے ہی شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ شاعری کے ابتدائی دور میں وہ خواجہ آتش کے شاگرد وحید کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ اُن کا ابتدائی کلام روایت کا تابع ہے مگر بہت جلد انہوں نے پرانی روش ترک کر کے طنز و مزاح کی وہ جدید طرز اپنائی جو اُن کی وجہ انفرادیت اور شہرت کا سبب بنی۔ برِصغیر میں مسلمان قوم کے زوال کا انھیں شدید احساس تھا۔ سر سید احمد خان کی اصلاحی تحریک سے انہیں زندگی بھر اختلاف رہا مگر وہ سر سید کی ذاتی عظمت اور خدمت کے معترف تھے۔

آخری عمر میں پہلے اُن کی بیوی اور پھر بیٹے ہاشم کا انتقال ہو گیا۔ یہ دونوں حادثے اُن کے لئے جانکاہ ثابت ہوئے اور آخری عمر نہایت افسردہ دلی اور شکستہ حالی میں گزری۔ آخر کار ستمبر ۱۹۲۱ء میں ۷۲ برس کی عمر میں اکبر الہ آبادی کا انتقال ہوا اور الہ آباد میں مدفون ہوئے۔

محاسنِ کلام

اکبر کی شاعری اگرچہ غزلیات و رباعیات کے علاوہ منظومات پر بھی مشتمل ہے مگر اُن کی وجہ شہرت اُن کی طنز و مزاح اور ظریفانہ شاعری قرار پائی۔ اکبر کا کمال یہ ہے کہ اصلاح کا جو کام حالیؔ نے قوم کی زبوں حالی پر نوحہ پڑھ پڑھ کر انجام دینا چاہا وہ اکبر نے اپنے طنز و مزاح کے نشتروں سے انجام دیا اور رو بہ تنزّل امتِ مسلمہ کے تنِ کاہل میں عظمتِ رفتہ سے آگہی خودشناسی کا گرم لہو دوڑانے میں بہت حد تک کامیاب رہے۔ اکبر کی شاعری کے کئی پہلو ہیں جو اُنکی نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی کے علاوہ اُن کی قومی دردمندی اور احساسِ ذمہ داری کے امین ہیں۔

قومی دردمندی کی تڑپ

اکبر کا زمانہ مسلمان قوم کے زوال کا زمانہ ہے مگر اُن کا دل دردمند اس صورتِ حال کو قبول نہ کرتے ہوئے تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب، بے علمی، اپنی اقدار سے دوری، اپنی روایات سے انحراف اور انگریزوں سے خوشامدانہ اور غلامانہ طرزِ عمل کو قرار دیتے ہیں اور اس پر طنز کرتے ہوئے مسلمانوں کو اصلاحِ احوال پر اُکساتے نظر آتے ہیں۔

ے ہم کو ساتے پر جنوں وہ دھوپ میں معروفِ کار
مس پر ہے اپنی نظر اور سیم اُن کے ہاتھ میں

ے جج بنا کر اچھے اچھوں کا بٹھا دیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوشنما وہ جیم اُن کے ہاتھ میں

ے مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب سے

عظمتِ رفتہ کی بازیافت

اکبر کو مسلمان قوم کی عظمتِ رفتہ سے ایک والہانہ لگاؤ ہے۔ وہ مسلمانوں کو جب مغربی تہذیب کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر اپنی اقدار اور روایات کو خیرباد کہتا دیکھتے ہیں تو انہیں ان کی کج فہمی پر افسوس ہوتا ہے۔ کبھی وہ نوحہ کناں ہو کر اُن میں احساسِ زیاں بیدار کرنا چاہتے ہیں اور کبھی طنز کے تیز نشتر سے اصلاحِ احوال کی کوشش کرتے ہیں تاکہ یہ قوم اپنے ماضی سے شناسا ہو اور اپنی کھوئی ہوئی منزل حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کردے۔

۱ے صبر باقی ہے نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے — سب کی ہے تذلیل اور تعظیم اُنکے ہاتھ میں
۲ے نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا — دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا
۳ے شباب عمر نے کھویا، طمع نے دین لیا — ٹھگوں نے ہم سے بڑی نعمتوں کو چھین لیا

مغربی تہذیب و تمدن سے بیزاری اکبر اقبال کی طرح مغربی تہذیب و تمدن کو اخلاقی اقدار سے تہی اور جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری خیال کرتے تھے اور مسلمانوں کے لئے اس کی پیروی زہر ہلاہل سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں مغربی معاشرت اور تہذیب سے بیزاری اور نفرت کا شدید جذبہ موجود ہے اور اس کی بیخ کنی کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

۱۔ تہذیب تو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر — دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنوار ہی ہے
۲۔ تعلیم کی خرابی سے ہو گئے بالآخر — شوہر پرست بیوی، پبلک پرست لیڈی
۳۔ بتوں کے پہلے بندے تھے مسوں کے اب ہوئے خادم — ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے با خدا ہونا

انگریزی الفاظ کا استعمال اکبر نے اپنے کلام میں انگریزی الفاظ کا استعمال بڑے سلیقے اور برمحل انداز میں کیا ہے بعض انگریزی الفاظ تو اُن کے اشعار کے سانچے میں ڈھل کر اپنی معنویت اور ترتیب کے اعتبار سے بے بدل ہو گئے ہیں اور یہ یقیناً اکبر کے فنِ شعر گوئی کا کمال ہے مگر طنز کی نشتریت یہاں بھی کم ہونے نہیں پائی۔

۔ اجل آئی اکبر گیا وقتِ بحث — اب اِف کیجئے اور نہ بٹ کیجئے!
۔ شیخ بھی باہر نہ نکلے اور گھر سے کہہ دیا — آپ بی اے پاس ہیں تو بندہ بی بی پاس ہے
۔ تھے معزز شخص لیکن اُن کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ ہے باقی جو ہے ناگفتنی

بدلتی اقدار اور معاشرت پر طنز اکبر نے مذہب، سیاست، اخلاق اور معاشرت کی مغربی تہذیب کے زیر اثر بدلتی اقدار پر کڑی تنقید کی ہے۔ خاص طور پر خواتین کی بے مہار آزادی کو بے شمار برائیوں کی جڑ قرار دیتے ہوئے اسے بھی اپنی تنقید کا ہدف بنایا کیونکہ مغربی بود و باش کی رسیا خاتون کبھی بھی اسلامی نظامِ معاشرت کا کارآمد حصہ نہیں بن سکتی۔

۔ بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا
۔ ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب — بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے
۔ رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

سرسید کی اصلاحی تحریک پر طنز بقول آل احمد سرور "سرسید کی تحریک کے مخالف کی حیثیت سے اُن کی شاعری مشرقیت، قدامت، وضع داری کی قدروں کی علمبردار ہے مگر وہ زمانے کا ساتھ نہیں دیتی۔ وہ محض سرسید اور زمانے پر طنز کر کے اپنا

دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں" دراصل اکبر مغربی تعلیم و طرز بود و باش کو مسلمانوں کے لئے روا نہیں سمجھتے تھے اور سر سید سے اختلاف کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔

حاضر ہوا میں خدمتِ سیّد میں ایک رات ۔۔۔ افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تم پر دین کی اصلاح فرض ہے ۔۔۔ میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

ترقی پاتے ہیں لڑکے ہمارے نورِ دیں کھو کر
یہ کیا اندھیر ہے بجھ لیتے ہیں یہ تب چمکتے ہیں

اور اس کا بڑا سبب اکبر کے خیال میں یہ ہے کہ :-

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم اُن کے ہاتھ ہیں ، تعلیم اُن کے ہاتھ ہیں

خالص مزاح اور ظرافت کے عمدہ نمونے

معمولی مزاح اور ظرافت محض الفاظ کے الٹ پھیر سے پیدا ہو سکتی ہے مگر عمدہ ظرافت کے لئے خیال کی ندرت بھی ضروری ہے پھر بات کو مبالغے سے بڑھا کر بیان کرنا یا گھٹا کر دکھانا، دونوں طریقے بڑے مزاح نگاروں نے استعمال کئے ہیں۔ اکبر کی ظرافت کے نہایت عمدہ نمونے وہ ہیں جہاں انہوں نے تاریخی حقائق و واقعات اور زندگی کے تقاضوں کے نشیب و فراز سے پُر لطف مضامین پیدا کئے ہیں ۔

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے ایک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے میں چوکتا بھی نہیں

ماں باپ سے ، شیخ سے ، اللہ سے اُن کو کیا کام
ڈاکٹر جنوا گئے ، تعلیم دی سرکار نے

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

اکبر کا رنگِ تغزل

اکبر کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری کے علاوہ اُنکی غزلیات بھی اپنی معنویت اور شعری محاسن کے اعتبار سے کسی صورت کم نہیں۔ اُن کی غزل تمام تر غزل کی صفات مثلاً غنائیت رمز و ایما ، سوز و گداز اور تغزّل کی ایک منفرد شان لئے ہوئے ہے اور اُس کا معیار اکبر کے معاصرین سے کسی صورت کم نہیں ۔

ع صورتِ ظاہر میں دل اک قطرۂ خوں تھا فقط
آگیا جب ہوش میں معنی کا طوفاں ہو گیا

ع ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ع وہی نگاہ جو رکھتی ہے مست رندوں کو
غضب یہ ہے کہ بڑی محتسب بھی ہوتی ہے

غزل نمبر۱

حل لغات تخت ۔ مسند، جو کہ مراد حکومت ؛ دیہیم ۔ تاجِ شاہی ۔ کلغی مراد حکومت ؛ طبائع ۔ طبیعت کی جمع ؛ بیم ۔ خوف، خطر، اندیشہ ؛ مس ۔ تانبا ؛ سیم ۔ چاندی ؛ اعزاز ۔ عزت، رتبہ، مرتبہ ؛ کوثر و تسنیم ۔ جنت کی نہریں جن سے نیک لوگوں کی پیاس بجھائی جائے گی ؛ روش ۔ طرز، انداز، طریقہ ؛ قلوب ۔ قلب کی جمع، دل ؛ دینِ ابراہیم ۔ وہ دین جو حضرت ابراہیمؑ لائے یعنی اسلام ؛ ہفت اقلیم ۔ سات سلطنتیں ۔ عظیم حکومت و سلطنت ؛

شعر نمبر۱،۲ تخت کے قابض وہی، دیہیم اُن کے ہاتھ ہیں ۔ ملک اُن کا، رزق کی تقسیم اُن کے ہاتھ ہیں
برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر ۔ آگیا تار امید و بیم اُن کے ہاتھ ہیں

تشریح مغربی تہذیب و تمدن جس تیزی سے ہندی مسلمانوں پر اثر انداز ہو رہا تھا، اکبر الہ آبادی اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہندوستان کی مسندِ اقتدار پر بھی انگریز متمکن ہیں اور ہندوستان کا تاجِ شاہی بھی انہی کے پاس ہے ۔ یعنی اس علاقے کے حکمران انگریز ہیں اور دنیا کا قاعدہ ہے کہ محکوم ہمیشہ حاکموں کی طرز میں ڈھلنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ خود قرآن کہتا ہے کہ عوام اپنے بادشاہوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں ۔ لہٰذا یہاں کے لوگوں پر مغربی اثرات کی بنیادی وجہ یہی ہے ۔

اس کے علاوہ عام لوگ اُن لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں جو مال و زر رکھتے ہوں اور کسی نہ کسی طرح وسائل رزق و آمدنی پر جن کا اختیار ہو اور چونکہ ہندوستان کے حکمران انگریز ہیں اور تمام وسائل انہی کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا لوگ ان کے طرزِ زندگی سے متاثر ہو رہے ہیں اور اُن کی تہذیب ہندوستان میں پھل پھول رہی ہے ۔ چونکہ انگریز لوگوں کو اپنی حکومت سے خوفزدہ کر سکتے ہیں اور اپنے وسائل سے لوگوں کو امید اور لالچ میں مبتلا کر سکتے ہیں لہٰذا لالچ اور خوف کے باعث یہ لوگوں کو بہت جلد متاثر کر سکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ بالکل اسی طرح جیسے بجلی کا بٹن دبایا ادھر بٹن روشن ہو گیا، اسی طرح انگریزوں کے اثرات لوگوں کی طبیعتوں پر پہنچتے اور اپنا نقش قائم کرتے ہیں ۔

شعر نمبر ۳:- ہم کو سائے پر جنوں ، وہ دھوپ میں مصروف کار
مس پر ہے اپنی نظر اور سیم اُن کے ہاتھ میں

تشریح: اس شعر میں اکبر انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام کا ہندوستانیوں سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم بنیادی طور پر سست الوجود اور کاہل ہیں یہاں تک کہ سائے میں یعنی اچھے حالات میں بھی محنت و مشقت کرنے سے گھبراتے ہیں جبکہ مغرب کے لوگ دھوپ اور مشکل ترین حالات میں بھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہم خسارے میں رہتے ہیں ۔ اس کے نتیجے میں ہم خسارے میں رہتے ہیں اور وہ کامیاب و کامران ٹھہرتے ہیں۔ گویا ہمارے حصے میں تانبے جیسی گھٹیا دھات آتی ہے اور اُن کے محنت کے ثمر کے طور پر انھیں چاندی جیسی قیمتی چیزیں ملتی ہیں۔

سائے اور جنوں کا ایک ساتھ ذکر بہت پُر لطف ہے۔ سایہ کے معنی چھاؤں بھی ہے اور بھوت پریت بھی ہے۔ دوسرے معانی کے ساتھ جنوں نے لطف پیدا کر دیا ہے۔

شعر نمبر ۴:- صبر باقی ہے، نہ ہم میں یا ہمی اعزاز ہے ۔ سب کی ہے تذلیل اور تعظیم اُنکے ہاتھ میں

تشریح: اکبر کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے پیچھے رہ جانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان میں صبر کی دولت موجود نہیں ۔ یہ کسی شخص کی بات برداشت نہیں کرسکتے اور فوراً لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ہر وقت ایک دوسرے کی تذلیل پر آمادہ رہتے ہیں دراصل یہ ایک دوسرے کی عزت کرنا ہی نہیں سکتے جس کی وجہ سے ان کے ہاتھ صرف ذلت آتی ہے اور تمام تر عزت انگریزوں کے ہاتھ میں آتی ہے۔ یعنی الف نے ب کو بُرا کہا اور ب نے الف کو۔ لیکن انگریزوں کے تعاون کے لئے دونوں اُن کی خدمت و تعظیم میں مصروف رہے یوں الف اور ب دونوں ذلیل ہو گئے اور انگریز قابلِ عزت قرار پایا۔

شعر نمبر ۵:- شیخ کی جانب کوئی جاتا نہیں کہتے ہیں سب ۔ ہے فقط اب کوثر و تسنیم اُن کے ہاتھ میں

تشریح: ہندوستانیوں کی ناکامی اور انگریزوں کی کامیابی کا ایک اور سبب بھی بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ انگریزوں نے ملازمتوں اور دنیاوی کامیابی کے لئے ایک نیا نظام تعلیم اور نئے معیارات رائج کر دیئے۔ جس کے سبب پرانا نظام تعلیم خاص طور پر علم دین بے کار ہو گیا۔ اور ظاہری طور پر دنیا میں منفعت بخش نہ رہا۔ لہٰذا عام لوگ مذہبی رہنماؤں اور مذاہب کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس علم سے ہماری عاقبت ضرور سنو جاتی ہوگی لیکن ہمارے دنیاوی مسائل حل نہیں ہوتے۔ یعنی دنیا مادہ پرست ہو گئی ہے اور اس میں صرف انگریزی تعلیم معاونت کرتی ہے۔ لہٰذا لوگ دین کو چھوڑ کر اس طرف مائل ہو رہے ہیں۔

شعر نمبر ۶:- مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب

قوم اُن کے ہاتھ ہیں، تعلیم اُن کے ہاتھ ہیں!

تشریح اکبر کہتے ہیں کہ مغربی تعلیم و تہذیب کی طرف آخر لوگوں کے دل کیوں مائل نہ ہوں اور لوگوں پر مغربی طرز و انداز کیوں موثر نہ ہو۔ اس لئے کہ اب وہی اس قوم کے حاکم ہیں اور انہوں نے اپنی مرضی سے اور اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے اپنا نظامِ تعلیم رائج کر دیا ہے جو لوگوں کو رفتہ رفتہ مذہب سے دور لے جا رہا ہے اور مادہ پرست بنا رہا ہے اور نیک و بد کے معیار بدل رہے ہیں اور اس اعتبار سے قوم بدل رہی ہے۔

شعر نمبر ۷:
خوب تر ہم سے ہیں اُن کے دل میں اخلاقی اصول
گو نہیں ہے دینِ ابراہیم اُن کے ہاتھ ہیں!

تشریح اکبر کہتے ہیں کہ گو انگریز اور دیگر مغربی اقوام مسلمان نہیں ہیں اور وہ حضرت ابراہیمؑ کے تعلیم کردہ دین پر عمل نہیں کرتے اس کے باوجود ہم مسلمانوں کی نسبت عام اخلاقی اصولوں پر یہ مغربی اقوام زیادہ بہتر طور پر عمل پیرا ہیں یعنی ایک طرف یہ قومیں حکمران ہیں، محنتی ہیں اور دوسرے ان کے پاس اخلاقی اصول بھی ہیں۔ لہٰذا وہ ہماری نسبت زیادہ کامیاب ہیں۔

شعر نمبر ۸: جج بنا کر اچھے اچھوں کا بٹھا لیتے ہیں دل ہیں نہایت خوشنما دو جیم اُن کے ہاتھ ہیں

تشریح اکبر کہتے ہیں کہ اس کے باوجود اگر کوئی عاقبت اندیش شخص انگریزوں کی مخالفت کرتا ہے اور اُن کے اثرات سے قوم کو بچانا چاہتا ہے تو انگریز اُسے عہدوں سے نواز دیتے ہیں اور دنیاوی اعزازات کے چکر میں وہ اپنے جذبِ اصلاح کو بھول جاتا ہے۔ کسی کو وہ جج بنا دیتے ہیں اور کسی کو ڈپٹی کلکٹر وغیرہ۔

اس شعر میں اکبر نے ایک طرف تو قوم کی اس پہلو سے زبوں اخلاقی صورتِ حال کا نقشہ کھینچا ہے کہ قوم کے اعلیٰ ترین افراد حصولِ اقتدار کے بعد اپنے مقاصد بھول جاتے ہیں گویا اُن کی جدوجہد صرف اقتدار اور عہدے کے لئے ہوتی ہے دوسری طرف اس شعر میں موجود طنز کا براہِ راست نشانہ بھی خود اکبر ہیں جو جج کے مرتبے تک پہنچے نیز اکبر نے اس شعر کا قافیہ پُر لطف انداز میں نظم کیا۔ دو جیم ملا دیئے جائیں تو جج بنتا ہے۔

شعر نمبر ۹:
مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی!
ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم اُن کے ہاتھ ہیں

تشریح اکبر کہتے ہیں کہ اگر مغرب اور مغربی لوگوں کی ترقی کی یہی رفتار رہی اور ہندوستانیوں یا مشرق کے رہنے والوں نے اپنی زندگی میں کوئی انقلاب پیدا نہ کیا تو یقیناً ایک دن ساری دنیا پر مغرب ہی کی حکمرانی قائم ہو جائے گی اور انگریزوں کی عظیم ترین سلطنت وجود میں آئے گی۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات دور ۔ زمانہ، گردش ؛ ارباب ۔ رب کی جمع ۔ پالنے والے ؛ گھٹنا ۔ کم ہونا ؛ نادم ۔ شرمندہ ؛

شعر نمبر ۱: اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

تشریح اکبرؔ کہتے ہیں کہ بے شک ہمارے دشمنوں نے ہمیں مٹا ڈالا اور برباد کر دیا ۔ لیکن اب ہماری بربادی اور اپنے اس کارنامے پر ان لوگوں کو حد سے زیادہ نہیں اترانا چاہیے ۔ اس لئے کہ گو آج وہ کامیاب اور کامران ہیں لیکن تقدیر کی گردش ابھی ختم نہیں ہوئی اور وقت کا بہاؤ بند نہیں ہوا ۔ لہٰذا اس امر کا امکان ہے کہ جو لوگ آج کامیاب ہیں وہ کل ناکام ہو جائیں اور آج جو شکست کھا گئے ہیں، وہ کل فاتح بن کر سامنے آئیں ۔

شعر نمبر ۲: اٹھتے جاتے ہیں اب اس بزم سے اربابِ نظر گھٹتے جاتے ہیں مرے دل کے بڑھانے والے

تشریح اکبرؔ کہتے ہیں کہ نظروں کو پالنے والے لوگ مراد صاحبِ نظر اور اچھے برے میں تمیز کرنے والے لوگ رفتہ رفتہ مر رہے ہیں اور اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں ۔ یوں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ جو پرانی تہذیب، اپنے اخلاقی اصولوں اور اپنی اقدار کو رواج دینے کی سعی کرنے پر میرا حوصلہ بڑھاتے تھے اب رفتہ رفتہ کم ہوتے جا رہے ہیں گویا اکبر کہنا چاہتے ہیں کہ آہستہ آہستہ پرانے لوگ اس دنیا سے اُٹھتے جا رہے ہیں اور جس تناسب سے یہ لوگ مر رہے ہیں اسی تناسب سے نئی تہذیب پھیل رہی ہے اور چونکہ نئی تہذیب کے مخالف آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں لہٰذا اس تہذیب کو پھیلنے سے روکا نہیں جا سکتا ۔

شعر نمبر ۳: خاتمہ عیش کا حسرت ہی پہ ہوتے دیکھا رو کے ہی اُٹھتے ہیں اس بزم سے گانے والے

تشریح اس شعر میں بعض علامتوں سے کام لے کر اکبر الہ آبادی نے ایک اہم اخلاقی اصول بیان کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ خواہ کسی بھی سبب سے ہی لیکن بزم میں گانے والے روتے ضرور ہیں ۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عیش و عشرت کی ہر محفل کا خاتمہ بہر حال حسرت اور نا آسودہ خواہش پر ہوتا ہے یعنی یا تو لوگوں کو مہیا اسباب و وسائلِ عیش ختم ہو جاتے ہیں یا پھر عیش و عشرت کی خواہش لئے لوگ خود اس دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں ۔ اور جب یہ طے ہے کہ عیش و عشرت کا انجام حسرت کے سوا کچھ نہیں تو پھر اپنے کامل اختیار کو کام میں لا کر اس سے نجات حاصل کرنا اور کسی بہتر کام پر اپنی توانائیاں صرف کرنا زیادہ اچھا ہے ۔

شعر نمبر ۴: موجِ معنی ہوئی گم، بندھ گئے الفاظ کے پل کچھ خبر ہے تجھے اے بات بنانے والے ۔

تشریح اکبر ایک ایسے شخص سے مخاطب ہیں جو عمل کی طرف راغب نہیں ہے اور محض گفتار کا غازی ہے۔ اکبر کہتے ہیں کہ اے بولنے والے شخص ذرا غور کر اور توجہ دے کہ اب تمہارے لفظوں میں معانی نہیں رہے اور محض لفظ ہی لفظ رہ گئے ہیں۔ یعنی جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سب کسی بھی سبب سے ہی لیکن بے فائدہ ہے اور اہل محفل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ یا تو خاموش ہو جایا جائے یا پھر اپنے لفظوں میں تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

شعر نمبر ۵: آپ اندھیرے میں ہیں بجلی سے مدد لیتے ہیں ۔۔۔ چاند سورج ہیں ہمیں راہ دکھانے والے

تشریح اس شعر میں اکبر کا مخاطب کوئی ایسا شخص ہے جو نئی تہذیب کا دلدادہ اور پرانی تہذیب سے بھاگتا ہے۔ اکبر کہتے ہیں کہ تمہیں نئی تہذیب اور اس کے علائم سے اس لئے مدد درکار ہے کہ تم اندھیرے میں ہو اور تمہیں کچھ سوجھ نہیں رہا۔ لیکن ہم پر ہماری راہیں روشن ہیں اور چاند سورج ہمیں راستہ دکھا رہے ہیں لہٰذا ہمیں مصنوعی اور مغربی تہذیب کی پیدا کردہ روشنی سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چاند سورج پرانی تہذیب اور مذہب کی علامت ہیں جبکہ بجلی جدید تہذیب کا استعارہ ہے۔

شعر نمبر ۶: بار احساں جسے کہتے ہیں، وہ ہے کوہ جفا ۔۔۔ کاش نادم ہوں یہ احسان جتانے والے

تشریح بے شمار لوگ دوسروں پر احسان کرتے ہیں لیکن وہ اپنی نیکی کو بھولنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی مناسب موقع پر اپنا احسان جتا کر زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے۔ اکبر کہتے ہیں کہ اس طرح کے احسانوں کا بوجھ ظلم وستم کے پہاڑ سے کسی طور کم نہیں۔ بلکہ ظلم وستم کی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے جبکہ احسان کے نیچے دبا ہوا آدمی کبھی سر نہیں اٹھا سکتا خاص طور پر اس صورت میں جبکہ احسان کرنے والا بار بار اس کا اظہار بھی کرے۔ اکبر کہتے ہیں کہ اے کاش اس طرح کا احسان کرنے والے لوگ شرمندگی محسوس کریں اور لوگوں کو پریشان وخوار کرنا چھوڑ دیں۔

شعر نمبر ۷: قدم شوق بڑھے، انکی طرف کیا اکبر ۔۔۔ دل سے ملتے نہیں یہ ہاتھ ملانے والے

تشریح اکبر ایک عام معاشرتی اصول بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لوگ عموماً خلوص اور حقیقی محبت کے باعث ایک دوسرے کی عزت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ بات معلوم ہو کہ دوسری طرف خلوص ومحبت ناپید ہیں اور محض ظاہر داری اور دکھاوا ہے تو پھر انسانوں کے ملنے جلنے میں تپاک کا عنصر نہیں رہتا۔ اکبر کہتے ہیں کہ یہی صورت میرے ساتھ ہے۔ لوگ مجھ سے خلوص کے ساتھ نہیں ملتے لہٰذا انھیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں دلی محبت اور خلوص سے پیش آؤں گا۔

رباعیات

رباعی نمبرا:۔ کیا تم سے کہیں، جہاں کو کیسا پایا — غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن — کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

تشریح اکبر کہتے ہیں کہ کسی کو کیا بتائیں اور کن لفظوں میں اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کریں کہ ہم نے دنیا کو کیسا پایا اور یہاں پر ہم کن تجربات سے گزرے۔ بس مختصراً یہ ہے کہ ہم نے ہر شخص کو اپنے معبود حقیقی اور اپنی زندگی کے اصل مقصد سے غافل پایا یعنی کوئی آدمی اپنے فرائض ادا نہیں کر رہا۔ اس دنیا میں یوں تو بہت سے لوگ ہیں اور وہ آنکھیں بھی رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ خدا کی قسم ایسی آنکھیں بہت کم دیکھیں جو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں اور ایسے لوگ بہت کم ملے جو بصیرت کی دولت سے مالامال تھے۔

رباعی نمبر۲:۔ غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا — افعال مُضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبرؔ نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی — جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

تشریح اکبر کہتے ہیں کہ اپنے مقاصد حیات سے غافل ہو کر خوش و خرم رہنے سے بہتر ہے کہ انسان دکھ اُٹھائے اور مصائب کا مقابلہ کرے لیکن اپنے مقاصد سے غفلت نہ برتے۔ اسی طرح اپنی ذات، قوم، ملت اور مقاصدِ حیات کو نقصان پہنچانے والے کام کرنے سے بہتر ہے کہ انسان کچھ نہ کرے اور نکما بیٹھا رہے۔ یعنی نکما رہنا بُری بات ہے لیکن بُرے کام کرنے اور ان میں مصروف رہنے سے نکما رہنا بہتر ہے۔ کہتے ہیں کہ اے اکبر میں نے غیرت مند لوگوں سے یہی سنا ہے کہ تذلیل و بے عزتی کے ساتھ جینے سے بہتر ہے کہ انسان اپنی جان دے دے اور مر جائے۔
رباعی کے دوسرے شعر میں سلطان ٹیپو کے اُس جملے کا عکس موجود ہے جو انہوں نے انگریزوں سے مقابلے کے وقت کہے تھے کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

حل لغات نیچر۔ فطرت، قدرت ؛ مکشوف۔ کھولا گیا اظہار کیا گیا ؛ مطلوب۔ مرکزِ نگاہ، مقصدِ اصلی، نظر پڑنے کی جگہ، محبوب ؛ مالوف۔ مانوس، خوگر، عزیز ؛

رباعی نمبر۳:۔ تکمیل میں اُن علوم کے ہو مصروف — نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمہیں — عہدہ مطلوب ہے، وطن ہے مالوف

تشریح اکبر نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے افرادِ اقوام! تمہیں اُن علوم کے حاصل کرنے کی طرف توجہ دینا چاہیے جو فطرت و قدرت کی عام طاقتوں کو بے نقاب کر دیں اور تم ان طاقتوں سے کام لے کر ترقی کرو لیکن مشکل یہ ہے کہ قوم تم سے کوئی امید نہیں کر سکتی اور تم قوم کو کوئی نفع نہیں

پہنچا سکتے اِس لئے کہ تم تعلیم محض اس لئے حاصل کرتے ہو کہ تمہیں کوملازمت، عہدہ اور منصب مل جائے۔ یہی عہدے تمہارا مقصد اصلی ہیں اور وطن سے تو تمہیں یونہی سا اُنس ہے ظاہر ہے کہ اس صورت میں تم وطن کی خدمت نہیں کر سکتے۔

رباعی نمبر۱۴

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو! | باتیں جو بُری ہوں، اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبرؔ | اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

تشریح اکبرؔ قوم کو انگریزوں کی تقلید محض کی بجائے ایسی باتوں کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں جو اُن کی حقیقی ترقی کا موجب بن سکیں اکبرؔ نصیحت کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہیں علم حاصل کرنا چاہیے اور اپنی طبیعت کی تیزی اور مختلف چیزوں کی تفہیم کے لئے کوشش کرنی چاہیے اس کے علاوہ وہ تمام باتیں جو بُرے نتائج پیدا کرتی ہیں اُن سے پرہیز اور دوری واجب ہے اس لئے کہ قوم کی عزت اچھی باتوں میں مضمر ہے اور محض انگریزوں کی نقل سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر انگریزوں کی زبان، لباس اور معاشرت کو اپنا لیا جائے تو اس سے ہمارا کچھ بھلا نہیں ہو سکتا البتہ اگر اُن کے علوم اور اخلاقی اصول اپنائے جائیں تو قوم ترقی کر سکتی ہے۔

اِس رباعی سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اکبرؔ انگریزوں اور اُن کی نقالی کے سخت خلاف تھے البتہ اُن کی علمی ترقی سے استفادے کے خواہاں تھے۔

قطعات

حل لغات تائید۔ حمایت، طرفداری؛ وضع۔ ساخت، بناوٹ، شکل، رنگ ڈھنگ؛ غریب۔ نادر، عجیب؛ طبیب۔ معالج؛ مداوا۔ علاج، درماں؛ دست کش۔ ہاتھ کھینچنا۔ تعلق نہ رکھنا؛ اجل۔ موت؛ سعی۔ کوشش؛

قطعہ نمبر۱،

تائیدِ وضع ملت و دیں کی کروں گا میں
اہلِ زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر
ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دست کش
سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سعیٔ طبیب پر

تشریح اکبرؔ کہتے ہیں دنیا والوں کو خواہ میری باتیں کتنی ہی ناپسند ہوں اور خواہ وہ میری باتوں کو نادر و عجیب سمجھ کر اُن کا کتنا ہی مذاق اُڑائیں لیکن میں اپنی ملت اور اپنے دین کے رنگ ڈھنگ ہی کی حمایت اور طرفداری کروں گا۔ اس لئے کہ بے شک آج میری قوم بیمار ہے اور ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں انتہائی زوال پذیر ہے لیکن چونکہ کوئی معالج اور حکیم اپنے مریض کے علاج سے بے تعلق

نہیں ہوتا خواہ اُس کی کوشش و کاوش اور علاج معالجے پر موت ہنستی اور اُس کا مذاق اڑاتی ہو یہی صورت میری بھی ہے۔ میں بھی اپنی قوم سے مایوس نہیں ہوں گا اور ہر طرح کی صورتِ حال میں اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔

قطعہ نمبر ۲:۔ بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

تشریح: اکبر انگریزوں کی تقلید میں اُن کی تہذیب و معاشرت کو اپنانے اور اپنی روایات سے منہ موڑنے والوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کل میں نے کچھ عورتوں کو بے پردہ دیکھا۔ یہ شرمناک منظر دیکھ کر میں سخت شرمندہ اور نادم ہوا اور ان عورتوں سے پوچھا کہ آپ پردہ کیوں نہیں کرتیں اور آپ کے پردہ کے لئے کام آنے والا برقعہ یا چادر کہاں گئی۔ اُن عورتوں نے جواب دیا کہ وہ پردہ جو ہم اوڑھا کرتی تھیں اب ہمارے مردوں یعنی شوہروں، بھائیوں اور باپوں کی عقل پر پڑ گیا ہے۔ عقل پر پردہ پڑنا محاورہ ہے جس کے معنی عقل کا خبط ہو جانا ہے۔ یعنی ہمارے مردوں کی عقل خبط ہو گئی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیں بے پردہ گھر سے باہر نکلنے دیا۔ اگر انہیں عقل ہوتی تو وہ اس کی اجازت نہ دیتے۔

عقل پر پردہ پڑنے کے محاورے سے اکبر نے خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہ محاورہ پورے قطعے کی جان ہے۔

قطعہ نمبر ۳:۔ دیکھا مناظروں کا بہت اُس نے رنگ ڈھنگ — اکبر کے دل میں اب نہ رہی بحث کی اُمنگ
کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرتِ مذاق — ایماں برائے طاعت و مذہب برائے جنگ

تشریح: اکبر کہتے ہیں کہ میں نے بہت سے مناظرے اور مباحثے دیکھے اور ان کے انداز پر غور کیا اور چونکہ ان سے یہ سبق حاصل کیا کہ مناظرے ہمارے ہاں بحث برائے بحث کے دروازے کھولنے اور منافرت بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کرتے لہٰذا اس صورتِ حال کے باعث میرے دل میں بحث و مباحثے کی کوئی خواہش موجود نہیں۔ حضرت مذاق بہت خوب کہا کرتے تھے کہ ہماری معاشرت میں ایمان تو اطاعت و فرمانبرداری کے لئے ہے اور مذہب کے نام پر صرف جنگیں ہوتی ہیں۔ گویا اکبر کہتے ہیں کہ اگر اس زمانے میں کوئی سچا دیندار ہے تو اُسے بحث مباحثے کی بجائے خاموشی سے اپنے فرائض مذہبی ادا کرنے چاہئیں۔

حلِ لغات: مفید۔ فائدہ مند۔ منافع بخش۔ خلائق۔ خلق کی جمع، مخلوقات، انسان۔ مستعد۔ تیار، آمادہ۔

قطعہ نمبر ۴:۔ انساں یا بہت سے دلوں کو ملا سکے — یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے

ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا — پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

تشریح — اکبر کہتے ہیں کہ میرے نزدیک، تو علم کی تعریف یہ ہے کہ یا تو انسان علم کی وجہ سے مختلف لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت اور عزت و احترام پیدا کرنے کے کام آئے اور دلوں کی نفرت کا خاتمہ کر دے یا پھر علم کے باعث کوئی ایسی چیز تخلیق کی جا سکے جو مخلوقات کو کسی پہلو سے کوئی فائدہ پہنچا سکے۔ اگر کوئی شخص ایسا علم پڑھانے کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہو تو میں پڑھنے کے لیے آمادہ و تیار ہوں۔

غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ اکبر ان اشعار میں اُن تمام علوم کی تکذیب کر رہے ہیں جو کسی ترکی طرح نسل انسانی کے لیے نقصان دہ ہیں۔

طویل قطعہ

حل لغات — یاس۔ ناامیدی ؛ شاہد۔ محبوب ؛ مقصود۔ مطلب ؛ سعی۔ کوشش، کاوش ؛ فرضی۔ قیاسی، غیر حقیقی ؛ قرطاس۔ کاغذ ؛ دقت۔ دشواری، مشکل ؛ ساس۔ خوش دامن۔ خاوند کی ماں، بیوی کی ماں ؛ کجا۔ کہاں ؛ آماس۔

قطعہ —

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو اُن کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ — کیا ہے میں نے جس کو زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر کرے ایم۔ اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق، کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوش طبیعت — کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے — ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی — مجھے سمجھا ہے کوئی ہر چرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغز سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ — تو استعفا مرا باحسرت و یاس

تشریح — اکبر کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کی ترقی اور خوشحالی سے مایوس ہو گیا ہوں۔ اب اُن کا کوئی علاج اور چارہ نہیں ہو سکتا بس ان کا خدا ہی حافظ ہے۔ کہنے کو تو یہ اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں اور اس حوالے سے ساری کائنات کو اپنے تصرف میں لانا چاہتے ہیں لیکن دوسری طرف ان

کی حالت یہ ہے کہ یہ سعی و کوشش کے قریب تک نہیں پھٹکتے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور محنت سے جی چراتے ہیں۔

اکبرؔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی حالت کے بارے میں میں تمہیں ایک قیاسی لطیفہ سناتا ہوں تم کو اس سے مسلمانوں کی صحیح کیفیت کا پتا چل جائے گا۔ یہ لطیفہ میں نے خود لکھا ہے اور کاغذ پر آتا را ہے۔ اکبرؔ کہتے ہیں کہ لیلیٰ کی ماں نے مجنوں کو کہا کہ اے مجنوں تم لیلیٰ کے خواہاں ہو اور بحالت موجودہ میں لیلیٰ کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتی البتہ اگر تم ایم اے کر لو اور کسی قابل ہو جاؤ تو کسی مشکل کے بغیر لیلیٰ تمہیں مل سکتی ہے اور میں اس سے تمہاری شادی کر دوں گی۔

مجنوں نے لیلیٰ کی ماں کی یہ بات سنی تو کہنے لگا کہ واہ آپ نے اچھی بات کہی ہے۔ کہاں میں عاشق جسے تمام دن کچھ نہیں کرنا پڑتا اور کہاں کالج جہاں دن رات پڑھنا پڑتا ہے اور محنت کرنا پڑتی ہے۔ کہاں عاشق کی طبیعت کا فطری جوش و خروش اور کہاں کالج کے مسلط کردہ قواعد و قوانین۔ اے بزرگ خاتون آپ کو کیا ہو گیا ہے اور آپ کی عقل کہاں چلی گئی ہے بھلا کسی نے آج تک ہرن پر بھی گھاس لادی ہے۔ گویا مجنوں کے نزدیک ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہے۔ عاشق کو صرف عشق کرنا چاہیے پڑھنا پڑھانا اس کا کام نہیں، لہٰذا وہ کہتا ہے کہ میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ اپنے دل کو لیلیٰ کے عشق میں خون کر لوں لیکن میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے سر کے مغز کو کسی طرح کی تکلیف پہنچاؤں اور اگر لیلیٰ کے حصول کے لئے ایم۔ اے پاس کرنے کی ہی شرط ہے اور اس سے مفر ممکن نہیں تو میں لیلیٰ کے عشق سے دستبردار ہوتا ہوں۔ یعنی اکبر کے نزدیک مسلمان محنت نہیں کرتے، اپنے مقاصد سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں وہ اپنے مقاصد کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔

نادر کاکوروی

گزرے زمانے کی یاد

تعارف: نادر کاکوروی کی اپچاس لائنوں پر مشتمل یہ نظم ہیئت کے اعتبار سے ایک عجیب و غریب تجربہ ہے۔ یہ نظم پانچ بندوں پر مشتمل ہے اور تمام بندوں میں مصرعوں کی تعداد متغیر ہے۔ اس نظم کے تین بندوں میں سات سات مصرعے ہیں جبکہ دوسرے اور چوتھے بند میں مصرعوں کی تعداد علی الترتیب پندرہ اور تیرہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر بند میں کہیں تو غزل، قصیدے اور قطعے کی مروج ہیئت استعمال کی گئی ہے کہیں مثنوی کا گمان ہوتا ہے اور بعض مصرعے ردیف قافیے کی بندش سے آزاد ہیں اور نظم معرّیٰ

کا تاثر دیتے ہیں۔

ہر بند کے آخر میں ثلاثی یا مخمس کی طرح ایک ایک مصرع آتا ہے اور چونکہ ہر بند کے آخر میں آنے والے اِس مصرعے کے الفاظ مختلف ہیں لہٰذا گمان ہوتا ہے کہ نظم ترکیب بند ہے۔ بعض جگہ یہ خیال گزرتا ہے کہ آخر میں آنے والے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو پہلے اور دوسرے بند کے آخری مصرعے باہم ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں جبکہ تیسرے اور چوتھے بند کے آخری مصرعے علیحدہ طور پر ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں اور آخری بند کا مصرع جداگانہ قافیہ و ردیف رکھتا ہے۔ اگرچہ ایک صورت میں ان تمام مصرعوں کو بھی ہم قافیہ کہا جا سکتا ہے لیکن اس صورت میں ان قوافی میں ایطائے جلی کا نقص موجود ہے۔

بند نمبر ۱:

اکثر شب تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں — بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی — اور ڈالتے ہیں روشنی

میرے دل صد چاک پر

تشریح: نادر کاکوری کہتے ہیں کہ رات کو سونے سے ذرا دیر پہلے جب میں تنہا ہوتا ہوں تو وہ تمام دلچسپیاں اور مشاغل جو ماضی کا حصّہ بن گئے اور عیش و مسّرت کے وہ تمام دن جو گذر گئے اور اب جن کی صرف یاد باقی ہے، زندگی کی شمع بن جاتے ہیں اور میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والے دل کو روشن کر دیتے ہیں۔ یعنی گزرے دنوں کی یاد چراغ بن کر جل اٹھتی ہے اور میں چراغاں کے اِس منظر میں کھو جاتا ہوں اور ماضی کو یاد کرنے لگتا ہوں۔

بند نمبر ۲:

وہ بچپن اور وہ سادگی — وہ رونا وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے — وہ دل لگی وہ قہقہے!
وہ عشق وہ عہد وفا — وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذت بزم طرب — یاد آتی ہیں ایک ایک سب
دل کا کنول جو روز و شب — رہتا شگفتہ تھا سو اب
اُس کا یہ ابتر حال ہے — اک سبزۂ پامال ہے
اک پھول کمہلایا ہوا — سوکھا ہوا بکھرا ہوا

روندا پڑا ہے خاک پر

تشریح: نادر کاکوری کہتے ہیں کہ رات کو سونے سے ذرا دیر پہلے جب میں تنہا ہوتا ہوں، مجھے اپنا بچپن اور اُس زمانے کی سادہ دلی یاد آتی ہے۔ کبھی معمولی معمولی باتوں پر رونا اور کبھی انتہائی

غیر اہم چیزوں پر خوش ہونا یاد ہے۔ بچپن کے بعد جوانی کا دور ہے اور جوانی کے اُن مزوں کو یاد کرتا ہوں جو اب گزر گئے۔ جوانی کے زمانے کا ہنسی مذاق اور قہقہے یاد آتے ہیں۔ اس دور کا عشق اور دفا کے وعدے محبوب کی طرف سے وصال کے وعدے اور اُن پر ہمارا سراپا سپاس ہو جانا یاد آتا ہے۔ عیش و مسرت کی محافل کی تمام لذتیں ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں۔ مجھے اپنے دل کا کنول یاد آتا ہے جو رات دن تر و تازہ اور ہنستا مسکراتا رہتا تھا لیکن اب تباہ ہو گیا اور جس کی کیفیت اُس سبزے کی مانند ہے جو روندا گیا ہو۔ اب میرا دل اُس پھول کی طرح ہے جو اپنا آب و رنگ کھو کر مرجھا، سوکھ اور بکھر گیا ہو اور جسے آنے جانے والوں کے قدموں نے روند ڈالا ہو اور جو اب خاک پر روندا ہوا پڑا ہے یعنی اب اس کی کوئی قدر و قیمت اور کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔

بند نمبر ۳،۴

یوہنی شب تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی ناکامیاں — بیتے ہوئے دن رنج کے
بنتے ہیں شمع بے کسی — اور ڈالتے ہیں روشنی
اُن حسرتوں کی قبر پر
جو آرزوئیں پہلے تھیں — پھر غم سے حسرت بن گئیں
غم دوستوں کے فوت کا — اُن کی جوانا موت کا
لے دیکھ شیشہ میں مرے — اُن حسرتوں کا خون ہے
جو گردشِ ایام سے — جو قسمت ناکام سے
یا عیشِ غم انجام سے — مرگ بت گلفام سے
خود دل ہی میں میرے مرگئیں — کس طرح یاؤں میں جڑیں
قابو دل بے صبر پر

تشریح: رات کو سونے سے ذرا دیر پہلے رات کی تنہائی میں مجھے وہ ناکامیاں یاد آتی ہیں جو اب گذر گئیں۔ وہ دن یاد آتے ہیں جو رنج و تکلیف سے معمور تھے اور اب بیت گئے ہیں۔ گویہ دن اور یہ ناکامیاں ختم ہو گئیں لیکن اب وہ تنہائی اور لاچاری و عاجزی کی شمع بنتے ہیں اور ہماری اُن ناتمام خواہشوں کو روشن کر دیتے ہیں جو کبھی آرزوئیں اور تمنائیں تھیں لیکن اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکنے اور ناکام ہو جانے کے باعث حسرتوں میں بدل گئیں۔

ایسے ہی مجھے اپنے وہ دوست یاد آتے ہیں جو عین عالم جوانی میں فوت ہو گئے۔ تم میرے دل کے شیشے میں دیکھو تو تمہیں نظر آئے گا کہ دل کا یہ پیالہ اُن حسرتوں کے خون سے

بھرا ہوا ہے جو زمانے کی گردش یا تقدیر کی نامرادی کے باعث پوری نہ ہو سکیں۔ یا جن کے پورا نہ ہو سکنے کا سبب ایسا عیش تھا جس کا اخیر ہمیشہ غم و اندوہ ہوتا ہے۔ یا جو خواہشیں اس لئے پوری نہ ہو سکیں کہ ہمارا نرم و نازک اور خوبصورت محبوب فوت ہو گیا۔ بہر حال سبب کچھ بھی ہو لیکن یہ حسرتیں میرے دل میں ہی رہ گئیں۔ بتاؤ بھلا ایسی صورت میں میں اپنے غمزدہ دل پر کس طرح قابو پاؤں اور اسے کس طرح سکون و قرار بہم پہنچاؤں۔

بند نمبر ۵:-
جب آہ اُن احباب کو — میں یاد کر اُٹھتا ہوں جو
یوں مجھ سے پہلے اُٹھ گئے — جس طرح طائر باغ کے
یا جیسے پھول اور پتیاں — گر جائیں سب قبل از خزاں
اور خشک رہ جائے شجر

تشریح: ناؔدر کہتے ہیں کہ جب میں اپنے اُن دوستوں کو یاد کرتا ہوں جو مجھ سے پہلے اس طرح فوت ہو گئے جیسے کسی باغ میں بیٹھے ہوئے پرندے اُڑ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد اُن کا سراغ تک نہیں ملتا۔ یا جیسے کسی درخت کے پھول اور پتیاں خزاں سے پہلے ہی مرجھا کر گر جائیں اور درخت ان پھولوں اور پتیوں کے بغیر ٹنڈ منڈ رہ جائے۔ یعنی اپنے قبل از وقت مرنے والے دوستوں کے بعد میری بھی یہی حالت ہے جو کسی ٹنڈ منڈ درخت کی ہوتی ہے۔

بند نمبر ۵:-
اُس وقت تنہائی مری — بن کر مجسم بے کسی
کر دیتی ہے پیشِ نظر — ہو حق سا اک ویران گھر
برباد جس کو چھوڑ کے — سب رہنے والے چل بسے
ٹوٹے کواڑ اور کھڑکیاں — چھت کے ٹپکنے کے نشاں
پرنالے ہیں روزن نہیں — یہ حال ہے آنگن نہیں
پردے نہیں چلمن نہیں — اک شمع تک روشن نہیں
مرے سوا جس میں کوئی — جھانکے نہ بھولے سے کبھی
وہ خانۂ خالی ہے دل — پوچھے نہ جس کو دیو بھی
اُجڑا ہوا ویران گھر

یونہی شبِ تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں — بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی — اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر

تشریح یہ بند اوپر والے بند سے مربوط ہے۔ اوپر والے بند میں نادر نے اپنے اُن دوستوں کو یاد کیا ہے جو قبل از وقت فوت ہو گئے۔ اِس بند میں وہ کہتے ہیں کہ ایسے دوستوں کو یاد کرتے وقت میں ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل تنہا ہو جاتا ہوں اور یہ تنہائی ایک ایسے ویران اور اُجڑے ہوئے گھر کا منظر پیش کرتی ہے جس میں رہنے والے اُس گھر کو اجڑا اور تباہ و برباد چھوڑ کر اِس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب اس گھر کی یہ کیفیت ہے کہ اُس کے دروازے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ کھڑکیاں شکستہ ہو چکی ہیں، بارش کے دنوں میں جگہ جگہ چھت کے ٹپکنے کے نشان پڑے ہوئے ہیں۔ چھت پر پانی گذرنے کے لیے پرنالہ نہیں اور مکان میں کوئی روشندان ہے، نہ صحن ہے اور نہ ہی پردے اور چلمنیں ہیں۔ مکان میں رات کو روشنی کا بھی کوئی بندوبست نہیں۔ یہ تنہا، اجاڑ اور ویران گھر ایسا ہے جس میں مجھ جیسے بدقسمت شخص کے علاوہ اور کوئی جھانکنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا یہاں تک کہ کوئی دیو، جو اجاڑ اور بے آباد گھروں میں رہنا پسند کرتا ہے، وہ بھی ایسے اجڑے ہوئے ویران مکان میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

آخر میں نادر کاکوروی کہتے ہیں کہ اِسی طرح اکثر ہوتا ہے کہ رات کو سونے سے ذرا دیر پہلے جب میں تنہا ہوتا ہوں تو وہ تمام دلچسپیاں اور مشاغل جو ماضی کا حصّہ بن گئے اور عیش و مسرت کے وہ تمام دن جو گذر گئے اور اب جن کی صرف یاد باقی ہے، یہ تمام دن میری زندگی کے لیے شمع کی مانند بن جاتے ہیں اور میرے ٹکڑے ہو جانے والے دل کو روشن کر دیتے ہیں۔ یعنی گذرے دنوں کی یاد چراغ بن کر جل اُٹھتی ہے اور میں چراغاں کے اِس منظر میں کھو جاتا ہوں اور ماضی کو یاد کرنے لگتا ہوں۔

علامہ محمد اقبالؒ

سوانحی حالات حضرت علامہ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق کشمیری برہمنوں کے خاندان سے تھا جو کئی پشت پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ اقبال کے والدِ گرامی شیخ نور محمد ایک درویش صفت اور صوفی منش بزرگ تھے اور والدہ امام بی بی پابندِ صوم و صلوٰۃ خاتون تھیں گویا گھریلو ماحول دین داری، پاکیزگی اور طہارت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اقبال نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہی مولوی میر حسن سے حاصل کی۔ میر حسن نے اقبال میں عربی اور فارسی کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ ایف اے تک سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ وہاں

انھیں پروفیسر آرنلڈ جیسے شفیق استاد کی رہبری حاصل ہوئی اور انہوں نے ۱۸۹۹ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اور اسی سال وہ یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ریسرچ سکالر ہو گئے اور پھر ۱۹۰۳ء میں اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے تین سال تک فلسفے اور انگریزی کی درس و تدریس کے بعد اقبال ۱۹۰۵ء میں عازم لندن ہوئے اور لنکنز ان لندن سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جرمنی چلے گئے اور میونخ یونیورسٹی سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی بعنوان "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا" نومبر ۱۹۰۷ء میں میونخ یونیورسٹی نے اقبال کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ۱۹۰۸ء میں اقبال وطن پہنچے۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیئے اور وکالت بھی کرتے رہے اس کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اُن کی شاعری کا محور قوم، تاریخ اسلام اور امتِ مسلمہ کا عروج و زوال اور تحریکِ آزادی رہا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ۱۹۳۰ء میں اپنا مشہور خطبہ صدارت دیا جو بعد میں خطبہ الٰہ آباد کے نام سے مشہور ہوا جس میں انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں اقبال حکومتِ وقت کی دعوت پر دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ اس سفرِ لندن سے واپسی پر انھیں اٹلی کے آمر مسولینی اور افغانستان کے شاہ امان اللہ خاں سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ ۱۹۳۲ء میں اقبال کو تیسری گول میز کانفرنس میں بھی شریک ہونے کی دعوت ملی۔ کانفرنس سے واپسی پر سپین گئے۔ آپ کی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" اسی سفر کی یادگار ہے۔ اِن سفروں کے تجربات و مشاہدات کو اسلامی ثقافت کے تقابل میں اقبال نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا، آخری عمر میں اقبال علیل ہو گئے اور آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو جاوید منزل لاہور میں وفات پائی اور بادشاہی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آج بھی اُن کا مزار مرجعِ خاص و عام ہے۔

اِن کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں۔

(۱) علم الاقتصاد (۲) بانگِ درا، (۳) بالِ جبریل (۴) ضربِ کلیم (۵) اسرارِ خودی (۶) رموزِ بے خودی (۷) پیامِ مشرق (۸) ارمغانِ حجاز (۹) خطباتِ اقبال جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

محاسن کلام

اقبال ایک عہد آفریں شاعر ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے عہد کے مسلمانوں کی زندگیوں کو متاثر کیا بلکہ بعد کی اردو شاعری پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ حالی نے جس ملّی اور تعمیری

شاعری کا آغاز کیا تھا۔ اقبال نے اُسے تکمیل تک پہنچایا۔ اقبال کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو حکیمانہ سنجیدگی کے ساتھ ایک ایسی شوخی بھی عطا کی جو زندگی کی تمام تر توانائیوں سے معمور انسانیت کے اعلیٰ ترین نصب العین کی علمبردار اور مشاہیر و اکابرینِ اسلام کی عظمت سے شناسا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں!
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

قرآن کا شاعر

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے "فکرِ اقبال" میں اقبال کو قرآن کا شاعر کہا ہے۔ کیونکہ اس کا سارا فکری تمثال خانہ تعلیماتِ قرآن کا رہینِ منت ہے۔ تمام تر کلامِ اقبال قرآنی آیات۔ تلمیحات اور استعاروں سے مزین ہے۔ قصصِ قرآن سے تلازمات چن کر کچھ اس طرح اشعار کی زینت بناتے ہیں کہ قاری جب تک قرآنی تعلیمات سے آگاہ نہ ہو اقبال کے اشعار سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کی تھی نعرۂ لاتذر میں!
تو عرب ہو یا عجم ہو تیرہ لا الٰہ الا — لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی
آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الملوک — سلطنت اقوامِ عالم کی ہے اک جادوگری

اس سلسلے میں وہ خود کہتے ہیں :-

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا — کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

مغربی تہذیب و تمدن پر تنقید

اسلام اور تاریخِ اسلام سے اقبال کے والہانہ لگاؤ کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ میں قیام کے دوران مغربی تہذیب و تمدن کے کھوکھلے پن کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ صرف جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔ انہیں اخلاق و روحانی اقدار کا مغربی معاشرے میں فقدان نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہاں انسانیت اور اس کے تمام تر نیک جذبوں کو مادیت اور سائنسی ترازو سے تولا جاتا ہے۔ اسی لئے وہ مسلمانوں کو اس سے محفوظ کرنے کے لئے اہلِ مغرب سے مخاطب ہوتے ہیں اور صاف صاف کہتے ہیں۔

تدبیر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اِسی لئے اُن کے نزدیک مغربی تہذیب اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے کہتے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا!

؎ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

؎ مے خانۂ مغرب کے دستور نرالے ہیں — لاتے ہیں سرورِ اوّل، دیتے ہیں شرابِ آخر

درسِ اخوت ومساوات

اقبال جب اسلامی معاشرے میں طبقاتی منافرت دیکھتے ہیں تو اُن کا دل خون کے آنسو روتا ہے وہ ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کے وارثوں کو مختلف تمثیلی پیرایوں میں اخوت ومساوات کا درس دیتے ہیں کیونکہ ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھرنے کا نتیجہ غیر اقوام کی بالادستی رہا ہے۔ اقبال بادِ اسلامیہ کی سربلندی کا راز اتحاد واتفاق اور اخوت ومساوات قرار دیتے ہیں۔

۱؎ یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل، اچھل کر بے کراں ہو جا

۲؎ یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

۳؎ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

۴؎ فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال اور عشقِ رسولؐ

اقبال کی تمام تر فکر شاعری کے سوتے آنحضرتؐ سے اُن کی والہانہ محبت وعقیدت سے پھوٹتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی فکر کا محور ومرکز حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ اقبال نے اگرچہ باقاعدہ نعتِ رسولِ مقبول کا اہتمام نہیں کیا لیکن اُن کی ساری فکری شاعری میں عشقِ رسولؐ ایک لہر کی صورت میں جاری وساری ہے اسی سے اُن کے سوز وسازِ رومی اور پیچ وتابِ رازی کی حقیقت کھلتی ہے۔ اُن کی مشہور نظم ذوق وشوق میں عشقِ رسولؐ کی یہ تڑپ انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب وہ فرماتے ہیں:۔

؎ لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب — گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

؎ شوق تیرا اگر نہ ہو مری نماز کا امام — میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

؎ نگاہِ عشق ومستی میں وہی اوّل وہی آخر — وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہ طٰہٰ

سچ تو یہ ہے کہ عشقِ رسولؐ کی یہ تڑپ مرتے دم تک اُن کے رگ وپے میں سمائی رہی اپنی وفات سے چند لمحے قبل عالمِ بے ہوشی دمدہوشی میں یہ شعر اُن کی زباں پر رواں تھے۔

؎ سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید

؎ سرآمد روزگارے ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبال کا فلسفۂ خودی

اقبال کے نزدیک خودی سے مراد فرد کا وہ ذاتی استقلال ہے جو اُس کی نشوونما اور بالیدگی کا امین ٹھہرے یعنی خودی انسان کی خودشناسی یا عرفانِ

ذات کا نام ہے جس کے استحکام کے لئے اقبال تین مراحل ضروری خیال کرتے ہیں (i) اطاعت (ii) ضبطِ نفس (iii) نیابتِ الٰہی اِن تینوں مراحل سے گزر کر انسان اپنے کمال کو پہنچتا ہے اور مردِ کامل کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ جب فرد خود کو جماعت میں ضم کر دیتا ہے تو یہ منزل بے خودی کا مقام بلند کہلاتی ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض — نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض
یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے، تلوار کی دھار ہے
تیری زندگی اسی سے، تیری آرزو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رو سیاہی
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا — عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

اقبال کا مردِ مومن اور مردِ کامل

اقبال کی خودی کا شاہکار اس کا مردِ مومن یا مردِ کامل ہے۔ اقبال کے نزدیک جب انسان خودی کے درجات طے کر لیتا ہے تو مردِ مومن کی مسند پر متمکن ہو جاتا ہے۔ مردِ مومن کی صفات کو اقبال نے درویش صفت مگر سخت کوش پرندے شاہین کی صفات سے مشابہ قرار دیا ہے جبکہ مردِ کامل کا معیار اقبال کے ہاں رسولِ پاکؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا، کارساز

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کا رجائی لہجہ

اقبال نے اگر ایک طرف امتِ مسلمہ کو اُس کی عظمتِ رفتہ اور زوال کے اسباب و علل سے آگاہ کیا تو دوسری طرف اسے ولولہ و عزم کا پیغام دیکر روشن مستقبل کی خوشخبری بھی سنائی۔ اُن کے رجائی لب و لہجے کی توانائی کہیں بھی ماند نہیں پڑتے پائی۔ وہ اپنے نوجوانوں سے مایوس نہیں بلکہ "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" پر یقین رکھتے ہیں۔ طلوعِ اسلام جیسی طویل نظم اُن کے رجائی لہجے کی روشن مثال ہے اقبال کے ہاں ایک نشاط انگیز ولولہ و سرمستی کا بھرپور تاثر موجود ہے۔

- اٹھ کر اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے ۔ مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
- اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم! ۔ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں!
- جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں ۔ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے
- اٹھ کر خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں ۔ نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں!

ندرتِ تشبیہ و استعارہ اقبال کی شاعری میں فکری و معنوی دنیا آباد ہونے کے باوجود فنی محاسن اور شاعری فریضوں کا سلیقہ مند اظہار ملتا ہے اُن کے فنِ شعر گوئی کا تمام ماہرین فن نے اعتراف کیا ہے۔ اقبال کا کلام صنائع و بدائع اور تشبیہ و استعارہ کے زیور سے آراستہ ہے۔ یہ تشبیہات و استعارات اپنی ندرت، جدت اور تازگی کی صفات کی حامل ہیں۔

- زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا ۔ شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا (تشبیہ)
- جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں ۔ یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں (〃)
- آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ ۔ دم دے نہ جائے ہستیٔ ناپائیدار دیکھ (〃)
- سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو ۔ طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے (استعارہ)
- وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب ۔ لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب 〃

تلمیحاتِ اقبال اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ فکری ہے جس کا محور و مرکز تاریخ اسلام اور فکر اسلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی تلمیحات کے علاوہ اقبال کے ہاں تلمیحات کا بیشتر حصہ قرآنی آیات، احادیثِ نبوی اور تاریخ اسلام کے اہم واقعات پر مشتمل ہے۔

- کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے ۔ تری رگوں میں وہی خوں ہے قُم باذن اللہ
- کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم ۔ علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
- رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم ۔ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

مختصر یہ کہ کلامِ اقبال بے شمار لفظی و معنوی اور فکری محاسن کا حامل ہے جو اقبال کی ہمہ گیر شخصیت، حکمت و بصیرت، شاعرانہ عظمت اور حکیمانہ شعور کا ترجمان ہے۔

غزل نمبر ۱

حل لغات فرومایہ —— پستی کی طرف جانے والی ؛ کمینی۔ ناقص ؛ کوتاہ - چھوٹا۔ رسائی نہ رکھنے والا ؛ نخیل ؛ درخت۔ کھجور کا درخت ؛ خودی۔ علامہ اقبال کے کلام میں بار بار استعمال ہونے والی ایک اصطلاح، جس کے اصطلاحی معنی اپنے نفس کو پہچاننا اور اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنا ہے ؛ خدائی۔ خدا سے منسوب شان و شکوہ اور عظمت و جلال ؛ حکمرانی۔ بادشاہی ؛ صلاح کار۔ بگڑا کام بننے کی صورت ؛ حدیث۔ بات، کہانی، داستان ؛ گلیم۔ چادر، کملی ؛ کلاہ۔ ٹوپی، پگڑی، عظمت و عزت ؛ بازی۔ کھیل، چال، فریب ؛ افلاک۔ فلک کی جمع، آسمان ؛ معرفت۔ علوم الٰہی یا ذات الٰہی کی پہچان۔

شعر نمبر ۱:۔ تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ ترا گنہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ

تشریح حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! تیرے سامنے ایک کھجور کا بلند و بالا درخت کھڑا ہے اور اس پر تیری خواہش کے مطابق پھل بھی موجود ہے۔ لیکن چونکہ تیری نگاہ پستی کی طرف دیکھنے والی ہے اور بلندی کی طرف دیکھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہے۔ اس طرح تیرے ہاتھ کوتاہ اور چھوٹے ہو گئے ہیں جو درخت کی بلندی کی وجہ سے پھل تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تو اپنے ہاتھوں اور اپنی نگاہ کی خرابی کو دور کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے درخت کی بلندی کی شکایت کر رہا ہے حالانکہ تجھے سوچنا چاہیئے کہ اگر تجھے پھل نہیں ملا تو اس میں قصور درخت یا اس کی بلندی کا نہیں بلکہ تیری اپنی پست نگاہ اور کوتاہ ہاتھوں کا ہے۔

در اصل اس شعر میں علامہ اقبال اس امر کی طرف توجہ مبذول کرا رہے ہیں کہ مسلمان عملی میدان میں کچھ بھی کوشش و کاوش نہیں کرتے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے عمل بیٹھے اس بات کی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں اُن کے لیے اچھی زندگی کا تصور نہیں رہا اور تمام نعمتیں اُن کے نصیب سے اُٹھ گئیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس میں قصور ان اشیاء کا نہیں خود آپ کا ہے۔

شعر نمبر ۲:۔ گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

تشریح علامہ اقبال جدید نظامِ تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موجودہ انگریزی نظامِ تعلیم جو مذہب سے بالکل لاتعلق ہے اور سیکولر بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے، مسلمانوں کے لیئے مفید نہیں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ مدرسے مسلمانوں کے حق میں

ایسے دشمن کا کردار ادا کر رہے ہیں جو لوگوں کا گلا دبائے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دے۔ یعنی گو مسلمان جسمانی طور پر زندہ ہیں لیکن مذہب سے دوری اُن کی روحانی موت کا سبب بن رہی ہے اور جب مدرسوں اور ان مدرسوں کے اساتذہ کے باعث صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی ہے تو پھر مسلمانوں میں وہ قوت کہاں سے پیدا ہو جس کے بل پر اُنہوں نے دنیا کے تمام جھوٹے خداؤں سے انکار کر کے پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا پرچم بلند کیا تھا۔ لیکن جدید تعلیم کی وجہ سے مسلمان اپنی اِس خصوصیت اور شان سے محروم ہو گئے ہیں۔

شعر نمبر ۳ :۔ خودی میں گم ہے خدا کی تلاش کر غافل یہی ہے تیرے لیئے اب صلاحِ کار کی راہ

تشریح علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ تم اِس دنیا میں جاہ و جلال اور شان و شوکت کے طلب گار ہو اور چاہتے ہیں کہ دنیا کی حکمرانی تمہیں حاصل ہو جائے۔ لیکن بد قسمتی سے اِس اہم نکتے کو فراموش کر رہے ہو کہ یہ سب چیزیں اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتیں جب تک انسان اپنی ذات کا مکمل عرفان حاصل نہ کرے۔ اپنی صلاحیتوں کے بارے میں کامل آگہی حاصل نہ ہو جائے اور جب تک انسان اپنی خوبیوں اور خامیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر کے حصولِ مقصد کے لیئے مکمل کوشش نہ کرے۔ لہٰذا محض حکومت و آن و بان کی تلاش ترک کر کے تمہیں اپنی خودی کو زندہ و بیدار کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور مسلمانوں کے بگڑے کام سنوارنے اور پھر سے پہلی سی قدر و منزلت حاصل کرنے کا یہی طریقہ باقی ہے۔

گویا اقبال کہتے ہیں کہ جب تک خودی زندہ و بیدار نہ ہو انسان حقیقی ترقی نہیں کر سکتا۔

شعر نمبر ۴ :۔ حدیثِ دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

تشریح علامہ کہتے ہیں کہ اگر تم دل کو اطمینان و سکون پہنچانے والی باتوں کی تلاش میں ہو تو یہ باتیں عہدِ حاضر کے ترقی یافتہ انسان اور اُس کی ایجاد کردہ زندگی میں نہیں ملیں گی۔ ان کے لیئے تمہیں کسی ایسے درویش اور بزرگ سے رجوع کرنا چاہیئے جو رونق دنیا کو یہاں تک ترک کر بیٹھا ہے اور اپنے مستقبل سے اِس قدر بے پروا ہے اور جسے خدا پر اِس حد تک توکل ہے کہ وہ چادر تک رکھنے کا روادار نہیں۔ اِس لیئے کہ یہی شخص تمہیں کام کی باتیں بتا سکتا ہے۔ اقبال دعائیہ انداز میں کہتے ہیں کہ خدا تمہیں تمہارے حقیقی مقام و مرتبے سے واقف کرے اور تمہاری خودی بیدار ہو جائے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی خودی موجودہ زندگی کی چکاچوند سے بیدار

نہیں ہو سکتی۔ اِس کے لیئے کسی مردِ درویش کی ضرورت ہے اور خودی کی بیداری مسلمانوں کی ترقی کے لیئے بیحد ضروری ہے۔

شعر نمبر ۵ :۔ برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

تشریح: واضح ہو کہ ننگے سر ہونا ہماری تہذیب میں بے عزتی اور بے توقیری کی علامت ہے۔ اِس پس منظر میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر تم ننگے سر ہو اور عزت و جاہ تمہیں میسر نہیں تو اِس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل میں بلند ارادے پیدا کرو اِس لیئے کہ اِس دنیا میں صرف شاہیں کے سر کے لیئے کلاہ و پگڑی یعنی عزت و عظمت موجود ہے۔ واضح رہے کہ علامہ اقبال کے ہاں شاہین قوت و بلند پروازی اور فقر کی علامت کے طور پر آتا ہے۔ اِس کی تیز نگاہی کے اقبال بہت مداح ہیں اور وہ مسلمانوں خاص طور پر مردِ مومن کے لیئے ان خصوصیات کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاہین اِسی لیئے تمام پرندوں کا حاکم ہے کہ وہ سخت کوش ہے۔ لہٰذا اگر اب مسلمان بھی سخت کوشی کی زندگی اختیار کریں گے تو بے عزتی و بے توقیری کا خاتمہ ہو جائے گا اور اُنہیں بھی عزت اور شان و شوکت میسر آئے گی۔

شعر نمبر ۶ :۔ نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

تشریح: اقبال کہتے ہیں کہ کسی بھی ذلیل و زوال آمادہ شخص سے اُس کی درماندگی کا سبب پوچھا جائے تو وہ بڑی آسانی سے کہہ دیتا ہے کہ جناب قسمت اور آسمان کا کھیل۔ اور یہی سب کچھ مسلمان بھی کہتے ہیں۔ کہ ان کی سلطنتیں صرف اس لیئے مٹ گئیں کہ قسمت نامہربان ہو گئی تھی اور آسمان اُن کے خلاف چال چل رہا تھا۔ لیکن اگر کوئی مجھ سے مسلمانوں کے زوال کا سبب پوچھے تو میں بتاؤں گا کہ ان کی نعمت و جاہ و جلال کا زوال اس لیئے ہوا کہ ان کی خودی زوال کا شکار ہو گئی تھی یہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ انہیں نیک و بد میں تمیز نہ رہی۔ سخت کوشی کی زندگی ترک کر دی۔ معرکہ آرائی سے گھبرانے لگے اور اپنی ذات کا عرفان کھو بیٹھے۔ یہ اُس مقام بلند کو بھول گئے جو صرف انہی کا حصہ تھا لہٰذا حالات میں انقلاب آیا اور یہ بے عزت اور ذلیل و خوار ہو گئے۔ یعنی اگر آج بھی مسلمانوں کی خودی زندہ و بیدار ہو جائے تو ان کے حالات میں مثبت تغیر آ جائے گا۔

شعر نمبر ۷ :۔ اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

تشریح: اس شعر میں علامہ اقبال برِصغیر میں رائج ہر دو نظامِ تعلیم پر تنقید کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مغربی نظامِ تعلیم اور مشرقی نظامِ تعلیم دونوں میں نقائص پائے جاتے ہیں گویا

انسان کی صحیح تربیت نہ مدرسوں میں ہو سکتی ہے اور نہ خانقاہوں میں ممکن ہے۔ اِس امر کے اظہار کے لیئے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ میں مدرسوں میں بھی گیا اور خانقاہوں میں بھی لیکن ہر جگہ مجھے سوائے افسوس کے اور کچھ حاصل نہ ہُوا اِس لیئے کہ مدرسوں اور خانقاہوں یعنی ہر دو جگہ نہ زندگی کی جولانیاں ہیں نہ آپس کی محبت و شفقت ہے۔ نہ علوم الٰہی اور ذات الٰہی کی خشاخشا ہے اور نہ وہ نظر ہے جو حقائق عالم کو بے نقاب کر سکے۔

غزل نمبر ۲

حل لغات طغیان —— زیادتی، جوش ؛ مشتاقی۔ عاشقی، عشق ؛ طلب۔ خواہش، جستجو ؛ صادق۔ سچی، مخلصانہ ؛ افرنگ۔ مغربی لوگ، یورپ و امریکہ اور ان علاقوں کی تہذیب سے تعلق رکھنے والے ؛ جوہر۔ چمک دمک، آب و تاب ؛ براقی۔ چمکیلا۔ آب و تاب، چمک دمک ؛ آفاقی۔ تمام دنیا سے یکساں طور پر تعلق رکھنے والی بات ؛ صیاد۔ شکاری ؛ غماز۔ چغلی کھانے والا، راز فاش کر دینے والا ؛ اوراق۔ پتے ؛ خلاقی۔ تخلیق، دل سے پیدا کی ہوئی بات ؛

شعر نمبر ۱ :- نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی　　کہ میری زندگی کیا ہے؟ یہی طغیانِ مشتاقی

تشریح علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر میرے دل میں عشق کی زیادتی، جوش اور فراوانی نہ ہو تو میں دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اِس لیئے کہ میری زندگی عشق کی زیادتی اور جوش ہی کی رہونِ منت ہے۔ اِس شعر میں علامہ اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ عشق کی بدولت انسان اپنے لیئے اعلیٰ و ارفع نصب العین کا تعین کرتا ہے اور اِس کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے یہی جدوجہد انسان کی زندگی کا ثبوت اور حقیقی جواز ہے۔ اگر کوئی شخص عشق سے محروم ہو اعلیٰ نصب العین سے بے تعلق ہو اور جدوجہد کرنے سے گریزاں ہو تو اس کی زندگی موت کے ہم معنی ہو گی اور انسان اپنی حیات کے حقیقی جواز سے محروم ہو جائے گا۔

شعر نمبر ۲ :- مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے　　ابھی محفل میں ہے شاید کوئی دردآشنا باقی

تشریح علامہ اقبال عام طور پر گلستانِ ملت اسلامیہ میں خود کو ایسے بلبل سے تشبیہہ دیتے ہیں جس کی بات سمجھنے والا کوئی نہیں۔ لیکن بال جبریل کے دور تک اُن کا یہ رویہ بدلا اور انہیں یقین ہونے لگا کہ اُن کی شاعری صدا بصحرا نہیں ہے اور کچھ لوگ اُن کی

بات سمجھ رہے ہیں ۔ اِس شعر میں بھی یہی بات کہی گئی ہے ۔ علامہ فرماتے ہیں کہ میری فطرت مجھے بار بار نغمے گانے اور شعر کہنے پر مجبور و آمادہ کرتی ہے اور یقیناً اِس کا سبب یہ ہے کہ گلستانِ ملّت کے اجڑ جانے کے باوجود ابھی تک گلستان میں کوئی ایک ایسا شخص ضرور موجود ہے جو میرے جیسا درد رکھتا ہے اور میری بات سمجھتا ہے ۔

شعر نمبر ۳ :- وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے   طلب صادق نہ ہو تیری تو پھر کیا شکوۂ ساقی

تشریح : علامہ کہتے ہیں کہ اے مسلمان آج تو شکایت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور عنایات تیرے شامل حال نہیں جس کی وجہ سے تو ذلیل و خوار ہو رہا ہے لیکن اِس بارے میں میرا نقطہ نگاہ بالکل مختلف ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ تیرے دل میں اپنے مقاصد کے لیئے سچی لگن ہی موجود نہیں ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ اب بھی وُہ پرانا دور واپس لایا جاسکتا ہے اور اب بھی تیرے نشیمن میں آگ لگ سکتی ہے ۔ لیکن جب تم خود ہی سچی طلب سے محروم ہو تو پھر شراب بانٹنے والے سے کیا شکایت یعنی شراب تو اُسے ملے گی جو اس کا طلب گار ہوگا ۔ گویا اقبال کہتے ہیں کہ زندگی میں اعلیٰ و ارفع مقام کے حصول کے لیئے سچی تڑپ لازم ہے جسے علامہ اقبال اپنے نصب العین سے عشق قرار دیتے ہیں ۔

شعر نمبر ۴ :- نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے   کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

تشریح : علامہ اقبال تہذیب مغرب کی خرابیوں اور برائیوں کا اپنی شاعری میں بار بار ذکر کرتے ہیں ۔ اُن کے نزدیک اِس تہذیب کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ پر تصنع اور پُر تکلف ہے اِس میں حقیقت کا شائبہ تک موجود نہیں اور صرف اپنی ظاہری چمک دمک اور بناوٹ سے لوگوں کو متاثر و مرعوب کر رہی ہے ۔ تہذیب مغرب کے بارے میں علامہ اقبال نے ایک دو اور جگہ بھی یہی بات کہی ہے ۔

ے نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ے دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
جسے کھرا تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اِس شعر میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک سے اِس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگانا چاہیے اس لیئے کہ اس کے جوہر کی چمک دمک اور آب و تاب صرف بجلی کے مصنوعی چراغوں کی مرہونِ منت ہے اور اِس میں حقیقت و سچائی موجود نہیں ۔

شعر نمبر ۵ :- دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اُٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی

تشریح علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جیسی جس کی نظر ہوگی ویسی ہی وہ اپنے لیئے منازل متعین کرے گا اور اِس اعتبار سے اُس کی جدوجہد کا رُخ متعین ہوگا۔ بالفرض ایک آدمی کی نگاہ ہی پست ہے تو وہ کبھی بلندی کے خواب نہیں دیکھ سکتا اور کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ اِس پسِ منظر میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ لوگ جو تمام دنیا سے متعلق کو یکساں نظروں سے دیکھنے کے انداز کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں وہ ایسے جوش و جذبے سے محروم ہوتے ہیں جس کی بدولت پوری دنیا پر حکومت کا خواب دیکھا جاسکے اور تمام عالم کو زیرنگیں کیا جاسکے۔ دراصل ایسی خواہشات کے لیئے بنیادی طور پر وہ نگاہ درکار ہے جو خود آفاقی انداز کی حامل ہو۔

شعر نمبر ۶ :- خزاں میں بھی کب آسکتا تھا میں صیاد کی زد میں
مری غماز تھی شاخِ نشیمن کی کم اوراقی

تشریح اقبال کہتے ہیں کہ گو گلشن خزاں کی زد میں آچکا ہے اور اِس کی تمام تر رونق ختم ہوچکی ہے اِس کے باوجود یہ ممکن نہیں تھا کہ شکاری مجھے شکار کرسکتا اور میں اُس کے جال میں آسکتا۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ جس شاخ پر میرا نشیمن تھا اُس کے پتے جھڑ گئے جس کے باعث میرا نشیمن فوراً صیاد کی نگاہوں میں آگیا۔

علامتی انداز میں اِس شعر میں یہ بات کہی گئی ہے کہ دشمنوں کے لیئے یہ ممکن نہ تھا کہ بدترین صورتِ حال میں بھی وہ ملتِ اسلامیہ پر غالب آسکتے ہیں مصیبت یہ ہوئی کہ خود ملتِ اسلامیہ کے افراد ملت کے دشمن بن گئے۔ انہوں نے اپنے فرائض ادا کرنا چھوڑ دیئے نہ صرف یہ بلکہ غداری کرکے وہ دشمنوں سے جاملے۔ ملت کی کمزوریوں کی نشاندہی کی اور یوں ملت تباہ و برباد ہوگئی۔ گویا یہ کام خود انہوں نے انجام دیا۔

شعر نمبر ۷ :- الٹ جائیں گی تدبیریں۔ بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

تشریح اقبال کہتے ہیں کہ بے شک اِس وقت مسلمان بدترین حالات سے دوچار ہیں لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیئے کہ گردشِ فلک کے پاس ایسے بے شمار نسخے ہیں جس کی بدولت ہمارے دشمنوں کی تدابیر خود اُن پر ہی اُلٹ جائیں گی اور جو جال وہ ہمارے لیئے تیار کریں گے خود اِس میں پھنس جائیں گے۔ ہماری قسمت

بدل جائے گی اور ذلت و خواری کا موجودہ دور عزت و شرافت اور عظمت و جاہ میں بدل جائے گا۔ اِس کے بعد علامہ اقبال کہتے ہیں کہ آپ اِسے میرے تخیّل کی تخلیق اور گھڑی ہوئی بات تصوّر نہ کریں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے اور جلد ہی آپ پر منکشف ہو جائے گی۔

اقبال ایک رجائی شاعر ہیں وہ بدترین حالات میں بھی امید کے چراغ روشن رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے زوال و نکبت و ادبار کا ذکر کر چکنے کے بعد ایک اور جگہ بھی اُنہوں نے یہی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں۔

؎ آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ

سرگذشت آدم

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے — بھلایا قصۂ پیمانِ اوّلیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں — پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو — دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے
مِلا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا — کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی — کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طور پر پہنچا — چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی صلیب پر اپنوں نے مجھ کو لٹکایا — کیا فلک کو سفر، چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں — دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربّانی — پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی — بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم — خلافِ معنیِ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو — جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی — اسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں — سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر | لگا کے آئینۂ عقل دوربیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو، برق مضطر کو | بنادی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی | کیا خرد سے جہاں کو تہ نگیں میں نے
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

تعارف یہ نظم پہلی بار بطور غزل ستمبر ۱۹۰۴ء کے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں نہ صرف اس غزل کو عنوان دے کر نظم بنا دیا گیا بلکہ اس کے کچھ شعر بھی قلمزد کر دیئے گئے۔

سرگذشتِ آدم علامہ اقبال کے شاعرانہ کمال کی مظہر ہے۔ ہر شاعر اس طرح کی نظمیں نہیں لکھ سکتا۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ شاعر کی عام معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہو۔ وہ انسانی تہذیب و معاشرت کے ارتقائی مراحل سے واقف ہو اور اُسے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر مکمل قدرت بھی حاصل ہو۔

حلِ لغات غربت ۔ مسافرت ۔ پردیس ۔ وطن سے دوری ٭ پیمانِ اوّلین ۔ پہلا عہد یہ اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں قرآن شریف میں آتا ہے کہ انسان نے اپنی تخلیق کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار و اعتراف کیا تھا۔ انسان سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب انسانوں نے یک زباں ہو کر کہا بے شک ٭ ریاض ۔ باغ ٭ شعور ۔ عقل و دانش ٭ جامِ آتشیں ۔ انتہائی تیز و تند شراب کا پیالہ ٭ اوج ۔ بلندی ٭ خیالِ فلک نشیں ۔ آسمان تک پہنچنے والا تخیّل ۔ مراد بلندیٔ خیال ٭ ذوقِ تکلّم ۔ گفتگو کا شوق ٭ صلیب ۔ پھانسی ٭ سرودِ ربانی ۔ خدا کا نغمہ ٭ ہویدا ۔ ظاہر ٭ تہ نگیں ۔ زیرِ فرماں ۔ غلام ٭ فرمانبردار ٭ مظاہر پرست ۔ ظاہری اشیاء کی پرستش کرنے والی۔

تشریح شاعر کہتا ہے کہ کاش کوئی میری یعنی انسان کی مسافرت اور اپنے حقیقی وطن سے دوری کی کہانی سنے۔ دوسرے مصرعے سے کہانی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ میں نے وہ وعدہ بھلا دیا جب میں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار و اعتراف کیا تھا۔ جب میری عقل و دانش نے مجھے میری حقیقی اہمیت سے آگاہ

کیا تو میرا دل جنت کے باغ سے اُکتا گیا اور میں نے جنت کو خیرباد کہہ دیا۔ دنیا میں آکر مجھے یہاں کے اسرار و رموز جاننے کا شوق ہُوا اور اِس سلسلے میں میرے انتہائی بلند پرواز تخیّل نے اپنی اونچی اُڑان کا مظاہرہ کیا۔ مجھے ایسا مزاج اور طبیعت ملی جو کسی حالت پر قناعت نہیں کرتی اور اِس وجہ سے جنت میں بھی میرا دل نہ لگا تھا۔ لہٰذا دنیا میں بھی میں نے کسی ایک جگہ رہنا پسند نہ کیا اور اِس سفر میں مختلف مراحل سے دوچار ہُوا مثلاً کبھی میں نے حضرت ابراہیمؑ کی صورت میں جلوہ گر ہو کر کعبے کو بتوں سے پاک کیا اور کبھی آذر بن کر عبادت گاہوں میں بت پہنچا دیئے۔ کبھی میں خدا سے گفتگو کرنے کے شوق میں طور کے پہاڑ پر پہنچا اور کبھی میں نے اپنی آستین میں اللہ تعالیٰ کے نور کو چھپایا۔ یہ دونوں اشارے حضرت موسیٰؑ کی طرف ہیں۔ حضرت موسیٰؑ ہی کوہِ طور پر پہنچے تھے اور یدِ بیضا کا معجزہ بھی انہی کو حاصل تھا۔ کبھی مجھے میرے اپنے عزیز و اقرباء یعنی انسانوں نے سولی پر لٹکا دیا اور مجھے زمین چھوڑ کر آسمان پر مقیم ہونا پڑا۔ اِس شعر میں حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہیں عیسائی عقیدے کے مطابق یہودیوں نے پھانسی دے دی تھی۔

اقبال کہتے ہیں کہ کبھی انسان طویل مدت تک دنیا اور اہلِ دنیا سے قطع تعلق کر کے غارِ حرا میں مصروفِ عبادت رہا اور وہاں سے باہر نکلا تو لوگوں کے لیئے ایسا دین لایا جو زمین پر بسنے والوں کے لیئے خدا کی طرف سے آخری دین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس شعر میں آنحضرتؐ کی طرف اشارہ ہے اور جامِ آخریں سے آنحضورؐ پر نبوت کے سلسلے کے خاتمے کا ذکر کیا گیا ہے۔ انسان نے کبھی ہندوستان میں اللہ تعالیٰ کا نغمہ اور پیغام سُنایا اور کبھی اپنے لیئے یونان کی سرزمین کو پسند کیا۔ پہلے مصرع میں شری کرشن اور دوسرے مصرع میں غالباً افلاطون کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب ہندوستان کے باسیوں نے میرے پیغام پر توجہ نہ دی تو میں جاپان و چین کے ممالک کی طرف ہجرت کر گیا۔ یہ اشارہ گوتم اور بدھ مت کی طرف ہے گوتم بدھ پیدا تو ہندوستان میں ہوئے تھے لیکن آج اُن کے پیروکار ہندوستان کی بجائے جاپان، چین اور ان کے ملحقہ ممالک میں ملتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ کبھی انسان نے سائنس دان کی حیثیت سے غور و فکر کرتے ہوئے تمام تر مذہبی حوالوں کے برخلاف یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا اور خود انسانی زندگی محض ذرات کے مناسب و موزوں امتزاج سے وجود پذیر ہوئی ہے؛

اس میں روح وغیرہ کا کوئی دخل نہیں۔ یہ اشارہ یہ قبل مسیح میں پیدا ہونے والے ایک مشہور سائنس دان کی طرف ہے جس کا نام دمیقراطیس تھا اور جس نے پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ دمیقراطیس کا یہی خیال ایک شعر میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب ۔ موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا (چکبست)

کبھی انسان نے کائنات میں عقل و منطق اور دین میں سے کسی ایک کی برتری منوانے کے لیئے جنگ و جدال کی اور ہزاروں لوگوں کے تہ تیغ ہونے کے باعث سینکڑوں شہر اور بہت سے ملک خون سے سُرخ ہو گئے۔ یہ اشارہ انسانی تاریخ کے اُن بہت سے واقعات اور ادوار کی طرف ہو سکتا ہے جن میں مذہبی روایات اور تعقل پرستی میں تصادم ہُوا اور سینکڑوں اِسی کشمکش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے

مثلاً قرونِ وسطیٰ کا دور اور رومن کیتھولک عیسائیوں اور اِس عہد کے فلسفیوں کے درمیان جنگ و جدل وغیرہ۔

اقبال غالباً گلیلیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان نے زمین کے مظاہر کے ساتھ ساتھ ستاروں کے بارے میں بھی غور و فکر کیا اور اپنی زندگی کی بے شمار راتیں انہی کو دیکھتے ہوئے گزار دیں۔ یہ بات پُرلطف اس لیئے بھی ہے کہ اِس میدان میں انسان کی کاوش اور جدّوجہد کو واضح کیا گیا ہے اور اِس لیئے بھی کہ ستارے بہرحال رات ہی کو نظر آسکتے ہیں۔

غالباً سبھی مذاہب میں زمین کے ساکن ہونے کا ذکر آیا ہے لیکن انسان نے اپنے تفحص اور جستجو سے یہ بات معلوم کی کہ زمین ساکن نہیں ہے۔ لیکن یہ بات برسرِ عام کہنا اِس لیئے دشوار تھا کہ مذاہب کے پیرو اِس نظریے کے شدید مخالف تھے لیکن اِس مخالفت کے باوجود یہ مسئلہ لوگوں کے سامنے لایا گیا۔ یہ اشارہ مشہور سائنس دان کاپرنیکس کی طرف ہے جس نے مسئلہ حرکت و گردشِ زمین پیش کیا۔

انسان نے بہت دور تک دیکھنے اور غور و فکر کرنے والی عقل کے ذریعے یہ بھید پایا کہ آخر فضا میں چھوڑی جانے والی چیزیں اوپر کی طرف یا اِدھر اُدھر جانے اور فضا ہی میں معلق رہنے کی بجائے زمین پر ہی کیوں گرتی ہیں۔ عقل نے بتایا کہ ضرور زمین ہی ان اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اِس شعر میں نیوٹن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس نے یہ نظریہ نہ صرف پیش کیا تھا بلکہ تجربات سے ثابت بھی کیا تھا۔ کبھی انسان نے شعاعوں کو اسیر کیا اور کبھی بے چین و بے تاب بجلی کو اپنا قیدی بنایا

اور اِس طرح اس دنیا کو جنت سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا۔ اِس شعر کے پہلے مصرع میں دو سائنس دانوں ڈاکٹر وونٹیین اور ڈاکٹر فریڈلے کی طرف اشارہ ہے۔ وونٹیین نے ایکسریز کو دریافت کیا تھا اور فریڈلے نے بجلی کو تاروں میں مقید کر کے انسانی خدمت کے لیئے استعمال کرنے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔

اقبال کہتے ہیں کہ انسان نے یہ سب کچھ کیا اور عقل سے ساری دنیا کو اپنا غلام بنا لیا اِس کے باوجود اِسے زندگی کے حقیقی رازوں کی خبر نہ مل سکی۔ لیکن جب ظاہری چیزوں کی پُوجا کرنے والی آنکھ میں حقائق معلوم کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور اِس نے دیکھنا شروع کیا تو معلوم ہُوا کہ زندگی کا راز اور حسنِ ازل اُس کے اپنے دل ہی میں ہے۔

ایک شام

دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بیہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

تعارف یہ نظم ۱۹۰۷ء میں اُس وقت لکھی گئی تھی جب علامہ اقبال فلسفے میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے جرمنی میں مقیم تھے۔ علامہ میونخ سے چند روز کے لیے ہائیڈل برگ گئے تاکہ وہاں کے کتب خانے سے استفادہ کر سکیں۔

حلِ لغات نیکر — جرمنی کا ایک دریا جو دریائے رائن کا معاون دریا ہے۔ ہائیڈل برگ دریائے نیکر کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔ نوا فروش۔ نغمے بیچنے والے یعنی خوش الحان پرندے۔ سبز پوش۔ سبز پتوں کی وجہ سے درخت مراد ہیں۔ سکوت۔ خاموشی۔ فسوں۔ جادو۔ بے درا۔ گھنٹی کے بغیر۔ مراقبہ۔ گردن جھکا کر غور و فکر کرنے کا عمل۔ بالکل خاموش بیٹھ کر یادِ الٰہی میں مصروف ہونے کا عمل۔ استغراق۔ گیان دھیان۔

تشریح چاند کی چاندنی بالکل خاموش ہے اور درختوں کی شاخوں پر بھی خاموشی طاری ہے۔ اِس وادی کے تمام پرندے اور پہاڑوں پر اُگے ہوئے تمام درخت بالکل خاموش کھڑے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے مظاہرِ فطرت کی ہر چیز اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے اور رات کی گود میں سو رہی ہے۔ چاروں طرف خاموشی کا کچھ ایسا جادو چل رہا ہے کہ دریائے نیکر کا بہتا ہُوا پانی بھی ساکن نظر آتا ہے۔ ستاروں کا قافلہ بھی نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہے اور اِس قافلے نے اپنے سفر کے لیے کسی گھنٹی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اِس وادی کے پہاڑ، صحرا اور دریا سب خاموش ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے فطرت نہایت انہماک کے ساتھ گیان دھیان اور غور و فکر میں مصروف ہے۔ اے دل ایسے میں تجھے بھی خاموش ہو کر غم کی آغوش میں سو جانا چاہیے۔

بلادِ اسلامیہ

تعارف یہ نظم اپریل ۱۹۰۹ء کے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظرِ ثانی میں اِس کے بعض شعر قلمزد کر دیئے گئے اور بعض میں جزوی ترامیم کی گئیں۔ سرودِ رفتہ میں قلمزد کیے گئے نو شعروں کے علاوہ دو ترمیم شدہ مصرعے بھی دیئے گئے ہیں۔

حلِ لغات غم دیدہ — جس نے غم دیکھا ہو۔ یعنی رنجیدہ اور غمگین۔ اسلاف۔ آباؤ اجداد۔ بزرگ۔ خانقاہ۔ درویشوں کے رہنے کی جگہ۔ قبر۔ خیر الامم — تمام امتوں سے بہتر اُمت یعنی مسلمان۔ مدار۔ انحصار۔ جہان آباد۔

دہلی شہر کا پرانا نام ؎ کرامت ۔ عظمت ؎ بغداد ۔ عراق کا دارالحکومت ۔ خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں یہی شہر اسلامی دنیا کا مرکز بنا رہا ؎ ہمدوش ۔ برابر ؎ ارم ۔ جنت ؎ روما ۔ عیسائیوں کی رومی سلطنت کا دارالحکومت اور موجودہ اٹلی کا صدر مقام روم ؎ قرطبہ ۔ اندلس کا مشہور شہر جو طویل عرصے تک مسلمان حکمرانوں کا پایۂ تخت رہا ؎ ظلمت ۔ تاریکی ۔ اندھیرا ؎ ملتِ بیضا ۔ مراد ہے ملتِ اسلامیہ ؎ قسطنطنیہ ۔ ترکی کا مشہور شہر ۔ استنبول کا پرانا نام ۔ یہ شہر خلافتِ عثمانیہ کا صدر مقام رہا ۔ قدیم رومی سلطنت کا پایۂ تخت تھا اس شہر کے فاتح کے لیے آنحضرتؐ نے جنت کی بشارت دی تھی ۔ اسی بنا پر بیشتر مسلمان حکمرانوں نے اسے فتح کرنے کی کوشش کی لیکن یہ سعادت ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح کے حصے میں آئی ؎ مہدی امت ۔ امت کا ہدایت دینے والا یہاں پر سلطان محمد فاتح مراد ہیں ؎ سطوت ۔ شان و شوکت ؎ شہِ لولاک ۔ آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس مراد ہے ؎ خاتم ۔ انگوٹھی ؎ تاباں ۔ روشن ؎ ماویٰ ۔ ٹھکانہ ۔ جائے پناہ ۔

پہلا بند ۔ سرزمین دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں

سوتے ہیں اِس خاک میں خیر الامم کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل چکا حاصل ، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

تشریح علامہ اقبال کہتے ہیں کہ رنجیدہ و غمگین دل ہندوستان کے مشہور شہر دہلی کے سامنے ادب و احترام کے باعث جھکا ہوا ہے ۔ اس لیے کہ اِس شہر کے ایک ایک ذرّے میں ہمارے آباؤ اجداد اور بزرگوں کا خون محوِ خواب ہے ۔ اِس اُجڑے ہوئے اور برباد شدہ باغ کی زمین کیونکر پاک نہ ہو آخر یہ اسلام کی عظمت و بزرگی کی خانقاہ اور قبر کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اِس مٹی میں مسلمانوں کے اُن عظیم اور اولوالعزم بادشاہوں کے جسدِ خاکی دفن ہیں جن کی حکومت پر پوری دنیا کے نظم و نسق کا انحصار رہا کرتا تھا ۔ گو اب دہلی برباد ہو گئی اور یہ شہر اُجڑ گیا ، یہاں سے اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا لیکن اب تک اِس اُجڑی ہوئی بزم کی گرمی اور رونق دل تڑپاتی ہے ۔ گو ہماری حاصل کردہ کامیابیاں خاک میں مل

گئیں لیکن اُن کی یاد اب تک محفوظ ہے۔

بند نمبر ۲:۔ ہے زیارت گاہ مسلم گو جہان آباد بھی
اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامان ناز
لالۂ صحرا، جسے کہتے ہیں تہذیب حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیونکر نہ ہمدوشِ ارم
جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبر کے قدم
جس کے غنچے تھے چمن ساماں، وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما، اُن کا مدفن ہے یہی

تشریح: اگرچہ اپنی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے دہلی بھی مسلمانوں کے لیئے قابلِ دید شہر ہے لیکن اِس اعزاز و بزرگی اور عظمت کا حق عراق کے شہر بغداد کو بھی حاصل ہے۔ بغداد وہ گلشن تھا جس کے لیئے قابلِ فخر دولت صحرا میں کھلنے والا لالہ تھا جسے دوسرے لفظوں میں حجازی یا اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے۔ اِس شہر کی مٹی آخر کیوں بہشت کی برابری نہ کرے جس پر آنحضرتؐ کے جانشینوں اور پیروکاروں کے قدم پڑتے رہے ہے۔ یہ وہی باغ ہے جس کے غنچے اور کلیاں بجائے خود پورے گلشن کی آرائش کا سامان کرتے تھے اور جن اولوالعزم بادشاہوں اور خلفاء سے عیسائیوں کی عظیم رومی سلطنت سپرپاور ہونے کے باوجود خوف زدہ رہتی تھی۔ وہ خلفاء بغداد ہی میں دفن ہوئے۔

بند نمبر ۳:۔ ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمع طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نمناک ہے

تشریح: اندلس کا شہر قرطبہ بھی مسلمانوں کی آنکھوں کی روشنی ہے۔ یہ شہر اپنے علم و فضل کے باعث علمی اعتبار سے یورپ کے تاریک ترین دور میں کوہ طور کی شمع کی طرح روشن و فروزاں تھا۔ گو یہ شمع بجھ کر مسلمانوں کی محفل کو بکھرا گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ تہذیب مغرب کا چراغ قرطبہ

ہی کی عنایت کے سبب روشن ہُوا - یہ شہر اُس تہذیب کا مدفن ہے جس کے باعث یورپ کے باغ میں اُگنے والی انگور کی بیلیں اور اُن کی جڑیں سرسبز و شاداب ہیں یعنی اس تہذیب کے باعث یورپ کو زندگی ملی - یہ صرف شاعرانہ مبالغہ ہی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے علاوہ عیسائی مؤرخین بھی اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں -

بند نمبر ۴ :- خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدی امت کی سطوت کا نشانِ پائیدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ایوبّ انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملّتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سینکڑوں صدیوں کی کشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر

تشریح قسطنطنیہ کی سرزمین جو رومیوں کے خاندانِ قیاصرہ کا وطن ہے اور سلطان محمدؐ فاتح کی عظمت و شان و شوکت کا مستقل اور غیر فانی نقش ہے - یہ زمین بھی خانۂ کعبہ کی طرح پاکیزہ اور مقدس ہے - یہ طویل عرصے تک اُن خلفاء کا گھر رہا جنہوں نے آنحضرتؐ کی مسندِ ارشاد سجائی اور اُسے رونق بخشی تھی - اِس خطے کی ہوا بھی پھول کی خوشبو کی طرح پاکیزہ ہے اور آج بھی حضرتِ ابو ایوب انصاری کے مقبرے سے یہی آواز آرہی ہے کہ یہ شہر اسلامیانِ عالم کے دل کی حیثیت رکھتا ہے - اور یہ شہر آسانی سے حاصل نہیں کیا گیا تھا بلکہ سینکڑوں برس تک قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری رہا تو یہ شہر حاصل ہُوا -

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ آنحضرتؐ نے اِس شہر کے فاتح کے لئے جنت کی بشارت دی تھی اِس بشارت کے پیشِ نظر ابتدائے اسلام ہی سے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوششیں شروع ہوگئی تھیں - قسطنطنیہ پر پہلا حملہ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں کیا گیا - حضرت ابو ایوبؓ انصاری اپنی پیرانہ سالی کے باوجود لشکر میں شامل تھے - اسلامی لشکر نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر رکھا تھا کہ حضرت ابو ایوبؓ انصاری کا انتقال ہوگیا - شہر کی فصیل سے باہر ان کو دفن کر دیا گیا - گو اُس وقت قبر کے آثار و نشانات مٹا دیئے گئے تھے لیکن بعد

میں سلطان محمدؒ فاتح نے تحقیق و تفتیش کے بعد قبر کے مقام پر مقبرہ بنوا دیا

بند نمبر ۵ :- وہ زمیں ہے تو، مگر اے خواب گاہ مصطفیٰ!
دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا

خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں

تجھ میں راحت اس شہنشاہ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی

نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ! یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں، باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

تشریح لیکن اے وہ شہر جس میں آنحضرتؐ محوِ خواب ہیں! تو اس قدر عظیم ہے کہ خود مسلمانوں کے مرکز یعنی کعبے کے لیئے بھی تیری زیارت حجِ اکبر کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر کائنات کو ایک انگوٹھی فرض کیا جائے تو اس میں تیری حیثیت روشن و چمکدار نگینے کی ہو گی۔ مسلمانوں کی عظمت و شان و شوکت نے تیری ہی سرزمین میں جنم لیا۔ تیری سرزمین میں دنیا کے سب سے عظیم اس بادشاہ کو آرام و سکون میسر آیا جس نے اپنے عمل اور پیغام کے ذریعے دنیا بھر کے انسانوں کو امن و چین دیا تھا۔ پہلے مصرع میں واقعہ ہجرت اور دوسرے میں آنحضرتؐ کی رحمۃ اللعالمینی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ شہنشاہ جس کے نام لیوا اور دم بھرنے والے، دنیا کے عظیم بادشاہوں میں شمار ہوتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو قیصر و جمشید یعنی روم و ایران جیسی سلطنتوں کے مالک قرار پائے۔

اسلامی قومیت اور ملت کا تصور کسی علاقے اور خطے سے وابستہ نہیں ہے لیکن اسے اسی قید میں لانا ہی پڑے تو ہندوستان، ایران اور شام وغیرہ اسلامی

قومیت کے تصور کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ بلکہ مسلمانوں کا وطن اور پناہ گاہ صرف مدینہ منوّرہ ہے۔ ہمارے تمام احساسات و تاثرات کو کھینچ لینے والا نقطہ صرف یہی شہر یعنی مدینہ ہے۔

اسے مدینہ منورہ جب تک دنیا میں تیرا وجود باقی ہے اُس وقت تک ہم بھی باقی رہیں گے۔ یعنی جب تک ہم تجھے اپنا مرکز تصور کریں گے اُس وقت تک بحیثیت ملت ہم زندہ رہیں گے اس لئے کہ تیری حیثیت صبح جیسی ہے اور ہم شبنم کے قطروں کی مثال ہیں اور شبنم کا وجود صبح سے وابستہ ہوتا ہے۔

شمع

پہلا بند :۔ تجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ اجل
لب اسی موجِ نفس سے ہے نوا پیرا ترا
میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا
گریہ ساماں میں، کہ میرے دل میں ہے طوفان اشک
شبنم افشاں تو، کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا
گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا
یوں تو روشن ہے، مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا
سوچ تو دل میں لقب ساقی ہے زیبا تجھے
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا
اور ہے تیرا شعار، آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا
کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلیٰ ترا
اے در تابندہ! اے پروردۂ آغوشِ موج
لذتِ طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا
اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہُوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

تشریح شمع شاعر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے کہ بے شک تمہاری اور میری کیفیت ایک جیسی ہے لیکن تمہارے اور میرے حاصل میں اس لیئے فرق ہے کہ تمہارے عمل اور مقصد میں تضاد ہے۔ مثلاً تم ریاکار ہو اور محض نمائش کے لیئے زندگی گزار رہے ہو۔

شمع کہتی ہے کہ سانس کی جو پھونک مجھے بجھا دیتی ہے اور میرے لیئے موت کا سامان بن جاتی ہے تم اُسی سانس کی وجہ سے نغمے پیدا کرتے ہو۔ میں صرف اِس لیئے جلتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جلنے کو میری فطرت کا لازمی جزُ بنا دیا ہے اور سوز و ساز میری فطرت میں چھپ گیا ہے جبکہ تو صرف اِس لیے روشن ہے کہ پروانوں یعنی لوگوں میں تیرا عشق اور جنوں پیدا ہو۔ میں اِس لیے روتی اور آنسو بہاتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا طوفان موجزن ہے جبکہ تو اِس لیے روتا ہے کہ پھولوں کی محفل یعنی مسلمانوں میں تجھے شہرت مل سکے۔ میری ہر صبح کا دامن میری راتوں کے خون سے رنگین اور سجا ہُوا ہے یعنی میں ہر آنے والی صبح کے لیئے بے انتہا قربانیاں دیتی ہوں جبکہ تمہاری آنے والی کل یعنی مستقبل تمہارے حال سے بالکل ناواقف ہے۔ یعنی تم اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے کوئی محنت نہیں کرتے اور نہ کوئی تکلیف اٹھاتے ہو۔ بے شک تم بھی میری طرح روشن ہو لیکن تمہارے دل میں وہ حقیقی اور پُرخلوص جلن موجود نہیں ہے جو میری فطرت میں مضمر ہے۔ اِسی لیئے تمہیں صحرا میں کھِلے ہوئے لالے کا چراغ سمجھنا چاہیئے، جو داغ تو رکھتا ہے لیکن حرارت اور روشنی سے تہی دامن ہوتا ہے۔ تو خود کو ساقی کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے لیکن ذرا سوچ کہ کیا تیرے لیئے یہ لقب مناسب اور موزوں بھی ہے۔ اس لیئے کہ تیرے ساقی کہلوانے کے باوجود تیری محفل پیاسی ہے اور تیرے پیالے میں بھی شراب نہیں۔ تیری بدصورتی اور بدعملی نے تیرے آئینے کو رسوا اور بدنام کر دیا ہے یعنی بے عمل

تو ُہے لیکن تیری وجہ سے پوری ملتِ اسلامیہ بدنام ہوتی ہے اور ایسا اِس لیئے ہے کہ ملت نے اپنے لیئے جو قاعدہ اور دستور بنا رکھا ہے تیرا طرزِ عمل اُس سے بالکل مختلف ہے۔ تُو اپنے پہلو میں کعبہ رکھتا ہے یعنی تو مسلمان ہے اس کے باوجود کافرانہ طریقِ زندگی کا شیدائی ہے اِس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ تیرا ذوق وشوق اور عشق کس قدر دیوانہ ہے۔

ملتِ اسلامیہ میں اب قیس جیسے عشاق اور صادق و مخلص لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان نہیں۔ اِس لیئے کہ تیرا صحرا وسیع نہیں ہے اور تیری محمل یعنی کجاوے میں کوئی محبوب بھی نہیں بیٹھا جو لوگوں کو اپنے عشق میں مبتلا کر سکے یعنی ملتِ اسلامیہ اپنے حقیقی جوہر سے عاری اور تہی دامن ہو چکی ہے۔ اے چمکدار اور روشن موتی تُو اس لیئے روشن و چمکدار ہے کہ تیری پرورش خطرات وحوادث کی موجوں کے درمیان ہوئی ہے۔ لیکن اب تیرا دریا طوفانوں اور مشکلات سے ناواقف ہو گیا ہے گویا اب تجھ میں مشکلات سے عہدہ برا ہونے اور اُن کا مقابلہ کرنے کی طاقت باقی نہیں رہی۔

اب تُو کس لیئے شاعری کرتا ہے۔ اب تو تیرا گلستان تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیرے نغمے بے موقع اور بے موسم ہیں اور اِسی لیئے بے نتیجہ اور لاحاصل ہیں۔ اب ان سے ملت کی بیداری کا کام نہیں لیا جا سکتا۔

علامہ اقبال نے اِس بند میں مختلف علامات سے کام لے کر رہنمایانِ قوم کے عدمِ خلوص، ریاکاری، خود غرضی اور کردار و گفتار میں تضاد کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔

دوسرا بند :۔ تھا جنہیں ذوقِ تماشا، وہ تو رخصت ہو گئے

لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے

ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی

پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا

اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا

پھول بے پرواہیں، تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے، آوازِ درا ہو یا نہ ہو

تشریح جو لوگ تماشا دیکھنے کے متمنی اور خواہشمند تھے وہ تو انتظارِ بسیار کے بعد مایوس ہو کر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد تُو دیدار کا وعدہ لے کر آیا تو اِس کا کیا فائدہ۔ تمہاری محفل سے بہت زیادہ تیز شراب پینے والے لوگ چلے گئے۔ اے ساقی اُن کے جانے کے بعد اب تو اپنے پیالے میں شراب لے کر آیا ہے تو اِس کا کیا فائدہ۔ گلستان میں پھولوں کے لیئے بہار کی تروتازہ کر دینے والی ہوا کا پیغام زندگی آیا لیکن اُس وقت جب گلشن اجڑ گیا اُس کا اجتماع بکھر گیا اور گلشن کی ایک ایک چیز خزاں کی زد میں آ گئی۔ اب اِس ہوا سے کیا کام لیا جا سکتا ہے! محبوب کے عشق اور فرقت میں زخم کھانے والے لوگ رات بھر تڑپتے رہے۔ رات کے آخری حصے میں اُن کی بے چینی اور اضطراب دیکھنے کے لائق تھا لیکن محبوب انہیں اپنا جلوہ دکھانے پر آمادہ نہ ہُوا۔ لیکن جب یہ تڑپ ختم ہو گئی ، عاشق اور بسمل دیدار سے مایوس ہو گئے تو محبوب انہیں اپنا جلوہ دکھانے پر آمادہ ہُوا اور چھت کے اوپر پہنچا بھی تو کیا حاصل۔ وہ شعلہ جسے اُس کی روشنی اور حرارت کی وجہ سے تمام پروانے پسند کرتے تھے، بجھ گیا۔ جب تک وہ روشن اور گرم رہا کسی نے اُس سے فیض حاصل نہ کیا۔ جب وہ بجھ گیا تو اب کوئی سوز اور جلن کا سودائی بن کر آیا بھی تو کیا فائدہ۔

اب شاعری کرو یا نہ کرو اِس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اِس لیئے کہ پھول جو شاعری سے متاثر ہو سکتے تھے، اپنے اچھے بُرے سے بے پروا ہو چکے ہیں۔ اب خواہ گھنٹی کی آواز آئے یا نہ آئے اِس سے کچھ حاصل نہیں۔ چونکہ قافلے پر بے حسی طاری ہے۔ لہٰذا وہ گھنٹی کی آواز پر کان نہیں دھرے گا اور نہ اپنی منزل کی طرف سفر کرنے پر آمادہ ہو گا۔

اِس بند میں علامہ اقبال نے شمع کی زبانی قوم کی بے حسی اور رہنماؤں کی طرف سے بے وقت کی راگنی کا منظر پیش کیا ہے۔

تیسرا بند:۔ شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا!
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے
رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تُو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

شوق بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

وہ جگر سوزی نہیں، وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے

خیر تو ساقی سہی، لیکن پلائے گا کسے؟
اب نہ وہ میکش رہے باقی، نہ میخانے رہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اُسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی، لیلیٰ کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تشریح: شمع کہتی ہے کہ تجھے اپنی محفل میں شمع کی حیثیت حاصل تھی اور شمع کا تمام تر سرمایہ جلن اور سوز ہوتا ہے لیکن تو سوز سے بالکل تہی دامن تھا۔ اِس سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ جب تو شمع ہونے کے باوجود سوز سے خالی تھا تو تیرے پروانوں میں وہ سوز اور جاں نثاروں کا جذبہ کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ یعنی اگر رہنما اپنے مقصد سے مخلص نہ ہو تو قوم بھی اُس کی آواز پر لبیک کہنے میں مخلص نہیں ہو سکتی۔ جب تو اس قدر صلاحیت رکھتا تھا کہ قوم کے تمام افراد کو بلا تفریقِ رنگ و نسل تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی دھاگے میں پرو کر انہیں متحد کر سکتا تھا تو پھر آخر یہ لوگ کیوں نہ متحد ہوئے؟ ظاہر ہے کہ اِس سے تیری خود غرضی اور عدمِ خلوص نمایاں ہوتا ہے۔ ماضی میں سچا اور مشکلات کو خاطر میں نہ لانے والا عشق اور انتہائی بلند خیالی مسلمانوں کی متاع تھی لیکن آج مسلمان ان دونوں چیزوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان میں نہ تو عاشق اور دیوانے پیدا ہوتے ہیں اور نہ عاقل اور دانشور۔ اور ماضی کے عروج کے مقابلے میں موجودہ زمانے کے زوال کی یہی وجہ ہے۔

اب مسلمانوں میں نہ تو جگر کو جلانے یعنی مشکلات و شدائد برداشت کرنے کا جذبہ ہے اور نہ وہ عشق کو جلا دینے والی شراب پینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یعنی نہ ان میں جدوجہد کرنے کی قوت باقی ہے اور نہ اپنے مقاصد کے حصول سے

انہیں کوئی رغبت ہے۔ ایسے میں اگر شمع یعنی قوم کے رہنما کے گرد کچھ پروانے موجود بھی ہوں تو کچھ حاصل نہیں۔ چلیئے میں یہ تسلیم کر لیتا ہوں کہ تو ساقی ہے اور لوگوں کو شراب پلاتا ہے لیکن یہ تو سوچ کہ اب تو ساقی ہو کر کیا کرے گا اور کیسے شراب پلائے گا؟ اس لیئے کہ اب نہ تو پرانے شراب خانے باقی ہیں اور نہ پرانے شراب پینے والے۔ یعنی زمانہ اور اُس کے تقاضے سب کچھ بدل گئے۔ ایسے میں ماضی کی عظمت کو بحال کرنا سخت مشکل ہے۔

شمع اِس صورتِ حال پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتی ہے کہ جس ساقی کے پیمانے اور شراب کے پیالے کل تک پوری بزم میں گردش کرتے اور لوگوں کو شراب پلاتے رہے آج اُس ساقی کی یادگار کے طور پر صرف ایک ٹوٹی ہوئی صراحی باقی ہے اور اپنے ساقی کا ماتم کر رہی ہے یعنی عروج کے تمام آثار ختم ہو گئے البتہ اُس کی چند یادیں باقی ہیں۔ آج وہ تمام صحرا بالکل خاموش ہیں جو ایک زمانے میں عشق و جنوں کی پرورش کیا کرتے تھے اور جن میں لیلیٰ اور اُس کے عاشق محوِ رقص و سرود رہتے تھے۔ یعنی ملتِ اِسلامیہ جن جن خطوں میں برسرِ اقتدار اور حکمران رہی آج وہ تمام خطے اُس کی حکمرانی سے نکل گئے اور وہاں پر مسلمانوں کی تہذیب نے دم توڑ دیا۔

یہ ہماری ناکامی اور زوال کی انتہا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے قافلے کی تمام دولت لُٹ گئی لیکن اِس سے زیادہ رنج دہ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل سے اپنے لٹنے، برباد ہوئے اور اپنے نقصان و خسارے کا احساس بھی جاتا رہا۔ یعنی انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اُنہوں نے کیا کچھ کھو دیا۔

اِس بند میں بھی من حیث المجموع ملتِ اسلامیہ کی بے حسی کا رونا رویا گیا ہے۔

بند نمبر ۴ :- جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی

شہر اُن کے مٹ گئے، آبادیاں بن ہو گئیں

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی

وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے

موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

خود تجلّی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی

وہ نگاہیں ناامیدِ نورِ ایمن ہو گئیں

اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں

وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں!

دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں؟
اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بداماں ہو گئیں

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

تشریح علامہ اقبال ماضی میں مسلمانوں کے عروج اور موجودہ عہد میں اُن کے زوال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں مسلمانوں کے ہنگاموں سے ویران مقامات بھی آباد اور پُررونق ہو گئے تھے جبکہ آج یہ حالت ہے کہ خود مسلمانوں کے اپنے شہر برباد اور ویران ہو گئے اور اُن کی آبادیاں جنگلوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ جن نمازوں کے باعث ہندوستان جیسے بت پرست علاقے میں اللہ کو ایک ماننے والوں کی حکومت قائم ہوئی اب وہ نمازیں ہندوستان کے برہمنوں کی نذر ہو چکی ہیں یعنی توحید پرستوں نے اب ہندو رہنماؤں کو اپنا آقا اور لیڈر مان لیا ہے جس کی وجہ سے ان کی اپنی حیثیت و اہمیت ختم ہو گئی ہے دراصل مسلمانوں نے زندگی اور زمانے کے عام قاعدے سے روگردانی کی۔ زندگی کا عام قاعدہ اور دستور یہ ہے کہ یہاں پر ہمیشہ رہنے والی عیش و مسرت پابندیوں کو قبول کر کے حاصل کی جا سکتی ہے اور اگر ان پابندیوں کی خلاف ورزی کی جائے تو عیش و مسرت غم و اندوہ میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً جب تک پانی کی موج دریا میں رہتی ہے اور اس کی پابندی کو قبول کرتی ہے تو وہ طلاطم خیز بنی رہتی ہے لیکن جب ہی موج سمندر یا دریا کے کناروں سے ٹکرا کر پابندی توڑنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے آزاد ہونے کی خواہش کے نتیجے میں آہ و زاری اور نالہ و فریاد سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نور جو حضرت موسیٰؑ کو طور پر نظر آیا تھا، اپنے دیکھے جانے کے لیئے جن نگاہوں کا متمنی تھا اب وہ نگاہیں اُسی نور سے ناامید ہو چکی ہیں اور یہ پستی اور زوال کی انتہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ باغ میں ہزاروں بلبلیں

نغمے گاتی ہوئی اِدھر سے اُدھر اڑتی پھرتی تھیں۔ خدا جانے اُن کے دل میں کیا آئی اور اُنہوں نے کیا سوچا کہ وہ تمام بلبلیں اپنے اپنے آشیانوں میں اسیر ہو گئیں اور یوں گلستان کی زیب و زینت ختم ہو کر رہ گئی وہ بجلیاں جن کی تڑپ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں دیکھنے والوں کو جلا دیتی تھیں اب کھلیان کے دامن میں آرام کر رہی ہیں اور اُن کی حدت و حرارت ختم ہو چکی ہے یعنی ملت اسلامیہ کا ہر فرد اپنی حقیقی صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہے ایسے میں میری خون برسانے والی آنکھیں پھولوں کے لیئے باغ کا احسان کیوں لیں۔ انہوں نے تو اپنے مسلسل بہنے والے آنسوؤں سے میرے دامن ہی کو گلزار بنا دیا ہے اور میرے دامن میں آنسوؤں کی وجہ سے بہت سے پھول کھل گئے ہیں لیکن ہمارے غموں کی یہ شام مستقل اور دائمی نہیں ہے بلکہ یہ شام غم تو مسرت و شادمانی کی صبح کو خوشخبری دے رہی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو رات کی تاریکی میں امید کی کرن نظر آتی ہے۔ یعنی ملتِ اسلامیہ کا انتہائی زوال آخر کار ختم ہوگا اور پھر اس کے عروج کا دور شروع ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہر شام کے بعد صبح اور ہر رات کے بعد دن آتا ہے۔

بند نمبر ۵ :۔ مژدہ اے پیمانہ بردار خمستانِ حجاز
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

نقد خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی
پھر دکاں تیری ہے لبریز صدائے ناؤ و نوش

ٹوٹنے کو ہے طلسم ماہ سیمایانِ ہند
پھر سلیمی کی نظر دیتی ہے پیغامِ خروش

پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شراب خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

نغمہ پیرا ہو، کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

آنکھ کو بیدار کر دے :عادۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوز جوہرِ گفتار سے

تشریح اے حجاز کے شراب خانے سے شراب پلانے والے یعنی اے آنحضرتؐ! آپؐ کے لیئے یہ خوشخبری کی بات ہے کہ ایک طویل عرصے تک مدہوش اور اپنے نفع و نقصان سے بے بہرہ رہنے والوں کو آخر کار پھر ہوش آرہا ہے یعنی ملّتِ اسلامیہ پھر بیدار ہو رہی ہے۔ آج تک اس ملّت نے اپنی غیرت و خودداری کو دشمنوں کی شراب کے عوض فروخت کر رکھا تھا یعنی یہ اپنا مذہب اور تہذیب چھوڑ کر فرنگی و عجمی تہذیب کے دلدادہ ہو رہے تھے۔ لیکن اب پھر تیری دکان میں پینے پلانے کا شور برپا ہے یعنی مسلمان پھر اپنے مذہب اور تہذیب کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ہندوستان کے چاند جیسی پیشانی رکھنے والوں کا جادو ختم ہونے والا ہے اور ایک بار پھر سلیمیٰ کی نظریں لوگوں کو سرگرمِ تگ و تاز کر رہی ہیں۔ واضح ہو کہ یہاں پر ماہ سیما یانِ ہند کا اشارہ ہندوستان کے انگریز حکمرانوں اور ہندو رہنماؤں دونوں کے لیئے ہو سکتا ہے اس لیئے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنا تشخص ختم کر کے انہی کے رنگ میں رنگے جانے کی کوشش میں مبتلا تھے۔ اس طرح سلیمیٰ عربی شاعری کی ایک خیالی محبوبہ کا نام ہے۔ اقبال نے یہ نام یہاں پر اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدّن کے لیئے استعمال کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اب پھر یہ شور بلند ہے کہ..... ساقی! مغرب کی شراب یعنی تہذیب و تمدّن نے دل کے ہنگامے خاموش کر دیئے ہیں لہٰذا ہمیں ایک بار پھر گھر کی بنی ہوئی شراب عطا کر۔

اقبال ملّتِ اسلامیہ کی اس نشاۃِ ثانیہ پر خوش ہو کر کہتے ہیں کہ اے اقبال! تجھے نغمے گانے چاہئیں کہ یہ خاموش رہنے کا وقت اور موقع نہیں ہے۔ اب صبح کا وقت ہے اور آسمان نے اپنے کاندھے پر سورج کی صراحی اٹھا رکھی ہے۔ میں تمہیں ایک بہت عمدہ بات بتا رہا ہوں۔ اگر تم میں طاقت اور قدرت ہو تو یہ بات سنو کہ تم دوسروں کے غم میں جلو اور دوسروں کو اپنے ساتھ جلاؤ۔ یعنی سب لوگ متحد و متفق ہو کر ایک دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنے لگیں۔ بڑے اور عظیم لوگ یہ بات کہہ گئے ہیں کہ اچھی شاعری پیغمبری کا جز ہوتی ہے یعنی اس میں انسانوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لہٰذا اے اقبال تو بھی ایک پیغمبر کی طرح اپنی ملّت کی بزم میں خوشخبری سنانے والے فرشتے کا پیغام سُنا دے۔

اہلِ ملّت کی محو خواب آنکھوں کو دیدار کے وعدے سے بیدار کر دے اور لوگوں کے دلوں کو اپنی شاعری کی جلن اور تڑپ سے زندہ کر دے۔

۵- قوت اور دین

حلِ لغات

اسکندر — یونان کے علاقے فیلقوس کا عظیم بادشاہ جس نے ہندوستان و چین تک فتوحات حاصل کیں اور بہت کم عمری میں اپنی اولوالعزمی اور قوت و جرأت سے عظیم الشان سلطنت پیدا کی۔ چنگیز۔ مشہور تاتاری حکمران جو بے شمار سلطنتوں کا فاتح قرار پایا اور جس نے مقتول انسانوں کی کھوپڑیوں سے مینار تعمیر کر کے ظلم و سفاکی کا بدترین معیار قائم کیا۔ قبا۔ لباس۔ چاک۔ پھٹنا، ٹکڑے ٹکڑے ہونا۔ قبا چاک ہونا۔ بے عزتی ہونا۔ امم۔ امت کی جمع، قومیں، ملتیں، اُمتیں۔ ازلی۔ آغاز خلقت سے پہلے کا، ہمیشہ ہمیشہ سے، ناقابلِ تغیر و تبدل۔ صاحبِ نظراں۔ اہلِ نظر، حقیقت تک رسائی حاصل کرنے والے۔ سیل۔ پانی کی طغیانی۔ سبک سیر۔ نہایت تیز رفتار۔ خس و خاشاک۔ گھاس پھوس، بے وقعت۔ زہرِ ہلاہل۔ ہلاک کر دینے والا زہر۔ تریاک۔ زہر کا اثر ختم کرنے والی دوا۔

شعر نمبر ۱:- اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

تشریح

علامہ اقبال اِس نظم میں دین اور طاقت کے باہمی رشتے کی وضاحت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر طاقت دین کی اخلاقی قوت کے تابع ہو تو وہ انسانی زندگی کے لیئے منفعت بخش ہے لیکن اگر اِسے اخلاقی اصولوں سے آزاد کر دیا جائے تو بے حد تباہی پھیلاتی ہے۔

اِس شعر میں علامہ اقبال اپنا مفہوم واضح کرنے کے لیئے تاریخ انسانی کے دو ظالم بادشاہوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سکندر رومی اور تاتاری بادشاہ چنگیز کی وجہ سے نسل انسانی کو بے شمار مرتبہ آگ اور خون کے سیلاب سے گزرنا پڑا اور ہزاروں مرتبہ انسان کی عزت و توقیر داغدار ہوگی۔

شعر نمبر ۲:- تاریخِ امم کا یہ پیغام ازلی ہے صاحبِ نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

تشریح

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ قوموں اور ملتوں کی تاریخ کا یہ ناقابلِ تغیر پیغام اور سبق ہے کہ جن لوگوں کے پاس طاقت و قوت ہو اور وہ اِس کے زعم میں مبتلا ہو کر اخلاقی اصولوں کو بھول جائیں اِس کے نتائج نسلِ انسانی کے لیئے ہمیشہ خطرناک

نکلتے ہیں اور ایسے لوگ طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر ہزاروں لاکھوں لوگوں کو اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ مفادات کے لیئے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں اور یوں انسانی زندگی میں فساد پھیل جاتا ہے اور عام لوگ اپنے حقوق سے محروم ہو جاتے ہیں۔

شعر نمبر ۳:۔ اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

تشریح: علامہ اقبال کہتے ہیں کہ طاقت و قوت کے اِس تیز رفتار سیلاب کے سامنے تمام اچھی چیزیں گھاس پھوس اور بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ طاقت نہ عقل کو خاطر میں لاتی ہے نہ عقلی دلائل کو، نہ اِس کے لیئے بصارت کی اہمیت ہوتی ہے نہ بصیرت کی۔ نہ یہ طاقت علم کی قدر کرتی ہے نہ ہنر کی۔ طاقت ان تمام اعلیٰ چیزوں کو بے آبرو کرتی ہے اور انہیں ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے۔

شعر نمبر ۴:۔ لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

تشریح: اقبال کہتے ہیں کہ اگر قوت و طاقت دین کے اعلیٰ اخلاقی اصولوں سے بے تعلق ہو تو یہ انسانی زندگی کے لیئے ہلاک کر دینے والے زہر کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اگر یہی طاقت دین کی اتباع اختیار کرلے تو پھر ہر زہر کا علاج بن جاتی ہے اور انسانی زندگی کو بے حد فائدہ پہنچاتا ہے۔

علامہ اقبال حضرت علی المرتضیٰ کی طاقت و قوت کو اِس لیئے سراہتے ہیں کہ اُن کی قوت دین کے تابع اور ذاتی اغراض سے پاک تھی اور مرحب و عنتر کی قوت کے خلاف اِسی لیئے ہیں کہ وہ دین سے لاتعلق تھے اور اُن کی قوت ذاتی مفادات کے حصول کے لیئے استعمال میں آتی تھی۔ علامہ اقبال مردِ مومن کی قوت کے بھی اِسی لیئے معترف ہیں کہ وہ دینی اصولوں کے تحت ہوتی ہے۔

زمانۂ حاضر کا انسان

حلِ لغات: عشق — اقبال کے نزدیک وہ طاقت جو انسان کے اعلیٰ ترین نصب العین کے حصول میں معاونت کرتی ہے۔ ناپید۔ نہ ہونا، عاری، تہی۔ گردش۔ شراب کا مارا ہوا۔ مار۔ سانپ، ناگ۔ تابع۔ مقلد۔ فرمان۔ حکم۔ افکار۔ خیالات۔ حکمت۔ دانائی۔ ضرر۔ نقصان۔

شعر نمبر ۱:۔ عشق ناپید و خرد مے گزدش صورتِ مار عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا

تشریح: علامہ اقبال موجودہ دور کے انسان کی حالتِ زار اور کسمپرسی کا نقشہ کھینچتے

ہوئے کہتے ہیں کہ آج کا انسان اپنی تمام تر ترقی کے باوجود انتہائی ابتر صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اُس کا دل جذبۂ عشق سے خالی ہے۔ اُس کی عقل اور دانائی کی یہ کیفیت ہے جیسے ایک بلانوش شرابی مدہوش ہو اور اُس کی چال میں سانپ کی طرح سیدھا پن نہیں رہا حالت یہ ہے کہ آج تک باوجود کوشش کے وہ اپنی عقل و خرد کو دانائی کے تابع نہیں بنا سکا۔ اور عقل اُسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب وہ دانائی کے تابع ہو بصورت دیگر وہ انسانی زندگی کے لیئے ہزار آفات پیدا کرنے کی موجب ہو جاتی ہے اور انسان انہی سے دوچار ہے۔

شعر نمبر ۲:۔ ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا   اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

تشریح: بے شک آج کا انسان اپنی عظیم ترین رصدگاہوں اور خلائی تحقیق کے اداروں کے باعث ستاروں تک کے راستے دریافت کرنے کی کوشش میں مصروف ہے اور اِس نے اپنے اِس مشن میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کر لی ہے لیکن کتنے دکھ کی بات ہے کہ یہ آج تک اپنے خیالات کی دنیا میں سفر کرنے سے قاصر ہے اور انسانی مسائل کا حل اِس کے بس کی بات نہیں ہے۔

شعر نمبر ۳:۔ اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا   آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

تشریح: اِس نے اپنے حقیقی راستے کو ترک کر کے اپنے لیئے حکمت و دانائی کے جو فلسفے تیار کیئے اُن کے نشیب و فراز اور الجھنوں میں اِس بڑی طرح پھنس گیا کہ آج تک اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ کونسی بات انسان اور انسانیت کے لیئے مفید ہے اور کونسی نقصان دہ۔ اور یہ انسان آج تک اِس کشمکش اور گومگو کا شکار رہے ہے۔

شعر نمبر ۴:۔ جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا   زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

تشریح: بے شک اس نے سورج تک کی شعاعوں کو گرفتار کر لیا اور اِس سے اپنے بہت سے کام نکال لیئے اور اِسے اپنے لیئے از حد مفید بنا لیا اِس کے باوجود اپنی تاریک راتوں کو صبح میں بدلنے سے قاصر ہے اور اِس کے روز و شب اندھیروں میں مقید ہیں۔

نگاہ

حل لغات شباب — جوانی ؛ ذوق ۔ شوق ، عشق ، دلچسپی ؛ رعنائی ۔ سجاوٹ ، زیبائی ؛ چشمکیں ۔ اشارۂ چشم ؛ پہنائی ۔ وسعت ؛ عروس ۔ دلہن ؛ عماری ہودج ، کجاوا ؛ سپہر ۔ آسمان ۔ نگاہ ۔ دیکھنے کی صلاحیت ، اہلیت ، تعلیم و تربیت ؛ بہا ۔ قیمت ، معاوضہ ۔

شعر نمبر ۱ :۔ بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی

تشریح علامہ اقبال کہتے ہیں کہ بہار کا موسم اور اس موسم میں صحرا کے اندر کھلے ہوئے گل لالہ کے قافلوں کا نظارہ کس قدر دلکش اور دل موہ لینے والا ہے ۔ ان کی جوانی ، مستی ، ان کا شوق اور لذت و زیبائی دل کو اپنا اسیر کر لیتی ہے ۔

شعر نمبر ۲ :۔ اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی یہ بحر! یہ فلک نیلگوں کی پہنائی

تشریح علامہ ایک دوسرے منظر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اندھیری رات میں ستارے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں ۔ ایسی اندھیری رات میں سمندر کی موجیں اور لہریں اور آسمان کی وسعت انسان کو مرعوب و متحیر کر دیتی ہے ۔

شعر نمبر ۳ :۔ سفر عروس قمر کا عماری شب میں طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی

تشریح اس طرح رات کے ہودج میں چاند کی دلہن یا چاند کا سفر بہت ہی خوشنما اور دیدہ زیب ہے ۔ بالکل اسی طرح صبح کے وقت سورج کا طلوع ہونا اور آسمان کی خاموشی بھی انسان کو متاثر کرتی ہے ۔

شعر نمبر ۴ :۔ نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

تشریح لیکن یہ سب چیزیں اور اُن کے حُسن سے انسان اُسی صورت میں متمتع اور فیضیاب ہو سکتا ہے جب اس خاص نقطہ نظر سے انسان کی تربیت کی گئی ہو اور وہ صاحبِ صلاحیت ہو ۔ اور اگر ایک آدمی ان اشارات فطرت کو سمجھتا ہے اور ان سے لطف حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو سچ یہ ہے کہ ان مندرجہ بالا مناظر کی کوئی قیمت ہی نہیں یعنی یہ بے بدل ہیں اور اس لیئے ہیں کہ فطرت اپنے حسن کو فروخت نہیں کرتی ، یعنی کوئی بھی صاحبِ نظر ان سے فیضیاب ہو سکتا ہے اور کوئی بھی دولت مند ہزارہا وسائل کے باوجود صلاحیت نہ ہونے کے باعث محروم رہ سکتا ہے ۔

مولانا ظفر علی خاں

فخرِ رُسل

حلِ لغات: فخرِ رُسل ـــــ (رُسل جمع ہے رسول کی) رسولوں کے لیے باعثِ فخر۔ مراد ہے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات؛ رشکِ زبانِ کلیم۔ حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ کی زبان کے لیے بھی قابلِ رشک؛ مایۂ نازش۔ فخر و ناز کا سبب؛ فکرِ رسا۔ پہنچنے والی عقل۔ مراد ہے شاعری؛ وجہِ تفاخر۔ فخر کرنے کی وجہ؛ طبعِ سلیم۔ نیک فطرت؛ شہِ ہر دو جہاں۔ دونوں جہانوں کے بادشاہ، مراد ہے آنحضرتؐ؛ سرورِ کون و مکاں۔ دنیا جہان کے سردار، مراد ہے آنحضرتؐ؛ ندیم۔ دوست۔ ساتھی؛ شفیعِ مطاع۔ شفاعت کرنے والا بزرگ؛ قسیم۔ تقسیم کرنے والا؛ جسیم۔ جسم والا۔ تنومند۔ طاقتور؛ وسیم۔ خوبصورت۔ خوش وضع؛ مزین ہونا۔ سج جانا؛ مسندِ پیغمبری۔ پیغمبری کا تخت؛ فروزاں ہونا۔ روشن ہونا؛ بزمِ الف لام میم۔ مراد ہے قرآن کی تعلیم کی محفل؛ لات و ہبل۔ اُن بتوں میں سے دو کے نام جو فتحِ مکہ سے قبل کفار نے خانہ کعبہ میں پوجا کے لیے رکھے ہوئے تھے؛ سر کے بل گرنا۔ نہایت ادب کے ساتھ سجدہ کرنا۔ تعظیم بجا لانا؛ فرو ہونا۔ بجھ جانا۔ ختم ہو جانا؛ نارِ جحیم۔ جہنم کی آگ؛ عظامِ رمیم۔ گلی ہوئی بوسیدہ ہڈیاں؛ ظلمتِ جہلِ سقیم۔ بہت زیادہ جہالت کی تاریکی؛ صاحبِ دیہیم و تاج۔ تاج اور تخت کا مالک؛ عامی لوگ۔ عام لوگ؛ کثیر۔ بہت زیادہ۔ بے شمار؛ عظیم۔ عظمت والا؛ بارِ عظیم۔ عظیم بوجھ۔

تعارف: مولانا ظفر علی خاں کی قومی و ملّی شاعری میں اُن کی نعتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی نعت میں آنحضرت صلعم کی ذاتِ گرامی سے محبّت و عقیدت کا جو والہانہ پن پایا جاتا ہے وہ اُن کے جذبۂ ایمانی کا مظہر ہے۔ زیرِ مطالعہ نعتِ رسولِ مقبولؐ اِس کا زندہ ثبوت ہے جو غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

شعر نمبر ۱: کہنے کو ہوں آج میں نعتِ رسولِ کریمؐ   میری زباں کیوں نہ ہو رشکِ زبانِ کلیم

تشریح: میں آج رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی نعت کہنے والا ہوں اور اُن کی مدح و توصیف میں میری زبان جو عقیدت بھرا انداز اختیار کرے گی اور جس جس طرح اُن کے اوصافِ حمیدہ بیان کرے گی اُس پر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی اللہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرنے والی زبان کو بھی رشک ہو گا۔ گویا نعتِ رسولؐ کہتے ہوئے میری زبان

حضرت موسیٰؑ کی زبان کے لیے بھی باعثِ رشک ہوگی ۔

شعر نمبر ۲ :- مایۂ نازش مجھے ہے مری فکرِ رسا وجہ تفاخر مجھے ہے میری طبع سلیم

تشریح میرے لیے میری یہ شاعری یقیناً ناز کرنے کا سرمایہ ہے اور مجھے اپنی نیک فطرت اور طبیعت پر فخر ہے گویا میری نعتیہ شاعری میری نیک فطرت کا نتیجہ ہے اسی لیے مجھے اپنی سلیم طبع پر فخر اور شاعری پر بجا طور پر ناز ہے ۔

شعر نمبر ۳ :- اے شہِ ہر دو جہاں سرورِ کون و مکاں تو ہے خدا کا حبیب تو ہے خدا کا ندیم

تشریح مولانا ظفر علی خاں رسولِ پاک کی ذاتِ گرامی کے اوصافِ حمیدہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے دونوں جہانوں کے بادشاہ اور سردار ! آپؐ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور دوست ہیں ۔ یعنی آپؐ کا مقام یہ ہے کہ خدا آپؐ کو محبوب رکھتا ہے اور آپؐ اللہ کے دوست ہیں ۔

شعر نمبر ۴ :- تو ہے شفیعِ مطاع تو ہے نبی کریم تو ہے قسیم وجسیم تو ہے نسیم و وسیم

تشریح اے رسولِ پاک کی ذاتِ گرامی ! آپؐ تو وہ بزرگ ہستی ہیں جو اپنی امت کی شفاعت اور بخشش کا باعث ہونگے اور آپؐ اللہ کے وہ نبی ہیں جو نہایت مہربان بزرگ اور معاف کرنے والے ہیں آپؐ تو قوت و طاقت رکھنے کے باوجود اللہ کی نعمتوں کو اُس کے بندوں میں تقسیم کرنے والے ہیں ۔ پھر آپؐ کی شان یہ بھی ہے کہ حسن وخوبی کے اعتبار سے بھی آپؐ اپنی مثال آپ ہیں ۔

شعر نمبر ۵ :- تجھ سے مزین ہوئی مسندِ پیغمبری تجھ سے فروزاں ہوئی بزمِ الف لام میم

تشریح اے رسولِ پاکؐ کی ذاتِ گرامی ! آپؐ کی بدولت پیغمبری کی مسند کو زیبائی نصیب ہوئی اور آپؐ کی حسنِ سیرت اور حسنِ صورت سے پیغمبری کا تخت سج گیا اور آپؐ کی بدولت قرآن کی تعلیم کی محفل میں اجالا ہوا ۔ یعنی آپؐ کی ہستی اِس دُنیا میں رشد و ہدایت کا سبب بنی ۔

شعر نمبر ۶ :- دیکھ کے تجھ کو گرے لات وہبل سر کے بل آتے ہی تیرے فرو ہوگئی نارِ جحیم

تشریح آپؐ کی ذات تو وہ ہے جسے دیکھتے ہی لات اور ہبل یعنی پتھر کے بت بھی عقیدت اور احترام سے سجدے میں گر گئے بت پرستی کا زمانہ ختم ہو گیا اور آپؐ کی بدولت جہنم کی آگ بجھ گئی ۔ انسانوں کو بت پرستی اور شرک کے ساتھ ساتھ جہنم کی آگ سے بھی نجات ملی ۔

شعر نمبر ۷ :- تو نے تو زندہ کیا بات میں اُس جسم کو رہ گئی تھیں اک فقط جس کی عظام رمیم

تشریح مولانا ظفر علی خاں آنحضرتؐ کا ایک معجزہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپؐ کی مسیحائی کا یہ عالم ہے کہ آپؐ نے اُس مردے کو جس کی ہڈیاں تک گل سڑ گئی تھیں

محض باتوں باتوں میں زندہ کر دیا۔ اور یہ معجزہ آپؐ کی اللہ سے قربت کو ظاہر کرتا ہے۔

شعر نمبر ۸:۔ جس کی رگ و پے میں تھا شرک سمایا ہؤا چھائی ہوئی جس پہ تھی ظلمتِ جہلِ سقیم

تشریح مردہ حالت سے زندہ ہونے والا یہ ایک ایسا شخص تھا جس کی رگ رگ میں کفر اور شرک سمایا ہؤا تھا اور جس کے ذہن اور دل پر بہت زیادہ جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی یعنی آپؐ کے حکم سے کفر و جہالت کی حالت میں مرنے والا وہ مردہ زندہ ہو گیا جس کو مرے کو بھی مدتیں گذر چکی تھیں۔

شعر نمبر ۹:۔ ہو گئے صحرا نشیں صاحب دیہیم و تاج عامی و جاہل بنے تیری بدولت کلیم

تشریح اے رسول پاکؐ! آپؐ کی رشد و ہدایت کے نتیجے میں عرب کے صحرا میں بسنے والے گنوار بدو دنیا پر حکمرانی کرنے لگے اور وہ عام لوگ جو جاہل شمار ہوتے تھے وہ آپؐ کی تعلیم کی بدولت گفتگو کا سلیقہ اور شعور پا کر اندازِ تکلم کی بے شمار خوبیوں کے حامل بن گئے۔

شعر نمبر ۱۰:۔ دولتِ دنیا و دیں قوم کو دی ایک ساتھ ہے تیری بخشش کثیر ہے ترا احسان عظیم

تشریح اے رسولِ پاکؐ! امت پر تیرے احسانات اور عنایات بے شمار ہیں۔ تیرے احسان کی عظمت کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ کہ تو نے مسلمان قوم کو دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں سے نوازا۔ یعنی دین کی بدولت اللہ تک پہنچنے کا راستہ بتایا اور رزقِ حلال کا سلیقہ سکھا کر دنیا میں ترقی کا راستہ دکھایا۔

شعر نمبر ۱۱:۔ الغرض احسان تیرے قوم پہ ہیں بے شمار اٹھ نہ سکے گا کبھی ہم سے یہ بارِ عظیم

تشریح اے رسولِ پاکؐ! مختصر یہ ہے کہ تیرے مسلمان قوم پر بے شمار احسانات ہیں اور اِن احسانوں کا عظیم بوجھ اِس قوم سے کبھی نہ اُٹھ سکے گا۔ یعنی دین و دنیا کی تعلیمات کے جو احسانات آپؐ نے ہم پر کیے ہیں اُن کا شمار بھی ممکن نہیں اور اُن کا بدلہ چکانا بھی ممکن نہیں۔

سلطان ٹیپو کے مزار پر دو آنسو

حلِ لغات گنجِ شہیدانِ کرام —— نہایت بزرگ شہیدوں کا خزانہ، مراد ہے سرنگاپٹم۔ نمود۔ ظہور۔ ظاہر ہونا۔ ہبوط۔ پستی۔ زوال۔ صعود۔ بلندی۔ عروج۔ کشورِ ہند۔ خطۂ ہندوستان۔ مکر۔ فریب۔ دھوکا۔ چرخِ کبود۔ نیلا آسمان، مراد ہے

بدنصیبی ؛ مایۂ ناز۔ ناز کرنے کے قابل سرمایہ ؛ قوتِ بازوئے اسلام۔ اسلام کے بازوؤں کی قوت مراد ہے اسلام کی طاقت ؛ صولت۔ رعب۔ دبدبہ۔ ہیبت ؛ ہنود۔ جمع ہے ہندو کی ؛ حسود۔ حاسد کی جمع مراد ہے بدخواہ ؛ لرزہ بر اندام حسود۔ حاسدوں اور بدخواہوں کے جسم خوف سے کانپنے لگتے ہیں ؛ گھر بیٹھ جانا۔ کسی کام کے نہ رہنا مراد ہے بے اہمیت ہونا، اثر ختم ہو جانا ؛ قیام۔ نماز میں کھڑے ہونا۔ ٹھہراؤ۔ استقلال ؛ قعود۔ نماز میں دو زانو بیٹھنا۔ مراد ہے بیٹھنا ؛ قول۔ کہی ہوئی بات۔ مراد نصیحت ؛ آئینِ حمیت۔ غیرت کا دستور۔ غیرت کا انداز ؛ مہلتِ یک روزہ۔ ایک دن کی مہلت۔ ایک دن کی زندگی ؛ صد سالہ خلود۔ سو سال کی زندگی ؛ خلود۔ ہمیشگی مراد ہے زندگی ؛ دلِ حسرت زدہ۔ حسرتوں کا مارا ہُوا دل ؛ وفود۔ جمع وفد کی ؛ یاس و تمنا۔ مایوسی اور خواہش ؛ رحمتِ حق۔ اللہ کی رحمتیں ؛ ندا۔ آواز ؛ ملائک۔ جمع مَلَک یعنی فرشتے ؛ جنود۔ جمع جُند یعنی لشکر۔ فوج ؛ درگہِ دارا۔ دارا کی دہلیز۔ مراد ہے بادشاہوں کی دہلیز ؛ بر سرِ تربت۔ قبر کے سرہانے پر ؛ زیارت گہہ۔ زیارت کی جگہ ؛ قیود۔ قید ؛ نشانِ کفِ پائے تو۔ تیرے پاؤں کے نشان ؛ سجدۂ صاحب نظراں۔ عقل مند اور بصیرت والے لوگوں کے سجدے کی جگہ۔ مراد ہے اہلِ نظر کے لیے قابلِ احترام

نظم کا تعارف اور اشعار کی تشریح

تعارف یہ نظم مولانا ظفر علی خاں کی ملی شاعری کی نہایت عمدہ مثال ہے جس میں انہوں نے سلطان ٹیپو، جو برِّ عظیم پاک و ہند میں انگریز سامراج کے خلاف تحریکِ حُریت کے اوّلین شہیدوں میں سے ایک ہیں، کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

شعر نمبر ۱:۔ اے سرنگاپٹم! اے گنجِ شہیدانِ کرام ۔ آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود

تشریح مولانا ظفر علی خاں سرنگاپٹم کی سرزمین سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تُو وہ خطہ زمین ہے جو نہایت ہی محترم و مکرّم شہیدوں کا خزانہ ہے یعنی تیری خاک میں نہایت نامور اور قابلِ عزت شہید دفن ہیں، اور ہندوستان میں جب اسلامی مملکت زوال پذیر تھی اور انگریزوں کا تسلّط قائم ہو رہا تھا۔ تو اُس وقت اے سرزمینِ سرنگاپٹم! تجھ سے ہی اسلام کی غیرت و حمیّت ظاہر ہوتی تھی اور اُس کڑے وقت بھی تیرے خطّے ہی اسلام کا بول بالا تھا۔

شعر نمبر ۲:۔ تیری آنکھوں میں ہے اپنوں کا عروج اور زوال
تو نے دیکھا ہے پرایوں کا ہبوط اور صعود

تشریح اے سرنگا پٹم! تو نے یہاں اپنی آنکھوں سے مسلمان قوم کے عروج و زوال کو بھی دیکھا ہے اور یہیں غیروں یعنی انگریزوں کی شکست اور پستی کے ساتھ ساتھ اُن کے عروج اور حکمرانی کا منظر بھی دیکھا ہے۔

شعر نمبر ۳:۔ کام میں لا نہ سکی تھی جسے خاکِ دہلی تیرے ذرّوں نے بچھا دی وہ مجازی بارود

تشریح اے سرنگا پٹم! دہلی جیسا بڑا شہر جس قومی عزت و حمیت کا مظاہرہ نہ کر سکا، تو نے چھوٹا ہونے کے باوجود اُس عزت و حمیت اور جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا۔ اور خاکِ دہلی کے برعکس تیرے ذرّے دشمن کے لیے بارود ثابت ہوئے۔

شعر نمبر ۴:۔ کشورِ ہند کا رنگ اور ہی ہوتا کچھ آج مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخِ کبود

تشریح آج ہندوستان کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا اگر یہ آسمان اور مقدر مکر و فریب کا جال نہ بچھاتے۔ یعنی اگر کچھ غدار اپنے وطنِ عزیز سے غدّاری نہ کرتے اور مقدر کی خرابی آڑے نہ آتی تو یقیناً آج ہندوستان میں مسلمانوں کا بول بالا ہوتا اور یہاں کا سیاسی ماحول آج سے بالکل مختلف ہوتا۔

شعر نمبر ۵:۔ سو رہا ہے تیرے پہلو میں وہ میسور کا شیر مایۂ ناز تھا ملّت کے لیے جس کا وجود

تشریح اے سرزمینِ سرنگا پٹم! تیری آغوش میں سلطان ٹیپو جیسا میسور کا وہ شیر سو رہا ہے جو اپنی قوم اور ملت کے لیے فخر و ناز کا سرمایہ تھا۔ یعنی سلطان ٹیپو جیسا بہادر اور صاحبِ کردار انسان تیری گود میں دفن ہے جس پر مسلمان قوم بجا طور پر ناز کرتی ہے۔

شعر نمبر ۶:۔ قوتِ بازوئے اسلام تھی اس کی صولت اس کی دولت کے دعا گوؤں میں شامل تھے ہنود

تشریح سلطان ٹیپو کا رعب و دبدبہ اور ہیبت اسلام کی قوت کا مظہر تھا۔ اور اُس کی ذات اس قدر قابلِ احترام تھی کہ میسور میں بسنے والی قومیں، یہاں تک کہ ہندو بھی اُس کی حکومت کے قائم و دائم رہنے کے لیے دُعا گو تھے۔ گویا میسور کی ساری رعایا سلطان ٹیپو سے خوش اور اس کی حکومت کے لیے دعائیں کرتی تھی۔

شعر نمبر ۷:۔ کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود

تشریح ٹیپو سلطان کے بدخواہ دشمن اور حاسد اُن کی جرأت و شجاعت سے کس قدر خوف زدہ رہتے تھے اس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی موت کے بعد بھی اِن بدخواہ حاسدوں کے جسم اِس خیال سے خوف سے کانپ رہے ہیں کہ کہیں یہ بہادر انسان اپنی قبر سے ہی زندہ اُٹھ کر نہ آجائے۔ یعنی سلطان ٹیپو کے خیال سے ہی یہ حاسد لوگ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔

شعر نمبر ۸ :- اس کے اُٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود

تشریح: اللہ کا یہ بہادر سپاہی اِس دنیا سے کیا اُٹھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا آغاز ہوگیا۔ اُس کے قیام اور قعود کس قیامت کے تھے یعنی اِس شخص کی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک وہ زندہ رہا اُس کا وجود مسلمانوں کی آزادی کی علامت بنا رہا اور جب وہ شہید ہوگیا مسلمانوں کے زوال اور غلامی کا آغاز ہوگیا۔

شعر نمبر ۹ :- آخری قول یہ اس کا نہ ہمیں بھولے گا جس سے قائم ہوئیں آئینِ حمیت کی حدود

تشریح: سلطان ٹیپو نے اپنی شہادت سے پہلے جو آخری بات کہی وہ ہمیں کبھی نہیں بھول سکتی کیونکہ اُس کے اس قول سے غیرت وحمیت کا ہمیشہ کے لیے ایک دستور قائم ہوگیا۔

شعر نمبر ۱۰ :- شیر اچھا ہے جسے مہلتِ یک روزہ ملی یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود

تشریح: سلطان ٹیپو کا شہادت سے قبل قول یہ تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ جیسی بزدلی کی سو سالہ زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔

شعر نمبر ۱۱ :- دلِ حسرت زدہ میرا بھی گیا ساتھ جب آج اس کے مرقد پہ گئے یاس و تمنا کے وفود

تشریح: آج جب اپنے حسرت زدہ دل کے ساتھ میں اِس غیرت مند سپاہی کے مزار پر حاضر ہُوا تو نہ جانے کتنی مایوسیوں اور تمناؤں کے وفد بھی میرے ہمراہ تھے یعنی سلطان ٹیپو کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے مایوسیوں اور خواہشوں کے ملے جلے جذبات میں گھرا ہُوا تھا۔

شعر نمبر ۱۲ :- پھر گئی آنکھوں میں فردوسِ بریں کی تصویر ظلِ ممدود میں تھا جلوۂ سدرِ مخضود

تشریح: ٹیپو سلطان کی سلطنت اور اس کے حسنِ انتظام کا خاکہ تخیل کی حد سے دیکھ کر آنکھوں میں بہشت کے سرسبز و شاداب درختوں کے ٹھنڈے سائے پھر گئے۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا سلطان کی سلطنت ہندوستان کے اُس زمانے کے خراب حالات میں ایسی ہی اچھی تھی جیسے آدمی حساب کتاب کے طویل عمل سے گزر کر بہشت میں داخل ہو جائے اور اس کے درختوں کی چھاؤں میں پناہ لے۔

شعر نمبر ۱۳ :- اس کی دہلیز سے لپٹی ہوئی تھی رحمتِ حق چومتے تھے جسے جھک جھک کے ملائک کے جنود

تشریح: مزار کی عمارت میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس شہید کے مزار کی دہلیز سے لپٹی ہیں اور فرشتوں کے لشکر نہایت ادب و احترام سے اسے چوم رہے ہیں۔ یعنی مزار کی عمارت میں جاکر اللہ کی رحمتوں کے

نزول کا احساس اور یقین دل میں بیٹھتا چلا جاتا ہے۔

شعر نمبر ۱۴ :۔ آئی گنبد سے ندا لے کہ تری پیشانی رات دن درگہ دارا پہ ہے وقفِ سجود

تشریح میں جب سلطان ٹیپو کے مزار پہ حاضر ہُوا تو مزار کے گنبد سے آواز آتی ہوئی محسوس ہوئی کہ تُو تو وہ شخص ہے جس نے دارا جیسے حاکموں کی دہلیز پر جھکانے کے لیے اپنی پیشانی وقف کر رکھی ہے یعنی گنبد سے مجھے خطاب کیا جارہا تھا کہ تو ایک ایسا شخص ہے جو صاحبِ اقتدار لوگوں کی خوشامد کرنے اور اُن کے سامنے سر جھکانے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔

شعر نمبر ۱۵ :۔ بر سرِ تربت من چوں گذری ہمت خواہ کہ زیارت گہہ رندان جہاں خواہد بود

تشریح یہ شعر حافظ شیرازی کا ہے جو مولانا ظفر علی خاں نے نہایت خوبصورتی سے اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے نظم میں کھپایا ہے۔ مولانا اسے ٹیپو سلطان کے مزار کے گنبد سے آنے والی آواز قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری قبر پر جب بھی تیرا آنا ہو تو تجھے چاہیے کہ تو ہمت اور حوصلے کا طلبگار ہو کیونکہ یہ دنیا کے رندوں کی زیارت گاہ بننے والی ہے یعنی آئندہ لوگ یہاں سے ہمت اور حوصلے کی تحریک پائیں گے اور اُن کے مزاج میں رندوں کی سی بے باکی اور حوصلہ مندی پیدا ہو جائے گی۔

شعر نمبر ۱۶ :۔ میں نے کی عرض کہ اے فطرتِ آزادی کی روح توڑنی جس نے سکھائی ہیں غلامی کی قیود

تشریح میں نے اِس صدا کے جواب میں سلطان ٹیپو کے حضور عرض کی کہ آپ تو آزادی کی فطرت کی روح ہیں یعنی آپ سے بہتر آزادی کا مفہوم کون جان سکتا ہے کیونکہ آپ نے ہی تو غلامی کی زنجیروں اور پابندیوں کو توڑنے کا سلیقہ اور شعور سکھایا ہے۔

شعر نمبر ۱۷ :۔ بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

تشریح یہ شعر بھی حافظ شیرازی کا ہے جس میں بیان کردہ مضمون کو مولانا ظفر علی خاں نے نہایت خوبصورتی سے روحِ ٹیپو سلطان سے خطاب کے لیے استعمال کیا ہے۔ شعر میں بیان کیا گیا ہے کہ جس زمین پر تمہارے پاؤں کے نشان تھے وہ سرزمین اور وہ نشانِ پا مدتوں صاحبِ نظر لوگوں کی سجدہ گاہ بنے رہیں گے یعنی اے سلطان ٹیپو! تو نے حریت پسندی اور شہادت کی جو مثال قائم کی تھی وہ آزادی پسند لوگوں کے لیے قابلِ تقلید رہے گی۔

تخت یا تختہ

حل لغات بھبکی — گھڑکی۔ دھمکی ؛ سودائے شہادت۔ شہید ہونے کا جنون اور خواہش ؛ ہیبت۔ ڈر۔ خوف ؛ سناں۔ بھالا۔ برچھی۔ مراد ہے جنگ کے ہتھیار ؛ کف۔ ہاتھ ؛ اجزا۔ جمع جزو ؛ قوام۔ چاشنی۔ یہاں مراد ہے بنیاد ؛ ورد ھا۔ بزرگی۔ عبادت ؛ لبِ بام۔ چھت کے کنارے ؛ آزاد منش۔ آزادی پسند۔ وہ جو آزاد رہنا چاہتے ہیں ؛ تخت۔ شاہی تخت مراد حکومت ؛ تختہ۔ موت کا تختہ یعنی موت۔

تشریح

نظم کا تعارف مولانا ظفر علی خاں کی زیرِ مطالعہ نظم "تخت یا تختہ" بھی اُن کی قومی شاعری سے متعلق ہے البتہ اس میں شاعر کا لہجہ کاٹ دار اور طنزیہ ہے مختلف مثالیں پیش کرنے کے بعد وہ آزادی پسند لوگوں کا مقام باوقار زندگی یا عزت کی موت قرار دیتے ہیں۔

شعر نمبر ۱:- ڈر جاتے ہیں ایک ہی بھبکی سے دیتے ہیں پیام آزادی کا
مر جاتے ہیں ایک ہی دھمکی میں اور لیتے ہیں نام آزادی کا

تشریح شاعر ہندوستان کے لوگوں کی دورنگی زندگی پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ لوگ آزادی کے پیامی بھی بنتے ہیں اور دوسری طرف ان کے حوصلوں کی پستی کا یہ حال ہے کہ حکمرانوں کی ایک ہی دھمکی اور گھرکی سے خوف زدہ بھی ہو جاتے ہیں۔ گویا آزادی کے طلبگار کبھی بھی ظلم سے نہیں گھبراتے مگر ہمارا یہ حال ہے کہ آزادی بھی چاہتے ہیں اور انگریزوں سے خوفزدہ بھی ہیں اور اُن کی گھرکیاں بھی برداشت کرتے ہیں۔

شعر نمبر ۲:- سودائے شہادت سر میں نہیں اللہ کی ہیبت دل میں نہیں
پھر کہتے ہیں قائم ہو نہ سکا دنیا میں نظام آزادی کا

تشریح برِّ عظیم کے مسلمانوں کی عجیب حالت ہے کہ آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے شہید ہونے کی لگن اور تڑپ ان کے دلوں میں موجود نہیں اور نہ ہی خوفِ خدا ان کے دلوں میں موجود ہے مگر پھر بھی انہیں گلا ہے کہ دنیا میں آزادی کا نظام قائم نہ ہو سکا۔ گویا آزادی کے لیے جن لوازمات یعنی آزادی کا جنون اور تڑپ کی ضرورت

ہوتی ہے وہ ان میں مفقود ہے مگر آزادی حاصل نہ ہونے کا بیکار شکوہ کیے جاتے ہیں۔

شعر نمبر ۳:- پہلو میں ہو دل، دل میں ہو یقیں، سر پر ہو کفن، کف میں ہو سناں
جب جمع یہ اجزاء ہوتے ہیں بنتا ہے قوام آزادی کا

تشریح: آزادی کے لیے جن عوامل اور محرکات کی ضرورت ہوتی ہے شاعر اُن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب کسی قوم کے افراد کے دلوں میں آزادی کی اہمیت اور احساس زندہ ہو جائے اور اُس میں آزادی حاصل کرنے کا عزم اور یقین پیدا ہو جائے تو وہ قوم اسے حاصل کرنے کے لیے ہتھیار سنبھال لیتی ہے اور اس کے ہر فرد کے سر پر کفن اُس کے پختہ عزم اور یقین کو ظاہر کرتا ہے تو پھر اُس قوم کی آزادی کا قوام تیار ہو جاتا ہے یعنی جب کوئی قوم آزادی کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر اس قوم کو غلام نہیں رکھا جا سکتا۔ آزادی اُس کا مقدر بن جاتی ہے۔

شعر نمبر ۴:- گاندھی کی نظر یثرب کی طرف اُٹھ جاتی تو خیر اک بات بھی تھی
یہ کیا ہے کہ سمجھے بیٹھے ہیں ورد دعا کو مقام آزادی کا

تشریح: اس شعر میں شاعر مسلمانوں کی بے عملی پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گاندھی جیسا شخص اگر مدینہ کی طرف رجوع کرتا یعنی ایک وہ شخص جو اسلام کی حقیقت سے واقف نہیں وہ اگر اسلام سے کوئی توقعات وابستہ کر لیتا تو دوسری بات تھی مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے زیور سے آراستہ لوگ بھی بے عملی کا شکار ہو کر محض بزرگی اور عبادات سے ہی آزادی کا قیام چاہتے ہیں یعنی آزادی کے لیے عملی جدوجہد کرنے کی بجائے ہم توکّل کا سہارا لیے بیٹھے ہیں کہ محض مسلمان ہونے اور بزرگی حاصل کرنے سے ہی اللہ ہمیں آزادی کی نعمت سے نواز دے گا۔

شعر نمبر ۵:- تاریخ وطن کی جانب سے پیغام کوئی انگریز کو دے
آئے گا تم بھی دیکھو گے سورج لب بام آزادی کا

تشریح: مولانا ظفر علی خاں مسلمانوں کی تساہل پسندی اور بے عملی کے باوجود بھی اُن سے مایوس نہیں کیونکہ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ہم زیادہ عرصہ تک غلام رہ ہی نہیں سکتے اسی لیے وہ انگریز حکمرانوں کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب وہ بھی اس وطن میں آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔ یعنی بہت جلد وطن کے لوگ آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے اور

یقیناً آزادی کی دولت حاصل کر کے رہیں گے۔

شعر نمبر ۶ :- دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تختہ جگہ آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا

تشریح مولانا نہایت دل نشیں پیرائے میں حریت پسندی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو لوگ اور قومیں آزاد رہنا چاہتی ہیں اِس دنیا میں اُن کے دو ہی ٹھکانے ہیں پہلا یہ کہ آزادی کی جنگ میں فتح و نصرت حاصل کر کے سرفراز ہوا جائے یا پھر آزادی کی جنگ لڑتے لڑتے انسان موت کے تختے پر پہنچ جائے۔ یعنی آزاد منش انسان یا تو آزادی کی زندگی گزارتے ہیں یا آزادی کے حصول میں جان کی بازی لگا کر سرخرو ہو جاتے ہیں۔

حسرت موہانی

سوانحی حالات فضل الحسن نام اور حسرت تخلص تھا۔ اردو ادب میں رئیس المتغزلین کے نام سے شہرت پائی۔ حسرت ۱۸۷۵ء میں اودھ کے مشہور قصبے موہان میں پیدا ہوئے۔ والدِ گرامی کا نام سید اظہر حسن تھا۔ حسرت کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی ابن موسیٰ رضا سے ملتا ہے اُن کے جدِ امجد ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور موہان میں سکونت پذیر ہوئے۔ حسرت نے ابتدائی تعلیم اسی قصبے میں حاصل کی ۱۸۹۴ء میں اردو مڈل پاس کرنے کے بعد قریبی قصبے فتح پور کے ہائی سکول میں داخل ہو گئے ۱۸۹۹ء میں انٹرنس کرنے کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۰۳ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ سید سجاد حیدر یلدرم اور مولانا شوکت علی حسرت کے ساتھیوں میں سے تھے۔ حسرت کو زمانۂ طالب علمی میں ہی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ لہٰذا تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔ یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں ہی علی گڑھ سے اردوئے معلیٰ کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا۔ اساتذہ قدیم کے دواوین کا گہرا مطالعہ کیا اُن کے انتخاب شائع کئے اور ادبی تنقید لکھی۔ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ انہوں نے ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا اور پہلی دفعہ ۱۹۰۸ء میں قیدِ بامشقت کی سزا پائی اور حکومتِ وقت نے انہیں باغی قرار دے دیا۔ قید و بند کے مصائب کا ذکر اُن کی غزلیات میں بھی نمایاں ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مگر یہ صعوبتیں حسرت کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکیں اور حسرت نے ساری عمر انگریز

حکومت کی ملازمت نہ کی بلکہ ایک معمولی پریس کے ذریعے اپنی صحافتی دنیا آباد رکھی، حسرت نے زندگی بھر کسی امیر اور نواب کا قصیدہ نہ لکھا بلکہ ایک غیور اور قناعت پسند انسان کی طرح کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کو انسانیت کی تذلیل خیال کیا۔ حسرت نے اگرچہ اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کانگریس کے پلیٹ فارم سے کیا مگر جلد ہی ہندو ذہنیت کا پول کھلنے پر وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے لئے اُن کی گرانقدر خدمات سنہری حروف میں لکھے جانے والے قابل ہیں مگر افسوس تحریکِ آزادی کے اِس بے باک اور نامور سپاہی کو آزادی کے بعد پاکستان کی آزاد فضاؤں میں سانس لینا نصیب نہ ہوا اور وہ ہندوستانی مسلمانوں کی بہبود کے خیال سے دہلی ہی میں مقیم رہے اور ۷۵ برس کی عمر میں ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

محاسنِ کلام

حسرت کا رنگِ تغزل اردو غزل میں جدید اندازِ تغزل کا سہرا یقیناً رئیس المتغزلین حسرت موہانی کے سر ہے۔ قدیم روایت کے تابع غزل کو حسرت نے نیا تاثر اور نیا شعور عطا کیا اور اردو شاعری میں پہلی بار سیاست کو واضح طور پر غزل کی مستقل روایت میں شامل کیا۔ حسرت نے غزل کو خیال آفرینی، جدت طرازی، رنگینی، رعنائی اور شگفتگی کی نئی لے عطا کر کے جدید غزل کا احیاء کیا۔ حسرت کے رنگِ تغزل کی فسوں کاری جدید اردو غزل کا پہلا سنگِ میل ہے۔

۱۔ دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا ۔۔۔ وہ وضعِ پارسا اُس کی وہ عشقِ پاکباز اس کا
۲۔ وصل کی بنتی ہیں اِن باتوں سے تدبیریں کہیں ۔۔۔ آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں!
۳۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت ۔۔۔ اُن سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنا کرنا

تقلیدِ اساتذہ حسرت سمجھتے تھے کہ اساتذہ کے کلام کے مطالعے اور تقلید سے ہی ذوقِ شعری کا صحیح شعور پیدا ہو سکتا ہے اُن کی غزل کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو اُس میں مومن، نسیم اور تسلیم لکھنوی کا رنگِ سخن جھلکتا ہے وہ خود کہتے ہیں:۔

۔ غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن ۔۔۔ طبع حسرت نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اگرچہ آخری عمر کی غزلوں میں حسرت کا اپنا ایک مخصوص رنگ پیدا ہو گیا تھا مگر پھر بھی حسرت کی غزل کا نگارخانہ انفرادی اور روایتی شعور کے حسین امتزاج کا نمونہ ہے۔

۱۔ کہنے کو تو میں بھول گیا ہوں مگر اے یار ۔۔۔ ہے خانۂ دل میں تری تصویر ابھی تک
۲۔ بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں ۔۔۔ الہیٰ ترکِ اُلفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں
۳۔ حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا ۔۔۔ کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

عشق کی رنگین بیان

حسرت کی غزل حسن و عشق کی رنگینیوں کی دلنواز قوسِ قزح کا منظر پیش کرتی ہے وہ شباب کے جذبات کی ترجمانی میں منفرد ہیں۔ یہی رنگینی اور جذبات اُن کی غزل کو کیف و سرور کی اچھوتی کیفیت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ البتہ اُن کے ہاں ہوسناکی نہیں بلکہ احترام حسن و عشق ہے۔ عجز و تسلیم کا دلفریب انداز ہے۔ اُن کی غزل سے یوں لگتا ہے گویا شاعر کا دل جذبۂ الفت سے سرشار ہے۔

۱ سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم! — ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
۲ حسن سے اپنے وہ غافل تھا ہیں اپنے عشق کے لئے — اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
۳ رونقِ پیراہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنین — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

سوز و گداز کا منفرد انداز

حسرت کی شاعری میں انفرادی اور اجتماعی غم پوری صداقت، توانائی اور سادگی سے کچھ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اُن کی شاعری فلسفیانہ فکر کی گہرائیوں سے محروم ہونے کے باوجود اپنے سوز و گداز کے منفرد انداز کی وجہ سے قاری کے قلب و نظر میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ حسرت کی غزل کی دلآویزی غم کی سنجیدگی اور سوز و گداز کی دردمند حلاوت کا نتیجہ ہے۔

۱ اثر ایسا کہاں سے لاؤں یارب نالۂ دل میں — جو اُس بے مہر کو بھی رازِ غم سے آشنا کر دے
۲ ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے عشق — پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم
۳ مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو — لوگ میرے لئے دعا نہ کریں
۴ ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے — محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

معاملاتِ عشق و محبت

فراق گورکھپوری کے بقول "حسرت کی عشقیہ شاعری اگر ہمارے کلیجے کا ٹکڑا نہیں تو پھر بھی کلیجے سے لگا رکھنے کی چیز ضرور ہے"

حسرت کی غزل میں معاملاتِ عشق جس سادگی، خلوص اور سچائی سے بیان ہوئے ہیں وہ ہماری روزمرہ زندگی کے جیتے جاگتے نمونے ہیں۔

۱ نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
۲ تیری یاد بے اختیار آ رہی ہے — تمنا کی فصلِ بہار آ رہی ہے!
۳ ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا — آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جائیے
۴ میں بے خبر تھا مگر وہ دمِ رخصت — دیکھا کئے مڑ مڑ کے مجھے حدِ نظر تک

معاملہ بندی

معاملہ بندی میں حسرت نے شعوری طور پر جراُت کی تقلید کی ہے البتہ اُن کے اشعار میں جراُت کے برعکس ایک اعتدال اور توازن کی کیفیت موجود تھی۔ عام لکھنوی

شعراء کی فحش نگاری سے اجتناب کرتے ہوئے انہوں نے آداب کا خیال رکھا اور مہذب انداز اختیار کیا ہے۔

ہم نہ کہتے تھے بناوٹ ہے یہ سارا غصہ	ہنس کے لو پھر وہ انہوں نے ہمیں دیکھا دیکھو
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن	آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے!
تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال	دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

حسرت کی مسلسل غزلیں حسرت کی کئی غزلیں مسلسل ہیں جو اپنے خیال کی وحدت اور جذبوں کی سچائی کی مظہر ہونے کے ناطے بہت مقبول ہوئیں۔ خاص طور پر وہ غزلیں جو اُن کی جوانی کے دور سے تعلق رکھتی ہیں اور جن میں محبت کے امور کا تذکرہ اور ہجر و وصال کی کیفیات کا درد انگیز بیان ہے مثلاً اُن کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱ چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے	ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
۲ باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق	تجھ سے وہ پہلے پہل دل کو لگانا یاد ہے
۳ تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا	اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
۴ کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً	اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
۵ چوری چوری ہم سے تم آکے ملے تھے جس جگہ	مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

غزل نمبر ۱

حلِ لغات خود بیں ــــ مغرور۔ متکبر۔ خود آرا۔ اپنے آپ کو بنانے سنوارنے والا۔ خود نمائی کا عادی۔ اظہارِ تمنا۔ خواہش کا اظہار۔ بیتا بیاں۔ بے قراریاں۔ شکیبا۔ صبر و قرار والا۔ اضطرابِ شوق۔ عشق کی بے چینی۔ حشر برپا کرنا۔ فساد اٹھانا۔ اودھم مچانا۔ سرگرمِ نیاز۔ عاجزی کا مظاہرہ کرنے میں مصروف۔ آشنائے نازِ بے جا۔ بے جا ناز و ادا کا عادی۔ خواہ مخواہ ادائیں دکھانے کا شوقین۔ نگاہِ ناز۔ ناز و ادا والی نظر۔ سحر۔ جادو۔ مہر۔ سورج۔ منور۔ روشن۔ لطفِ یار۔ دوست کی مہربانی۔ وجہِ سکون۔ اطمینان اور سکون کا سبب۔ دونا۔ دگنا

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱:۔ حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا کیا کیا مَیں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا

تشریح: وہ محبوب جو اپنے حسن و جمال کی طرف سے بے نیاز اور بے پروا تھا اور اُسے اپنے حسن کی اثر پذیری کا احساس تک نہ تھا افسوس ہماری حماقت اور غلطی کی وجہ سے بدل گیا ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے اس کے سامنے اظہارِ عشق کر کے اُس کے حسن و جمال کی تعریف کر دی اور ہماری اسی غلطی کی وجہ سے نہ صرف محبوب نے خود کو بنانا سنوارنا شروع کر دیا بلکہ بے جا غرور و تکبّر بھی اس میں پیدا ہو گیا اب وہ اپنے حسن و جمال پر ناز و غرور بھی کرتا ہے اور اپنے حسن میں اضافے کے لیے بھی فکر مند رہتا ہے۔ اسی آرائشِ جمال کی ہوش کو حضرتِ غالب اس طرح بیان کرتے ہیں۔

؎ آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ ہر دم نقاب میں

شعر نمبر ۲:۔ بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

تشریح: اے دوست! عالمِ فراق میں ہم جس بے چینی و بے قراری کی کیفیت سے دوچار تھے اس میں ہر گھڑی تجھ سے قرب کی شدید خواہش بھی ہمارے اضطراب کا ایک سبب تھی۔ پھر خدا خدا کر کے ہماری مرادیں بر آئیں اور تجھ سے ملاقات کی خواہش پوری ہوئی مگر حیرت اس بات پر ہے کہ تجھ سے مل کر بھی ہماری بے چینی اور بے تابی میں کمی واقع نہ ہوئی بلکہ یہ بے تابیاں کچھ اور بڑھ گئیں ورنہ ہمارا خیال تو یہ تھا کہ وصلِ یار کے بعد یقیناً ہمارے دل کو چین اور صبر و قرار حاصل ہو جائے گا مگر افسوس ہمارا اندازہ غلط ثابت ہُوا اور ملاقات کے بعد اب ہماری بے تابیاں کہیں زیادہ ہو چکی ہیں۔

شعر نمبر ۳:۔ پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا

تشریح: حسرتؔ محبوب کا خط پانے کے بعد اپنی جذباتی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے دوست! ایک مدت تک تو ہمیں یہ انتظار اور اشتیاق رہا کہ تیرے خط میں تیرے حالِ دل کا بیان پڑھیں اور اب جب تمہارا خط آیا تو اُسے پڑھ کر ہمارے دل کی جو حالت ہوئی وہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔ جذبۂ عشق کی بے چینی و بے قراری نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور خط پڑھنے کے بعد ہم جس اذیّت اور عذاب میں مبتلا ہیں وہ بیان سے باہر ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ محبوب نے بھی جدائی کے اِس

زمانے کو بہت محسوس کیا ہے اور اس کے دل پر جو گذر رہی ہے اُس کی تفصیل خط میں بیان کی ہے ظاہر ہے یہ باتیں عاشق کا صبر و قرار چھیننے کے لیے کافی ہیں۔

شعر نمبر ۴ :- ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز
تجھ کو آخر آشنائے ناز بیجا کر دیا

تشریح: اے دوست! ہم جب بھی تیری محفل میں حاضر ہوئے تو تیرے حضور نہایت ہی عاجزی، انکساری اور نیاز مندی ہمارا اشعار رہا جس کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ تم اپنے حسن و جمال پر بے حد ناز اور غرور کرنے لگے اور تمہارے طرزِ عمل میں غرور اور تکبر نمایاں ہوتا گیا۔ گویا ہماری نیازمندی نے تجھ پر الٹا اثر کیا اور تمہارے دل میں ہمارے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہونے کی بجائے ہمارے لیے غیریت اور اجنبیت بڑھتی گئی اور اب تمہارا خود پر بے جا ناز کرنے کا یہ عالم ہے کہ تو ہمیں خاطر میں ہی نہیں لاتا۔

شعر نمبر ۵ :- اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اُس نگاہ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

تشریح: جب سے اُس حسن و جمال کے پیکر سے ملاقات ہوئی ہے اور اُس کی مدھ بھری نگاہوں کا سامنا ہُوا ہے نہ جانے اُن نگاہوں میں ناز و ادا کا کیا جادو تھا جو ہمارے دل و دماغ پر کچھ ایسا چھایا کہ اب ہمیں اپنے دل پر قابو نہیں رہا، دل ہے کہ کسی پل چین نہیں پاتا اور اس کی بے تابی اور بے قراری کا یہ عالم ہے کہ کچھ سوجھتا نہیں۔ یوں لگتا ہے اس کی نگاہِ ناز کا جادو ہمیں کہیں کا نہ چھوڑے گا۔

شعر نمبر ۶ :- عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

تشریح: اے محبوب! تیرے عشق نے چاہنے والوں کو کیا کیا مقاماتِ بلند عطا کیے ہیں وہ جو ذرّوں کی طرح حقیر اور کم مایہ تھے انہیں تیرے عشق نے سورج کی طرح روشن اور دنیا کی توجّہ کا مرکز بنا دیا اور وہ جن کی حیثیت ایک قطرے سے زیادہ نہ تھی وہ بھی عشق کی بدولت سمندر کی مانند لامحدود اور ناپیدا کنار بن گئے۔ عشق دراصل انسان کے اپنے نصب العین سے لگاؤ کا نام ہے ظاہر ہے اگر نصب العین عظیم اور لاثانی ہو گا تو عشق بھی بے مثال بن کر دنیا کی توجہ کا مرکز بن جائے گا۔

شعر نمبر ۷ :- کیوں نہ ہوں تیری محبت سے منوّر جان و مال

شمع جب روشن ہوئی گھر میں اُجالا کر دیا

تشریح اِس شعر میں حسرتؔ نے شمع کی مناسبت سے روشن، اجالا اور منوّر کے لفظ استعمال کر کے صنعتِ مراعات النظیر کا استعمال کیا ہے اور اِسے عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں حوالوں کا شعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ حسرتؔ کہتے ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ! جو کوئی بھی تیری ذات کو اپنی محبت اور سوچوں کا محور و مرکز بنا لیتا ہے تو اُس کے جان و دل تیری محبت کے نور سے جگمگا اُٹھتے ہیں کیونکہ جب شمع روشن ہوتی ہے تو سارے گھر میں اُجالا ہونا لازمی ہے اُسی طرح جس کسی کے دل میں تیری محبت کی شمع روشن ہو جائے اُس کے جان و دل کا منور ہو جانا بھی لازمی امر ہے۔

شعر نمبر ۸ :- تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارا کر دیا

تشریح حسرتؔ شکایت کے انداز میں محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے محبوب! ہم اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیری محفل میں جا بیٹھے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ اِس طرح ہمیں نہ صرف تیرا رخِ روشن دیکھنا نصیب ہوگا بلکہ شاید ہم تجھ سے اپنا حالِ دل بھی کہہ سکیں۔ تیری محفل میں رقیب سمیت کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہمیں ذلیل و رسوا کر کے نکالنے کی جرأت کرتا مگر اِس کے باوجود رقیب کے کہنے پر ہمیں تیری محفل سے اُٹھنا پڑا کیونکہ ہمیں وہاں سے اُٹھانے کے رقیب کو اشارا تم ہی نے کیا تھا اور یہ اشارا کرتے ہوئے ہم نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب تُو ہی اپنی محفل میں ہمارا وجود برداشت نہیں کرتا تو پھر ہمارا وہاں سے اُٹھ آنا ہی بہتر تھا۔ غالبؔ نے یہی مفہوم قدرے مختلف انداز میں یوں بیان کیا ہے

؎ میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں

شعر نمبر ۹ :- سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرتؔ اور دونا کر دیا

تشریح غزل کے مقطع میں حسرتؔ دوسروں کے برعکس اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے حسرتؔ! یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اگر عاشق کو محبوب کا لطف و کرم حاصل ہو تو یہ اُس کے دل کے سکون اور راحت کے لیے کافی ہے، یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ہمارا تجربہ اس سے بالکل مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ ہمیں محبوب کا التفات اور لطف و کرم حاصل رہا مگر یہ سب کچھ سکون اور راحت کا سبب بننے کی بجائے ہمارا دردِ دل تو پہلے سے بھی دوگنا ہو گیا اور ہمارا اضطراب پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات عہدِ کرم —— معاف کرنے کا وعدہ ؛ نا آشنا - اجنبی - غیر ؛ عذرِ جرم - غلطی کا جواز ؛ التفات - توجہ - مہربانی ؛ کج ادا - بے رُخی سے پیش آنے والا ؛ خاطرِ محروم - محروم دل ؛ محوِ الم - دکھ اور تکلیف میں مبتلا ؛ درپے ہونا - سر ہونا ؛ ایذائے جاں - جان کی تکلیف - مراد ہے زندگی کے مصائب ؛ ازراہِ ستم - ستم ڈھانے کے ارادے سے ؛ محوِ تماشا - دیکھنے میں مصروف ؛ تحریرِ ندامت شرمندگی کی تحریر مراد ہے معذرت نامہ ؛ تغافل آشنا - جان بوجھ کر نظر انداز کرنے والا ؛ بزمِ غیر - رقیب کی محفل ؛ وفائے بے اثر - اثر انداز نہ ہونے والی وفائیں ؛ پُر جفا - ظلم و ستم کرنے والا ؛ تغافل کیش - جس کا طریقہ نظر انداز کرنے کا ہو ؛ یادِ روزگارِ عاشقی - عاشقی کے زمانے کی یاد ؛ آرزوئے شوق - عشق کی خواہش ؛ نا آشنا - ناواقف ؛ کاوش - کوشش ؛ مائلِ آرام - آرام اور تندرستی کی طرف رجوع کرنا ؛ مشتاقِ شفا - صحت یاب ہونے کا شوق رکھنے والا ؛ ارماں - خواہش ؛ بے نیازِ مدعا - مقصد اور خواہش سے بے پروا ؛ ستم پرور - ستم پالنے والا مراد محبوب ؛ بیگانۂ عہدِ وفا - وفا کرنے کے وعدے سے لاتعلق ؛ سراپا ناز - جو مکمل طور پر ناز و ادا والا ہو -

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱ :- توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے   بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

تشریح حضرت مولانا حسرت کے اندازِ تغزل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اُن کی کئی غزلیں مسلسل اور قطعہ بند ہیں زیرِ مطالعہ غزل بھی قطعہ بند ہے اور اس کے سارے اشعار میں مضمون کا تسلسل قائم ہے -

غزل کے اس مطلع میں حسرت محبوب سے کہتے ہیں کہ آپ کو اختیار ہے کہ مہر و وفا اور خلوص کا وعدہ توڑ کر ہم سے اجنبیوں اور غیروں والا رویہ اپنا لیں ، بندہ پرور! اگر آپ نے ناراض ہونے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو بھی ہمیں آپ سے کوئی گلہ نہیں - ہم آپ کی ناراضگی اور خفگی بھی برداشت کر لیں گے -

شعر نمبر ۲ :- میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجئے التفات   بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

تشریح اے دوست ! آپ نے ہمارے جس جرم کی پاداش میں ترکِ تعلق کی ٹھان لی ہے آپ کو اختیار ہے کہ اس جرم کے سلسلے میں ہمارا جواز بھی نہ سنیں اور ہماری

معذرت بھی قبول نہ کریں اور اب تک جو تلخی اور سختی کا رویہ اپنا رکھا ہے اگر ممکن ہو تو اس میں اور بھی شدت پیدا کرلیں اور ہمارے ساتھ کج ادائی اور بے رخی کا انداز اختیار کرلیں کیونکہ ہمیں اپنی غلطی کا بھی اعتراف ہے اور اب ہم ہر سزا برداشت کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔

شعر نمبر ۳ :۔ خاطر محروم کو کر دیجیے محوِ الم   درپے ایذائے جان مبتلا ہو جائیے

تشریح: اے محبوب! ہمارا دل تو پہلے ہی محرومیوں کا شکار ہے اور اب تم اپنی کج ادائی سے ہمارے اِس غم زدہ دل کو اور بھی رنج و الم میں مبتلا کرنا چاہو تو کردو۔ اور پھر ہماری جانِ ناتواں پہلے ہی ایک اذیت اور عذاب میں مبتلا ہے۔ ہماری اِس غلطی کے بعد تمہیں حق حاصل ہے کہ ہماری جان کے اس عذاب کو اور بھی تکلیف دہ اور اذیت ناک بنا دو۔

شعر نمبر ۴ :۔ راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم   ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جائیے

تشریح: حسرت محبوب کی اس ناراضگی کے بعد سرِ راہ ملاقات کا منظر کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب تم راہ میں ملتے ہو تو ماضی کے برعکس ہمارے دل پر ستم ڈھانے کے لیے اپنے ہونٹوں کو غصے میں اپنے دانتوں سے کاٹتے ہوئے فوراً ہی بے رخی سے اپنی راہ لیتے ہو گیا ہماری ایک غلطی نے تمہارے دل میں ہمارے لیے ذرا رحم اور مروت بھی نہیں چھوڑے۔

شعر نمبر ۵ :۔ گر نگاہِ شوق کو محوِ تماشا دیکھیے   قہر کی نظروں سے مصروفِ سزا ہو جائیے

تشریح: اب اگر ہم تمہیں شوق بھری نظروں سے بھی دیکھتے ہیں تو ماضی کی طرح شرما جانے کی ادا دکھانے کی بجائے تم ہمیں نہایت غصے اور قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہو گویا ہر اعتبار سے ہمیں سزا دینے پر تلے ہوئے ہو۔

شعر نمبر ۶ :۔ میری تحریر ندامت کا نہ دیجیے کچھ جواب   دیکھ لیجیے اور تغافل آشنا ہو جائیے

تشریح: اے دوست! ہم نے اپنی خطا کی معذرت کرنے کے لیے تم کو جو ندامت و شرمندگی کا خط لکھا تھا تمہیں اختیار ہے کہ اُس کا جواب نہ دو۔ ہاں البتہ تم نے اُسے پڑھا اور پھر بے اعتنائی اور بے رخی سے اُسے ایک طرف رکھ کر اپنے اجنبیت اور غیریت کے طرزِ عمل کو جاری رکھا۔ شاعر کو افسوس اس بات کا ہے کہ اُس کے اعترافِ جرم اور اظہارِ ندامت کرنے کے بعد بھی محبوب اُسے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں اور اس سے سنگ دلی اور بے رخی کا سلوک کر رہا ہے۔

شعر نمبر ۷ :۔ مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجیے گالیاں   اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

تشریح شاعر محبوب کے دوہرے کردار کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے دوست! تم جب تنہائی میں ملتے ہو تو مجھ سے اِس حد تک بُرا سلوک کرتے ہو کہ گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکتے مگر حیرت ہے جب رقیب کی محفل میں جاتے ہو تو شرم و حیا کا پیکر بن جاتے ہو اور ہر کوئی تمہاری شرم و حیا کا معترف ہوتا ہے۔ گویا ہم تنہائی میں گالیوں کے مستحق ہیں اور غیروں کی محفل میں تم پیکرِ حیا کہلانے کے حق دار ہو۔

شعر نمبر ۸:- ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جائیے

تشریح عشق میں ایک عاشقِ صادق ہمیشہ محبوب کی بے رخی کا سبب اپنے جذبے کی نارسائی خیال کرتا ہے۔ یہاں بھی حسرتؔ محبوب سے مخاطب ہیں کہ میری وہ وفائیں، جو تمہارے دل پر میرے جذبۂ عشق کی صداقت کے اثرات مرتب نہیں کر سکیں اُن کی سزا یہی ہے کہ آپ مجھ پر پہلے سے بھی بڑھ کر ظلم و ستم کیجئے، جفاؤں کے تیر آزمائیے تاکہ میری وفاؤں کو اپنی بے اثری اور نارسائی کی سزا مل سکے۔

شعر نمبر ۹ تا ۱۴:- جی میں آتا ہے کہ اُس شوخِ تغافل کیش سے

اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال — آرزوئے شوق سے ناآشنا ہو جائیے

کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر — مائلِ آلام و مشتاقِ شفا ہو جائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں — یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

بھول کر بھی اُس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد — اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر — اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

تشریح اِس شعر سے آخری شعر تک تمام اشعار باہم مربوط ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے دل میں اکثر یہ بات آتی ہے کہ میں اُس بھول جانے والے محبوب سے ملنا جلنا ترک کردوں۔ اُس کی طرح میں بھی بے وفا ہو جاؤں۔ اپنے دل سے اُس زمانے کی یاد محو کردوں جب میں اُس سے عشق کرتا تھا۔ اور اُس کے حصول کی آرزو دل سے نکال دوں۔ محبوب نے مجھے جو تکالیف دی ہیں اور اُن تکالیف میں مجھے جو لذت محسوس ہوئی ہے۔ اُن کو بھول جاؤں اور عشق کی بیماری سے مکمل طور پر شفایاب ہو کر آرام کروں۔ دل سے محبوب کے حصول کی تمام خواہشات نکال دوں۔ یہاں تک کہ عشق کو بالکل ترک کردوں پھر یہ کیفیت بھی ہو جائے کہ اُس ظالم محبوب کی یاد بھی دل میں نہ آئے۔

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ افسوس تو اِس بات کا ہے کہ محبوب کو فراموش کرنا اور اس کی خواہش کو دل سے نکال دینا صرف سوچ کی حد تک محدود رہتا ہے۔ میں اس پر کبھی

عمل نہیں کر سکتا کیونکہ میں محبوب کا ذکر آتے ہی بے اختیار ہو جاتا ہوں۔ اور دوبارہ اس کے حاصل کرنے کی تمنا اپنے دل میں پال لیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس سراپا ناز محبوب سے کبھی خفا نہیں ہو سکتا۔

فانی بدایونی (۱۸۷۹ تا ۱۹۴۱ء)

غزل

حل لغات ہستی ـــ یہ لفظ مطلع میں دو مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ۱۔ زندگی ۲۔ حیثیت، اوقات ـ وحشتِ دل ـ دل کی دیوانگی اور وحشی پن ـ ہوش پرستی ـ عقل کو پوجنا ـ جگ ـ دنیا ـ سونا ـ ویران ـ سنسان ـ سہل ـ آسان ـ کال ـ قحط ـ

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱:- دنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

تشریح شاعر اپنی خودداری کی خاطر کسی بھی صورت میں کسی کا احسان مند ہونے کے لیئے تیار نہیں اور کہتا ہے کہ میں دنیا کو کب خاطر میں لاتا ہوں۔ میری بلا سے دنیا کا عیش و عشرت حاصل کرنا آسان ہو یا مشکل، یہ سستی ہو یا مہنگی، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، میں تو کسی کا کوئی بھی احسان برداشت کرنے کے لیئے تیار نہیں یہاں تک کہ اگر موت بھی مجھے مفت ملے تو میں نہ لوں پھر بھلا اس زندگی کی میرے سامنے کیا حیثیت ہے۔ مراد ہے زندگی کی سختیوں اور تلخیوں کو برداشت کرلیں گے مگر موت کے لیئے بھی کسی کا احسان نہیں اٹھائیں گے زندگی کی خواہش کرنا تو ہمارے لیئے ناممکن ہے۔

شعر نمبر ۲:- آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے

تشریح ہم نے دنیا والوں کو شاد و آباد رنگ رلیاں مناتے بھی دیکھا ہے اور دنیا کے اجڑنے اور ویران ہونے کے منظر بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ پھر دنیا اور دنیا والوں کی بات کیوں کریں۔ ہمارا تو اپنا دل ایک عجیب و غریب

اور انوکھی بستی ہے جو ایک دفعہ کیا اجڑی کہ پھر آباد ہونا گویا اس کی قسمت میں ہی نہیں تھا۔ گویا اہلِ دنیا کی خوشیاں اور غم آتے جاتے رہتے ہیں مگر ایک عاشق کا دل اجڑنے کے بعد کبھی بھی خوشی سے ہمکنار ہوتے نہیں دیکھا۔

شعر نمبر ۳:- جاں سی شے بک جاتی ہے، ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی، ان داموں میں سستی ہے

تشریح: انسان بھی اللہ کی عجیب مخلوق ہے کہ کسی محبوب صفت ہستی کی محض ایک نظرِ التفات کے بدلے اپنا جان و دل دے دیتا ہے مگر پھر بھی سودا سستا سمجھتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ خریدنے والا گاہک یعنی محبوب جان و دل کا یہ نذرانہ قبول کرے یا نہ کرے یہ اُس کی مرضی ہے یعنی عاشق تو محض محبوب کی ایک نگاہ ناز کے بدلے زندگی اُس کے نام کر دیتا ہے اور پھر بھی اس سودے کو بہت سستا اور حسب منشا خیال کرتا ہے۔ بقول اختر شیرانی:-

ع ایمان و جاں نثار، تری اک نگاہ پر
تو جانِ آرزو ہے تو ایمانِ آرزو

شعر نمبر ۴:- وحشت دل سے پھرنا ہے، اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں، یہ تو ہوش پرستی ہے

تشریح: عشق میں جب عاشق کی سوچوں کا محور و مرکز محبوب کی ذات بن جاتی ہے اور اُس کے سوا انسان کو اور کچھ نہیں سوجھتا تو اہلِ دنیا اِسے دیوانگی اور وحشت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر اوّل تو عشق کی اِس وحشت اور دیوانگی سے منحرف ہونا ممکن ہی نہیں اور اگر کوئی انحراف کرتا بھی ہے تو گویا وہ نصب العین اور خدا سے انحراف کرتا ہے اور ایسے شخص سے شاعر کہتا ہے کہ اے نادان! یہ انحراف کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو سراسر دنیا داری ہے۔ یعنی عشق کے اعلیٰ مقاصد سے انحراف کوئی دنیادار اور اہلِ ہوس و زر ہی کر سکتا ہے یہ کسی عاشق کا کام نہیں۔

شعر نمبر ۵:- جگ سونا ہے تیرے بغیر، آنکھوں کا کیا حال ہُوا
جب بھی دنیا بستی تھی، اب بھی دنیا بستی ہے

تشریح: عشق میں ایک مقامِ بلند یہ بھی آتا ہے کہ عاشق ہر لحہ محبوب کے جلووں کو اپنے دامنِ دل میں سمیٹنے کا خواہش مند ہوتا ہے اس کے برعکس اگر فراقِ یار ہو تو اُس کے دل پر جو قیامت گذرتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے فانی کہتے ہیں کہ اے دوست! جب سے تُو جدا ہوا ہے ہماری آنکھیں ہیں کہ ہر گھڑی تجھے ڈھونڈ رہی

ہیں اور تیرے بغیر ہمیں دنیا اجڑی ہوئی اور ویران نظر آتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کی رنگینیاں اور رعنائیاں پہلے کی طرح اب بھی قائم ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ ہمیں ساری دنیا اجڑی ہوئی ویران اور سنسان نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے انسان کی خوشیوں اور غموں کا منبع انسان کا دل ہوتا ہے اور اگر دل اداس ہو تو ساری دنیا اداس نظر آتی ہے بقول ناصر کاظمی

دل تو میرا اُداس ہے ناصر — شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

شعر نمبر ۶:۔ آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

تشریح شاعر جدائی کے دنوں کی حالت بیان کرتا ہے کہ فراقِ محبوب میں ہم اتنا روئے کہ آخر ہماری آنکھوں کے چشمے بھی خشک ہو گئے مگر دل ہے کہ اب بھی تسکین نہیں پاتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے دل پر غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے مگر اس کا عالم یہ ہے کہ برسنے کی شدید خواہش کے باوجود یہ گھٹا نہ کھل کر برستی ہے اور نہ ہی چھٹتی ہے۔ گویا شاعر شدتِ غم کی جس کیفیت سے دوچار ہے اُس کا اظہار مشکل پاتا ہے

شعر نمبر ۷:۔ دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

تشریح شاعر محبوب سے مخاطب ہے کہ اے ظالم! تیرے ظلم و ستم کے نتیجے میں ہمارا دل اجڑ گیا۔ مگر تجھے اِس کا احساس تک نہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ مجھ جیسے حساس انسان کے دل کی بستی تجھ جیسے سنگ دل محبوب کے ظلم و ستم سے اجڑ تو فوراً ہی جاتی ہے مگر اِس کا بسنا کوئی آسان کام نہیں، کیونکہ شہروں اور بستیوں کا آباد ہونا کوئی کھیل نہیں، انہیں بسنے کے لیئے ایک عمر چاہیئے تب کہیں جا کر زندگی کی سرگرمیوں سے بھرپور شہر اور بستیاں آباد ہوتی ہیں جبکہ انہیں تباہ و برباد کرنے کے لیئے ایک ہی طوفان یا حادثہ کافی ہوتا ہے اور یہی حال تو نے ہمارے دل کی بستی کو برباد کر کے کیا ہے۔

شعر نمبر ۸:۔ فانی جس میں آنسو کیا تھا، دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی، دو بوندوں کو ترستی ہے

تشریح فانی عشق میں اپنی آنکھوں کے برستے چشمے خشک ہو جانے کا نوحہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری آنکھیں فراقِ دوست میں کیسے کیسے برستی تھیں اور کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا تھا جب اِن کے بہاؤ میں کمی ہوئی ہو۔ پھر جب آنسو ختم ہو گئے تو دل کے لہو نے یہ کمی پوری کر دی گویا میر کے لفظوں میں یہ وہ زمانہ

تھا جب۔

ـــہ اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا ۔۔۔ لوہو آتا ہے جب نہیں آتا

مگر افسوس! اب کیا زمانہ آگیا کہ ہماری ہمیشہ آنسو اور خون برسانے والی آنکھیں اب پانی کی دو بوندوں کو ترس رہی ہیں یعنی شدتِ غم کا یہ عالم ہے کہ اب آنکھوں سے چاہنے کے باوجود آنسو تک ٹپکنے کے لیئے تیار نہیں۔

اصغر گونڈوی

غزل نمبر ۱

حل لغات ہمتِ شرح وبیاں ـــــ کسی کیفیت کو کھول کر بیان کرنے کی طاقت اور توفیق ؛ زبانِ بے نگہ۔ زبان جو دیکھ نہیں سکتی، مراد ہے بے زبانی کی حالت ؛ نگاہِ بے زباں۔ نگاہیں جو بول نہیں سکتیں ؛ جلوۂ گل ہائے رنگیں۔ رنگین پھولوں کے حسن کا نظارہ ؛ برقِ آشیاں۔ گھونسلے کو جلانے والی بجلی ؛ نیازِ عشق۔ عشق کی عاجزی اور انکساری ؛ واعظِ ناداں۔ کم عقل وعظ و نصیحت کرنے والا ؛ جبیں۔ پیشانی۔ ماتھا ؛ قفس۔ پنجرہ ؛ اضطرابِ دل۔ دل کی بے چینی و بے قراری ؛ معاذاللہ۔ اللہ کی پناہ ؛ شاخِ آشیاں۔ گھونسلے کی شاخیں، مراد ہے وہ تنکے جن سے گھونسلہ بنتا ہے ؛ کرشمے۔ نازو ادا۔ انوکھی بات ؛ پوشیدہ ؛ پنہاں۔ پوشیدہ۔ چھپے ہوئے ؛ رقصِ بسمل۔ زخمی کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں مارنا ؛ تیغِ خوں فشاں۔ خون ٹپکاتی ہوئی تلوار ؛ تلاطم۔ اضطراب۔ بے چینی ؛ طوفانی کیفیت ؛ مشتِ خاک۔ خاک کی مٹھی۔ مراد ہے انسان جو مٹی سے بنا ہے ؛ زیرِ آسماں۔ آسمان کے نیچے۔ مراد ہے اس دنیا میں۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱:- ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح وبیاں رکھ دی
زباں بے نگہ رکھ دی، نگاہ بے زباں رکھ دی

تشریح اصغر گونڈوی کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ اُن کے سارے کلام میں تصوّف کی ایک غیر محسوس لہر جاری و ساری ہے۔ اُن کی اِس غزل میں بھی یہ صورت موجود ہے زیرِ مطالعہ شعر بھی عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں اعتبار سے خوبصورت معنویت سمیٹے ہوئے ہے۔ اصغر کہتے ہیں کہ اے دوست! تیرے حسن کی تجلیاں دیکھنے

والے کے دل و نظر کو اِس درجہ مسحور کر دیتی ہیں کہ تیرے حسن و جمال کا نظارہ کرتے ہی انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ بیان و اظہار کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں، انسان کی زبان اور آنکھیں منظر میں اس حد تک غرق ہو جاتی ہیں کہ نہ انہیں کچھ کہنے کا یارا رہتا ہے اور نہ کچھ دیکھنے کی ہمت رہتی ہے۔

شعر نمبر ۲ :- مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کسی نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

تشریح اس شعر میں اصغرؔ نے بلبل کی مناسبت سے پھول، رنگ اور آشیاں کے لفظ استعمال کر کے نہایت خوبصورتی سے صنعتِ مراعات النظیر کی صورت پیدا کی ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ بلبل رنگین پھولوں کے حسن کا منظر دیکھ کر قربان ہوئی جاتی ہے۔ شاعر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نہ جانے وہ کون ہستی ہے جس نے پھولوں کے حسن کے پردے میں وہ بجلی چھپا رکھی ہے جو آشیانے کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ مراد ہے نہ جانے پھولوں کے حسن میں بلبل کو کیا نظر آتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اُن کے عشق میں نثار کرنے کے لیے تیار ہے۔

شعر نمبر ۳ :- نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

تشریح شاعر واعظ کی نادانی پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے نادان واعظ! تو نے ہمارے عشق کے عجز و نیاز کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ ہماری عاجزی و انکساری کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ ہمارے نیازِ عشق کا یہ کمال کیا کم ہے کہ ہم سجدے کی نیت سے جہاں کہیں بھی اپنا سر جھکا دیں وہ جگہ ہمارے جذبے کی صداقت کی بدولت کعبہ کی طرح محترم ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ دنیا کی وہ کونسی جگہ ہے جہاں اللہ کی ذات موجود نہیں جب بھی انسان عجز و نیاز سے سجدہ کرے گا تو وہ ضرور قبول ہوگا۔

شعر نمبر ۴ :- قفس کی یاد میں یہ اضطراب دل معاذ اللہ!
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

تشریح کبھی کبھی عشق میں یہ مقام بھی آتا ہے کہ عاشق آزادی پر گرفتارِ بلا رہنے کو ترجیح دیتا ہے ایسی ہی کیفیت یہاں اصغرؔ نے ایک پرندے کے حوالے سے بیان کی ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی پناہ! میں نے پنجرے میں صعوبتوں کے ساتھ جو لذت آزار پائی تھی وہ آزادی کے بعد بے طرح یاد آتی ہے اور

قفس کی یاد میں دل کچھ اس قدر بے چین و بے قرار ہے کہ مجھے اپنے آشیانے کا راحت و آرام بھی نہیں بھاتا اور جوشِ دیوانگی میں میں نے اپنے گھونسلے کے تنکوں تک کو توڑ کر پھینک دیا ہے تاکہ آشیانے کی آسائش ختم ہونے کے بعد ممکن ہے قفس کی یاد پوری طرح تازہ ہو جائے ۔

شعر نمبر ۵ :- کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

تشریح محبوب نے اپنی روایتی جفا کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جب عاشق کو قتل کرنے کے لیے تلوار سے زخمی کر دیا اور زخمی نے تڑپنا شروع کر دیا موت سے قبل عاشق کے رقصِ بسمل میں نہ جانے حسن کے کیا کرشمے نظر آئے کہ اُس نے ایک اور وار کرنے کی بجائے اپنی خوں ٹپکاتی تلوار کو ایک طرف رکھ دیا ۔ گویا اُس ظالم کا رویہ غور طلب ہے کہ تڑپتے ہوئے عاشق پر ایک وار اور کر کے وہ اُسے موت سے ہمکنار کر کے اِس تڑپنے کی اذیت سے نجات دلا سکتا تھا مگر اُس ظالم کے ظلم کی انتہا ملاحظہ ہو کہ اُس نے رقصِ بسمل سے لطف اندوز ہونے کو ترجیح دی ۔

شعر نمبر ۶ :- الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

تشریح اس شعر میں شاعر نے مجازِ مرسل (ماضی کی حالت کو موجودہ حالت سے تعبیر کرنا) کی صورت کو نہایت سلیقے اور صفائی سے استعمال کیا ہے یعنی مشتِ خاک سے مراد انسان لیا ہے کیونکہ انسان کی ماضی کی حالت مٹی ہے ۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ ! تُو نے انسان جیسی ہستی کو آسمان کے نیچے اِس دنیا میں تخلیق کر کے کیا غضب ڈھایا ہے کہ جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے کائنات میں ایک ہنگامے اور طوفان کی سی کیفیت جاری ہے یعنی انسان اپنی ذات میں بہت حقیر اور مختصر نظر آتا ہے لیکن اپنی بلا کی خصوصیات کی بدولت اس دنیا میں سب سے بڑی ہنگامہ پرور ہستی بھی یہی ہے ۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات آلامِ روزگار ـــــ زمانے کی مصیبتیں : غمِ جاناں ۔ محبوب کی طرف سے ملنے والا غم : محرومِ دید ۔ محبوب کو دیکھنے سے محروم : جلووں ۔ نظارہ دل

؎ ازدہام ۔ کثرت ۔ بہتات ؎ لب کشا ہونا ۔ بولنا ۔ گفتگو کرنا ؎ قیود ۔ پابندیاں ۔ (قید کی جمع) ؎ دہر ۔ دنیا ۔ کائنات ؎ فضائے صاف ۔ صاف ستھرا ماحول ؎ زنداں ۔ قید خانہ ؎ مجبورئ حیات ۔ زندگی کی مجبوری مراد ہے ۔ زندہ رہنے کی مجبوری ؎ رازِ حیات ۔ زندگی کا بھید ؎ روزنِ زنداں ۔ قید خانے کا روشن دان ؎ شورشیں ۔ ہنگامے نظامِ جہاں ۔ دنیا کے سلسلے ۔ دنیا کا معمول ؎ نالہ و گل ۔ فریاد اور پھول ؎ مستِ رنگ و بو ۔ رنگوں اور خوشبو کے نشے میں ڈوبی ہوئی ؎ شہیدِ رسمِ گلستاں ۔ باغ کے رسم و رواج پر شہید ہونے والا ؎ فریبِ مسلسل ۔ ہمیشہ جاری رہنے والا دھوکہ ؎ وقفِ حسرت ۔ حسرتوں کے لیے مخصوص ؎ ارمان ۔ خواہشیں ؎ عالم ۔ دُنیا ۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱:۔ آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

تشریح: رنج والم زندگی کا لازمی جزو ہے اور انہیں برداشت کرنے کا سلیقہ اور قرینہ ہر فرد کا اپنا ہوتا ہے شاعر نے زمانے کے رنج والم اور مصائب کو برداشت کرنے کی یہ راہ نکالی ہے کہ ہمیں جب بھی زمانے کی طرف سے کسی مصیبت اور غم کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ہم اسے بھی محبوب کا دیا ہوا غم سمجھ کر برداشت کر لیتے ہیں ۔ گویا ہم پر زمانے اور محبوب نے اتنے ستم توڑے ہیں کہ اب ہمارے لئے رنج والم کی اہمیت ہی ختم ہو گئی ہے بقول غالب ۔

؎ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

شعر نمبر ۲:۔ میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی جلووں کے ازدہام نے حیراں بنا دیا

تشریح: شاعر وصالِ دوست کی گھڑی میں متضاد کیفیات کے تجربے سے دوچار ہو کر بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ مجھے حسنِ دوست کی تجلّیوں سے اپنے دامنِ دل کو بھرنے کے خوش نصیب لمحے بھی نصیب ہوئے ہیں مگر حیرت اِس بات پر ہے کہ دوست کے جلووں سے اس قدر قریب سے لطف اندوز ہونے کے باوجود بھی خود کو محرومِ دید محسوس کرتا ہوں ۔ کیونکہ محبوب کے حسن کے جلووں کی بہتات نے مجھے اِس حد تک حیران و پریشان کر دیا تھا کہ میری سوچنے ، سمجھنے ، محسوس کرنے اور حسنِ دوست سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیتیں گویا سلب ہو کر رہ گئیں اور میری بد نصیبی ملاحظہ ہو کہ کامیابِ دید ہونے کے باوجود میں محرومِ دید رہا ۔

شعر نمبر ۳:- یوں مسکرائے، جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

تشریح: شاعر وقتِ ملاقات محبوب کے مسکرانے اور حسنِ گفتگو کو یاد کر کے مزے لیتا ہے کہ اُس حسنِ مجسم کی مسکراہٹ کا جادو اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ اُس کے مسکراتے ہی یوں محسوس ہوا گویا کلیاں زندگی کی نعمت سے لبریز ہو گئیں اور اُس کے اندازِ گفتگو کی دلربائی ملاحظہ ہو کہ جب وہ مصروفِ تکلّم ہوتا ہے تو گویا اُس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور سارا ماحول ایک گلستاں کی مانند رنگینیوں، رعنائیوں اور خوشبوؤں میں رچ بس جاتا ہے بقولِ حضرت آتش

؎ تم جو گویا ہوئے تو پھول جھڑے — غنچہ سے منہ میں رنگ لائی بات

شعر نمبر ۴:- کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے — ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

تشریح: اہلِ خرد اور اہلِ نظر کے لیے اِس دنیا میں کیا کیا پابندیاں اور کیا کیا قید کی صورتیں ہیں کہ دنیا کی نہایت صاف ستھری اور بظاہر نہایت معتدل آب و ہوا بھی اہلِ نظر اور اہلِ ہوش کے لیے ایک قید خانہ سے کم نہیں۔ اس شعر کو اگر اُس حدیثِ نبوی کی روشنی میں دیکھا جائے کہ "یہ دنیا مومنوں کے لیے جہنم ہے اور کافروں کے لیے جنت" تو شعر کی معنویت اور جامعیت اور بھی بھرپور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں صراطِ مستقیم پر چلنے والے اہلِ نظر ہمیشہ عذاب و اذیت کے پیچ در پیچ سلسلوں میں الجھے نظر آتے ہیں۔

شعر نمبر ۵:- مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے — زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

تشریح: زندگی کے رنج و غم سے فرار ممکن نہیں اسی لیے انسان اِن سے نبرد آزما رہتا ہے اور زندگی کی مجبوریوں کی حقیقت جاننے میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس سلسلے میں شاعر کا استدلال یہ ہے کہ میں نے زندگی اور اِس کی مجبوریوں کا تجزیہ کیا ہے تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کے اِس مجبورِ محض ہونے میں ہی دراصل زندگی کی حقیقت اور بھید پوشیدہ ہے اور جب سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں میں نے زندگی کے اِس قید خانے کو ہی زندگی کا سب سے بڑا منبع سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ غالب کے بقول زندگی اور اِس کے غموں کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ بھی تو نہیں۔

؎ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شعر نمبر ۶:- وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے   جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا

تشریح: وہ تمام ہنگامے اور سرگرمیاں جن سے اِس دنیا کی رونقیں اور نظم و نسق چل رہا ہے اور وہ شورشیں جن سے اِس دنیا میں گرم بازاری ہے اگر اِن کا جائزہ لیا جائے اور انہیں مختصراً بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو انسان کی ذات میں سمٹ آتی ہیں گویا دنیا کے تمام سلسلے، گہماگہمی اور رونق بظاہر اِس حقیر نظر آنے والے انسان کے دم قدم سے قائم ہے کیونکہ بقولِ غالب۔

؎ ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال   ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

شعر نمبر ۷:- بلبل بہ آہ و نالہ و گل مست رنگ و بو   مجھ کو شہید رسم گلستاں بنا دیا

تشریح: بلبل پھول کی جدائی میں آہ و فریاد کر رہی ہے جبکہ پھول اس کی گریہ وزاری سے بے نیاز اپنی رنگوں اور خوشبوؤں کی دنیا میں کھویا ہُوا ہے اور اُسے احساس تک نہیں کہ بلبل کے دل پر اُس کے عشق میں کیا گذر رہی ہے، باغ کی اجنبیت اور غیریت کی اِس رسم نے تو ہمیں بھی مار ڈالا ہے کیونکہ ہم بھی فراقِ محبوب میں بلبل کی مانند آہیں بھرتے ہیں اور ہمارا محبوب ہے کہ اُسے پھول کی مانند اپنی آرائش اور زیبائش سے ہی فرصت نہیں۔

شعر نمبر ۸:- کہتے ہیں اک فریبِ مسلسل ہے زندگی   اس کو بھی وقف حسرت و حرماں بنا دیا

تشریح: اصغر زندگی کے بارے میں ایک مکتبۂ فکر کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی ایک مسلسل جاری رہنے والے فریب کے سوا کچھ بھی نہیں جبکہ شاعر کا خیال ہے کہ اگر زندگی ایک فریبِ مسلسل ہی ہے تو پھر حیرت اس بات پر ہے کہ اسے حسرتوں اور ارمانوں کے لیے وقف کیوں کیا جائے یعنی اگر زندگی ایک فریب ہی ہے تو اِسے حسرتوں اور خواہشوں کی آماجگاہ بنانے اور ارمانوں کی بھینٹ چڑھانے کی کیا تُک ہے۔ گویا یا تو زندگی کی حقیقت کچھ اور ہے یا پھر زندگی کے بارے میں ہمارے اندازِ نظر میں کوئی خامی ہے۔

شعر نمبر ۹:- عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

تشریح: میں اپنے تمام تر ہوش و حواس کے ساتھ اس دنیا میں زندگی گزار رہا ہوں مگر اس میں رہنے کے باوجود اِس دنیا کی حقیقت سے بے خبر ہوں اور اِسے یکسر فراموش کیے ہوئے ہوں اور دونوں باتیں میری شخصیت کا کمال نہیں بلکہ یہ میرے ساقی کا

کمال ہے کہ اُس کے پلائے ہوئے جام نے میرے لیئے یہ منزل آسان کر دی اور میں اِس دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے بے نیاز ہوں ۔ گویا نصب العین سے لگاؤ اگر اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو انسان اپنے اردگرد کے ماحول سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے ۔

یگانہ چنگیزی

غزل

حل لغات ناؤ ۔۔۔ کشتی ؛ گمان ۔ وہم ؛ جان لیوا ۔ جان لینے والا ؛ تیوری چڑھنا ۔ اظہار ناراضگی کرنا ؛ دونا ۔ دوگنا ؛ لکنت ۔ ہکلانا ۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱ :- کس کی آواز کان میں آئی　　　دور کی بات دھیان میں آئی

تشریح یہ کون سی ہستی ہے جس کی آواز ہمارے کانوں میں رس گھول رہی ہے آواز کا جادو ہے کہ کانوں کے راستے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جا رہا ہے اور اِس آواز کا حُسن ہے جو ہمارے ذہن میں عجیب و غریب سوچوں کو جنم دے رہا ہے کہ جس ہستی کی آواز اس قدر دلنشیں اور دلفریب ہو سکتی ہے اُس ہستی کا حسن و جمال اور ناز و ادا کیا قیامت ڈھاتا ہو گا ۔ گویا آواز کو سن کر ہی ہم نے بولنے والی ہستی کے بارے میں عجیب و غریب اندازے لگانے شروع کر دیئے ہیں ۔

شعر نمبر ۲ :- ایسی آزاد روح اس تن میں ۔　　　کیوں پرائے مکان میں آئی

تشریح انسان اپنے گھر میں ہو تو نہایت خوش اور مطمئن ہوتا ہے اِس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یگانہ مضمون پیدا کرتے ہیں کہ میری آزاد روح میرے اپنے جسم میں بے چین و بے قرار ہے ظاہر ہے اگر روح مطمئن اور آسودہ نہیں تو اِس نے پرائے گھر میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے گویا میری روح میرے جسم کو اپنا گھر نہیں سمجھتی ورنہ اُس کے بے چین و بے قرار ہونے کا کوئی جواز نہ تھا ۔ دراصل شاعر روحانی اعتبار سے اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں ۔

شعر نمبر ۳ :- ہائے کیا کیا نگاہ بھٹکی ہے　　　جب کبھی امتحان میں آئی

تشریح: جب بھی بھی ہماری نگاہیں آزمائش میں مبتلا ہوئی ہیں یعنی جب کبھی بھی کسی حسن کے پیکر نے ہماری نگاہوں کو اپنی طرف کھینچا، ہمیشہ ہماری نگاہیں اپنے محبوبِ نظر کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہیں، گویا دُنیا کے حسن و جمال کے مختلف مناظر کی طرف ہم متوجہ تو ضرور ہوتے ہیں مگر حسنِ دوست کے مقابلے میں کوئی دوسرا منظر ہماری نظروں کو سیراب نہ کر سکا اور ہمیشہ ہماری نگاہیں اپنے محبوب کے جلووں کے لئے بھٹکتی رہیں۔

شعر نمبر ۴:- یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی　　　کہئے کیا بات دھیان میں آئی

تشریح: انسان ایک محشرِ خیال ہے اور کبھی کبھی خیالوں کے گورکھ دھندے اُسے اپنے ارد گرد کے ماحول سے بھی لاتعلق کر دیتے ہیں۔ شاعر دوست کی ایسی ہی کیفیت پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضور! آپ کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہیں کچھ علم بھی ہے کہ ناؤ چل رہی ہے یا کنارا چل رہا ہے گویا ہر وقت خیالوں کی دنیا میں کھوئے رہنے کی بجائے آپ کو اپنے ماحول کے معمولات پر بھی نظر رکھنی چاہیئے کہ زمانہ کس قیامت کی چال چل رہا ہے۔

شعر نمبر ۵:- علم کیا علم کی حقیقت کیا　　　جیسی جس کے گمان میں آئی

تشریح: علم کے لفظی معنی جاننا کے ہیں اور اسی نسبت سے علم کی حقیقت اور حیثیت ہر شخص کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے زندگی کے کسی بھی عمل اور چیز کے بارے میں مختلف لوگوں کا علم اور رائے مختلف ہو سکتی ہے اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے ہر شخص کی رائے درست ہوتی ہے یا کم از کم وہ تو اِسے درست ہی خیال کرتا ہے۔ لہٰذا علم ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے اور ہر شخص اپنی سوچ، فکر اور توفیق کے مطابق اس کی صداقتوں پر یقین رکھتا اور اِسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

شعر نمبر ۶:- جان لیوا ہے یہ چڑھی تیوری　　　یہ کشش کس کمان میں آئی

تشریح: شاعر محبوب کے کسی بات پر ناراض ہو کر تیوری چڑھانے پر کہتا ہے کہ تمہاری ناراضگی ہماری جان لے کر چھوڑے گی کیونکہ تم غصّے میں بلا کے خوبصورت لگتے ہو اور تمہارے ماتھے پر غصّے میں پڑنے والے بل ہمارے دل پر اور بھی قیامت ڈھا رہے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں کشش کے لفظ سے ایہام کی صورت پیدا ہو گئی ہے کمان کے ساتھ آنے سے اس کے معنیٔ قریب خوبصورتی کے ذہن میں آتے ہیں مگر معنیٔ بعید کمان کے کھینچنے کی صورت میں پیشانی کے حسن میں جو اضافہ ہو

گیا ہے وہ مراد ہے ۔ گویا غصے کے عالم میں تمہارے ماتھے پر تیوری کی جو کمان کھنچ گئی ہے وہ ہماری جان لے کے چھوڑے گی ۔

شعر نمبر ۷ :- بات ادھوری مگر اثر دونا   اچھی لکنت زبان میں آئی

تشریح یگانہ محبوب کی زبان کی لکنت کو اس کی خوبی شمار کرتے ہیں کہ تم ہکلانے کی وجہ سے کوئی بات بھی پوری نہیں کرتے، ادھوری چھوڑ دیتے ہو مگر تمہاری اس ادھوری بات کا سننے والوں پر دوگنا اثر ہوتا ہے کیونکہ وہ تمہاری ادھوری بات کو اپنی خواہش اور سوچ کے مطابق مکمل کر کے اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں گویا جو بات دوسروں کے لیئے ایک خامی ہے تمہارے چاہنے والوں کے لیئے تمہارا یہی نقص ایک خوبی بن گیا ہے اور تمہاری بات کی تاثیر بھی اُن کے نقطۂ نظر سے دوگنی ہو گئی ہے ۔

شعر نمبر ۸ :- آنکھ نیچی ہوئی ارے یہ کیا   کیوں غرض درمیان میں آئی

تشریح جب بھی انسان غرض مند ہوتا ہے تو کبھی بھی دوسروں سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا اور اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یگانہ محبوب سے مخاطب ہیں کہ تم جو کبھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ما آج کیا بات ہے کہ تمہاری نظریں جھکی ہوئی ہیں اور تمہاری آنکھ کا نیچا ہو جانا اِس بات کی دلیل ہے کہ تم نے یقیناً ماضی کے برعکس آپس کے بے لوث تعلق میں اپنی کوئی غرض شامل کر لی ہے اور تمہاری دوستی میں بھی کوئی دنیاوی غرض شامل ہو گئی ہے جس کی وجہ سے تم شرمندہ سے نگاہیں جھکائے ہوئے ہو ۔

شعر نمبر ۹ :- میں پیمبر نہیں یگانہ سہی   اس سے کیا کسر شان میں آئی

تشریح مقطع میں یگانہ اپنے تخلص کی رعایت سے شاعرانہ تعلّی کی شان دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ پیغمبری کا سلسلہ تو ختم ہو چکا اور ہم پیغمبر کے منصب کے حامل نہیں مگر ہم یگانہ یعنی اپنی ذات کے اعتبار سے بے مثل و بے مثال اور دوسروں سے مختلف اور منفرد تو پھر بھی ہیں اور یہ انفرادیت ہمیں ہماری شاعری اور فکر رسا نے عطا کی ہے ، ایسی صورت میں پیغمبر نہ ہونے سے بھلا ہماری شان میں کیا کمی واقع ہو گئی گویا ہمارا یگانہ اور منفرد ہونا ہی ہماری شان ہے اور یہی ہمارے لیئے کافی ہے ۔

مثلث

حلِ لغات

ناخدائے کم ہمت ——— تھوڑے حوصلے والا ملاح ؛ ہاتھ پاؤں مارنا - کوشش کرنا ؛ بارِ سر اتارنا - سر کا بوجھ اتارنا - ذمہ داری پوری کرنا ؛ کشتیٔ حیات - زندگی کی کشتی ؛ بروئے کار آنا - کام آنا - مددگار ثابت ہونا ؛ خانۂ خدا - اللہ کا گھر - مراد ہے خانہ کعبہ ؛ طلسمِ حیرت - حیران کر دینے والا جادو ؛ اسیرِ غم - غموں اور دکھوں کا قیدی ؛ پائے مضطرب - وہ پاؤں جو کسی پل چین نہیں لینے دیتے ؛ دل کی لگی - وہ بات جو دل میں ٹھہر گئی مراد ہے محبّت ؛ امیدِ فردا - آنے والی کل کی امید - مراد ہے مستقبل کی خوشی کی امید ؛ مضطرب نگاہیں - بے چین نگاہیں ؛ حکمِ انتظار - انتظار کرنے کا حکم -

---

نظم کا تعارف

مثلث وہ صنفِ نظم ہے جس کے ہر بند میں تین مصرعے ہوتے ہیں اور ہر بند ثلاثی کہلاتا ہے - ہر بند یا ثلاثی میں عام طور پر تینوں مصرعے ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں - البتہ کبھی کبھی شاعر یہ اہتمام کرتا ہے کہ نظم کے پہلے بند کے تینوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور بعد میں آنے والے بندوں کے پہلے دو مصرعے باہم ہم قافیہ جبکہ تیسرا مصرعہ پہلے بند کے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے - یہی اہتمام یاسؔ نے زیرِ مطالعہ نظم میں روا رکھا ہے -

بند نمبر ۱ :- ناخدائے کم ہمت ہاتھ پاؤں مار آیا　　تہہ کی کیا خبر لاتا حوصلہ بھی ہار آیا
بار اتارنا کیسا بارِ سر اتار آیا

تشریح

یاسؔ ناخدا یعنی ملاح کی کم ہمّتی پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بیچارا ناخدا کم ہمت اور بزدل تو تھا ہی مگر اہلِ دنیا کے سامنے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اس نے مقدور بھر کوشش کی اور خوب ہاتھ پاؤں مارے - اس کے لیے بات کی تہہ تک پہنچنا تو ممکن نہ تھا البتہ اسے شکست کا اعتراف ضرور کرنا پڑا - وہ کسی کو منزل تک تو کیا پہنچاتا البتہ اپنے سر کا بوجھ یعنی کوشش کرنے کی ذمہ داری ضرور نبھا آیا - مختصراً آج کے رہنما اپنی بد تدبیری کی وجہ سے معاملے کی حقیقت تک پہنچ نہیں پاتے اور ان کے پیروکاروں کو گوہرِ مقصود ہاتھ لگنے کی بجائے الٹا نقصان اٹھانا پڑتا ہے -

بند نمبر ۲ :- کشتیٔ حیات اپنی جا رہی تھی دھارے پر　　سنگدل تماشائی ہنستے تھے کنارے پر
دل وہی شکستہ دل پھر بروئے کار آیا

تشریح: ہماری زندگی کی کشتی وقت اور حالات کے دھارے پر بہہ رہی تھی اور اہلِ دنیا تھے کہ اپنی سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری ہنسی اڑاتے تھے اور اپنے مذاق کا نشانہ بناتے تھے۔ اِن کڑے حالات میں ہمارا مصائب کا مارا ہوا دل ہی ہمارا مددگار ثابت ہوا اور اُس کی مستقل مزاجی کی بدولت ہی ہم اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

گویا لوگ کسی کی حالتِ زار پر رحم کھانے کی بجائے اس کی تضحیک کا سامان پیدا کرتے ہیں اور انسان اپنے حوصلے اور ہمت سے صرف اس صورت میں منزل پر پہنچ سکتا ہے کامیاب و کامران ہوسکتا ہے اگر وہ اہلِ دنیا کی کسی بات کی پرواہ نہ کرے بقول شاعر

ے اے دوست! میرے حالِ زبوں پر نہ طنز کر — کچھ حوصلے بھی ہیں میری بیچارگی کے ساتھ

بند نمبر ۳:- خانۂ خدا معلوم، شیخ و برہمن جھوٹے — اس طلسمِ حیرت سے کب اسیرِ غم چھوٹے
پائے مضطرب ٹوٹے جب کہیں قرار آیا

تشریح: خانۂ خدا کی حقیقت سے کون واقف نہیں وہ یقیناً قابلِ صد احترام ہے مگر شیخ و برہمن کی زندگی محض جھوٹ، تضاد بیانی اور منافقت پر مبنی ہے۔ نہ جانے حیرت کی اِس جادونگری (مراد دنیا) سے کب ہماری غم زدہ زندگی کو چھٹکارا ملے گا ہم انہیں سوچوں میں راہِ نجات حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہے بالآخر کبھی نہ تھکنے والے اور بے چین و بے قرار رہنے والے پاؤں ٹوٹ گئے اور تب کہیں ہماری زندگی کو بھی قرار آیا۔ گویا دنیا میں مذہب کے نام پر شیخ و برہمن اپنے مفادات کی دوکانداری کر رہے ہیں اور سادہ لوح لوگوں کی زندگی کا عذاب اُن کی موت کی صورت میں ہی ختم ہوتا ہے۔

بند نمبر ۴:- شام سے بھڑک اُٹھی اور بھی لگی دل کی — یاس امیدِ فردا نے واہ کیا تسلّی دی
مضطرب نگاہوں کو حکمِ انتظار آیا

تشریح: اے یاسؔ! نہ جانے کب سے ہم وصلِ دوست کے لیے کوشاں تھے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہم نے نہ جانے کون کون سی اذیت اور عذاب برداشت کیئے ہیں تب کہیں اُس سنگ دل محبوب نے ملاقات کے لئے آنے والی کل کی امید دلائی ہے اور وصل کا وعدہ کیا ہے۔ آج ابھی شام ہی ہوئی ہے لیکن ہمارے دل کی لگی ابھی سے بھڑک اٹھی ہے یعنی ملاقات کے دن کے درمیان ابھی طویل رات باقی ہے اور ہماری بے چینی، بے قراری کا یہ عالم ہے کہ گویا ابھی سے ہماری بے چین و بے قرار نگاہوں کو انتظار کا حکم مل چکا ہے اور وہ ابھی سے دروازے پر لگی ہوئی ہیں کہ نہ جانے محبوب کب اپنے حسنِ سوزاں کے ساتھ وعدہ ایفا کرنے چلا آئے۔

جگر مراد آبادی

غزل

حلِ لغات فصلِ بہار - موسمِ بہار ؛ وسعت - پھیلاؤ ؛ اشکِ خوں - خون کے آنسو ؛ مرقعِ غمِ یار - محبوب کے غم کی ہو بہو تصویر ؛ نثار - قربان ؛ چشمِ سحر نگار - جادو بھری آنکھیں ؛ بار - بوجھ ؛ دوش - کندھا ؛ زانوئے یار - محبوب کے زانو ؛ جمالِ حسن - حسن کے جلوے ؛ نازشیں - نزاکتیں ؛ عنایتیں - مہربانیاں ؛ مشتِ غبار - خاک کی مٹی مراد ہے انسان / شاعر ؛ پیامِ آخرِ غم - غم کا آخری پیغام یعنی میری زندگی کا آخری پیغام ؛ رہینِ درد - درد سے وابستہ ، دردمند ؛ شیفتہ - عاشق ، دلدادہ ؛ فریفتہ - عاشق - دلدادہ ؛

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱: کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر ، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں ، مرا حق ہے فصلِ بہار پر

تشریح جگر مراد آبادی نے چمن کی مناسبت سے چمن سے معنوی تعلق رکھنے والے الفاظ شاخ ، سبزہ ، برگ ، غنچہ ، گل اور خار وغیرہ کا ذکر کر کے صنعتِ مراعات النظیر کی خوبی شعر میں پیدا کی ہے - شاعر کہتا ہے کہ میں نے اس چمن کی زیب و زینت کو قائم و دائم رکھنے کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں اس کے لئے مصائب و آلام بھی برداشت کئے ہیں اور اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں کا عروج بھی دیکھا ہے اس لئے اس چمن کی تمام نعمتوں پر میرا پورا حق ہے اگر لفظ چمن کو وطن کے حوالے سے دیکھا جائے تو بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے وطن میں ہر خوشی اور غم کو ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے اور اپنے وطن پر اپنے استحقاق پر بھی فخر کرتا ہے -

شعر نمبر ۲: جنہیں کیسے عشق کی وسعتیں ، جو ہیں خاص حسن کی عظمتیں
یہ اسی کے قلب سے پوچھئے ، جسے فخر ہو غمِ یار پر

تشریح حسن کی کشش اور عظمت کیا ہوتی ہے اور عشق کی وسعتیں کیا حیثیت رکھتی ہیں ان کو صرف اُس عاشق کا دل سمجھ سکتا ہے جسے محبوب کی جدائی کے غم سے پالا پڑا ہو یعنی جس کا دل غمِ محبوب سے گداز ہو وہی محبوب کے حسن و جمال کی قدر و قیمت سمجھ سکتا ہے اور وہی عشق کی وسعتوں

سے واقف ہو سکتا ہے۔ گویا عشق اور حسن کی حقیقت کو جاننا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔

شعر نمبر ۳:

مرے اشک خوں کی بہار ہے، کہ مرقع غم یار ہے
مری شاعری بھی نثار ہے، تری چشم سحر نگار پر

تشریح: اے دوست! تمہارے عشق میں ہماری یہ حالت ہے کہ ہماری آنکھوں سے خون کے آنسو جاری ہیں مگر آنکھوں سے ٹپکنے والے خون کے یہ آنسو ہمارے شدتِ غم کی تصویر پیش کرتے ہیں پھر اگر ہمیں تمہاری جادو بھری آنکھوں کا التفات اور توجہ حاصل ہو جائے تو ہم اپنی زندگی بھر کی کمائی یعنی اپنی شاعری تک قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ گویا شاعر محبوب کی جدائی میں ہر رنج و الم برداشت کرنے کے لئے تیار ہے اور محبوب کے نظر التفات کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہے۔

شعر نمبر ۴:

عجب انقلاب زمانہ ہے مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

تشریح: زمانہ تغیر آشنا ہے اس میں ہر لحظہ تبدیلیاں اور انقلاب رونما ہوتے رہتے ہیں مگر زمانے کے عجیب و غریب انقلاب کے حوالے سے ہمارا قصہ تو بہت ہی مختصر ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ ہمیں محبوب کا خلوص اور محبت حاصل تھا اُس کی نوازشوں اور عنایتوں کا یہ عالم تھا کہ ہمارا سر اُس کے زانوؤں کی زینت بنتا تھا مگر انقلابِ زمانہ کے بعد آج یہ عالم ہے کہ محبوب کی بے التفاتی اور جفاکیشی کی بدولت وہی سر اب ہمیں اپنے کندھوں پر بوجھ محسوس ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۵:

یہ کمال عشق کی سازشیں، یہ جمال حسن کی نازشیں
یہ عنایتیں یہ نوازشیں، مری ایک مشت غبار پر

تشریح: عشق ایک عجیب صد رنگ معاملہ ہے کہ اس میں کبھی عاشق کو جفا و جور کے تیر سہنے پڑتے ہیں، کبھی زمانے بھر کی سازشوں کا تن تنہا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور کبھی محبوب کے حسنِ جہاں سوز کے ناز و ادا برداشت کرتے پڑتے ہیں۔ غرض عشق نہ جانے کون کون سی مہربانیاں، عنایتیں اور نوازشیں ہم عاشقوں کی جانِ ناتواں پر کرتا ہے۔ یہاں شاعر نے مشتِ غبار کے پیرائے میں مجازِ مرسل استعمال کیا ہے مراد ہے شاعر کی اپنی ذات، جس کی اصل اور حقیقت مٹی ہے۔

شعر نمبر ۶:

مری سمت سے اسے اے صبا! یہ پیام آخر غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا، کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

تشریح: فراقِ دوست میں شاعر کا یہ حال ہے کہ شدتِ غم کسی وقت بھی اُس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی ہے اور اسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے شاعر صبح کی ہوا سے مخاطب ہے کہ

اے صبا! اگر تیرا محبوب کے کوچے سے گذر ہو تو میری طرف سے اُس جفا پیشہ محبوب کو میرا آخری پیغام دے دینا کہ اگر تجھے اپنے عاشقِ زار کو آخری مہربانی سے نوازنے کی توفیق ہو تو اُس کی موت سے پہلے اگر اُسے مل لے کیونکہ اس کے بعد اُس کی زندگی کی بہار پر ہمیشہ کے لئے خزاں طاری ہو جائے گی یعنی اِس آخری وقت اپنے بیمارِ غم کو اپنے دیدار کی دولت سے نوازدو ورنہ کون جانے کب اُس کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے اور پھر تیرے لئے اُس کی اِس آخری خواہش کو پورا کرنا بھی ممکن نہ رہے۔

شعر نمبر ۱:

میں رہینِ دردِ ہی مگر ، مجھے اور چاہیے کیا جگر
غمِ یار ہے مرا شیفتہ ، میں فریفتہ غمِ یار پر

تشریح: اے جگر! مجھے زندگی میں اس سے بڑھ کر کیا چاہیئے کہ میں عشق کے درد و غم سے وابستہ ہوں اور یہی دردِ عشق میری زندگی کا حاصل ہے۔ اِس سے بڑھ کر میری خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ محبوب کا غم ہمارا گرویدہ اور عاشق ہے جبکہ میں محبوب کے غم کا عاشق اور والا و شیدا ہوں۔ گویا غمِ دوست اور میری ذات ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور میرے لئے یہ بات کچھ کم اعزاز نہیں ہے۔

جوش ملیح آبادی

ہماری سوسائٹی

حلِ لغات: سرنگوں۔ سر جھکائے ہوئے، پست؛ شل۔ بے بس، تھکا ماندہ؛ بارِ یاس۔ مایوسی کا بوجھ؛ شرار۔ چنگاری؛ کیف۔ نشہ، خمار، سرور؛ رنج و محن۔ دکھ اور تکلیف؛ ظرافت۔ دل لگی، ہنسی مذاق؛ پھیکا پن۔ بے لطفی؛ جولانی۔ طبیعت کی روانی، اُمنگ، ولولہ؛ خال و خط۔ شکل و صورت؛ کرب۔ دکھ، تکلیف؛ بالقصد۔ قصداً یا ارادتاً؛ چھپے۔ شوخیاں؛ زمزمے۔ نغمے۔ گیت؛ مجروح۔ زخمی؛ زرق برق لباس۔ خوبصورت اور شاندار لباس؛ ولولے۔ جوش و خروش امنگ؛ اشکبار۔ آنسو برسانے والا؛ نقابِ زریں۔ سنہری نقاب؛ تلاطم۔ جوش، ولولہ؛ ترنگ۔ جوش، ولولہ؛

اشعار کی تشریح

تعارف جوش نے ہمارے زوال آمادہ معاشرے کی حقیقت پسندانہ عکاسی زیرِ مطالعہ نظم میں کی ہے ۔ایک زوال آمادہ معاشرے کی صفات میں افراد کے قول و فعل اور ظاہر و باطن کا تضاد سرِ فہرست ہوتا ہے اسی تضاد کو شاعر نے نہایت دلنشیں پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نظم کے ڈکشن میں شوکتِ الفاظ سے کام لیتے ہوئے جوش نے اپنا مافی الضمیر بلند آہنگی سے بیان کیا ہے ۔

شعر نمبر ۱: حوصلے سرنگوں ، امیدیں شل　　　آرزو ، بارِ یاس سے بوجھل

تشریح جوش ہمارے زوال آمادہ اور شکست خوردہ معاشرے کے افراد کے سیرت و کردار کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر شخص کی ہمت پست ہو چکی ہے اور وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہے ۔اس کے دل سے امیدیں مٹ چکی ہیں اور روشن مستقبل کی خواہشیں اور آرزوئیں تو گویا مایوسی اور ناکامی کے یقین کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ چکی ہیں ۔

شعر نمبر ۲: نشہ بجھتا ہوا سا ایک شرار　　　کیف گرتی ہوئی سی اک دیوار

تشریح معاشرے کا ہر فرد امید و یاس کے نشے میں چور ہے جس کی حیثیت ایک بجھتی ہوئی چنگاری سے زیادہ کچھ بھی نہیں اور ان کا کیف و سرور ایک گرتی ہوئی دیوار کی طرح ہے گویا ان کے دلوں میں زندگی میں سرخرو ہونے کی کوئی ہمت اور کوئی صورت باقی بھی ہے تو وہ بھی ان کے اس کیف و سرور کی نذر ہو جائے گی ۔

شعر نمبر ۳: ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن　　　ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن

تشریح زندہ قوموں کے افراد زندہ دلی کا عمدہ نمونہ ہوتے ہیں مگر افسوس ہمارے معاشرے میں اس زندہ دلی کا فقدان ہے ۔یہاں تک کہ ہمارے ہاں سنائے جانے والے لطیفوں کے پسِ منظر میں بھی رنج و غم کی کیفیت موجود ہوتی ہے اور ہمارے ہنسی مذاق اور ظرافت میں بھی بے لطفی اور پھیکا پن چھایا رہتا ہے ۔

شعر نمبر ۴: شرم سے آب آب ، جولانی　　　ہر ہنسی شرمسار ، کھسیانی

تشریح ہماری طبیعت کی جولانیاں اور امنگیں شکست خوردگی اور احساسِ کمتری کی وجہ سے شرمندگی اور ندامت کا احساس لیے ہوئے ہیں اور ہماری مسکراہٹیں اور ہنسی زندہ دلی کی بجائے کھوکھلی اور کھسیانی ہے یعنی اپنی جولانی اور ہنسی سے زندہ دلی کا جو مظاہرہ ہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس میں بری طرح ناکام ہیں ۔

شعر نمبر ۵: خال و خط پر دھواں بناوٹ کا　　　کرب بالقصد مسکراہٹ کا

تشریح ہمارے معاشرے کے ہر فرد کے دوہرے کردار کا یہ عالم ہے کہ ہم نے اپنی شکل وصورت اور طور طریقوں کی سادگی کو ظاہرداری اور بناوٹ سے بدل دیا ہے مگر اسے نبھانے میں بھی کامیاب نہیں ہو پائے اور ہماری زبردستی کی مسکراہٹوں سے ہمارا داخلی دکھ اور کرب ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔

شعر نمبر۶: پھیکے سرد ، نہ مزے مجروح — قہقہے تک تھکے ہوئے بے روح

تشریح جوش بڑے دکھ سے کہتے ہیں کہ ہم جو زندہ دل مشہور تھے اب یہ عالم ہے کہ ہماری زندہ دلی پر سردمہری چھا گئی ہے گویا ہماری خوش طبعیاں ختم ہوچکی ہیں یہاں تک کہ ہمارے قہقہوں کا بانکپن بھی ختم ہوچکا اور احساسِ محرومی کا شکار ہو کر ہمارے قہقہے تھک چکے ہیں اور زندگی کی گرم جوشی اور جوش وخروش تو گویا ان سے روٹھ چکا ہے۔

شعر نمبر۷: صرف لے دے کے زرق برق لباس — ولولے اشکبار ، روح اداس

تشریح بس لے دے کے اگر ماضی کی کوئی یادگار اس قوم کے افراد نے اب بھی اپنا رکھی ہے تو وہ زرق برق لباس ہے مگر جب دل بجھ چکے ہوں، روشن مستقبل کی امیدیں ختم ہوچکی ہوں۔ خواہشیں مرچکی ہوں اور روحیں اداس ہوچکی ہوں تو لباس کی چمک دمک کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی کیونکہ اصل چیز تو عزم وحوصلہ ہے جس سے اِس معاشرے کا ہر فرد محروم ہے۔

شعر نمبر۸: زرد چہرے نقاب زریں ہیں — سرد لاشیں ، لباس رنگیں ہیں

تشریح ہر فرد کے عزم وحوصلے سے محروم ہونے کے سبب اب تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ ناکام و مایوس زرد چہروں نے سنہرے نقاب اوڑھ رکھے ہوں یا پھر چلتی پھرتی لاشوں کو رنگین لباس پہنا دیئے گئے ہوں۔ یعنی زندگی کے جذبوں اور توانائی سے محروم افراد کو خوش لباسی نہ زیب دیتی ہے نہ بھاتی ہے۔

شعر نمبر۹: نہ تلاطم نہ تازگی ، نہ ترنگ — یہ ہے اپنی سوسائٹی کا رنگ

تشریح مختصراً ہماری آج کی سوسائٹی کا یہ حال ہے کہ ہر فرد زندگی کے جوش وولولے سے محروم ہے سوچ اور فکر کی تازگی اور چہرے کی بشاشت عنقا ہوگئی ہے اور زندگی کی امنگیں اور خواہشیں دم توڑ چکی ہیں۔ ظاہر ہے جو سوسائٹی زندگی کی حرکت سے محروم ہوچکی ہو اُسے زندہ سوسائٹی کیسے کہا جا سکتا ہے۔

۲۔ بدلی کا چاند

حل لغات خورشید۔ سورج ؛ ظلمت۔ تاریکی ؛ مہتاب۔ چاند ؛ سانولاپن۔ سیاہی مائل رنگ ؛ صباحت۔ اجالا ؛ جبیں۔ پیشانی ؛ چاک ہونا۔ پھٹ جانا ؛ گردوں۔ آسمان ؛

سقینے۔ناؤ، کشتی ؛ سنکی ہونا۔دیوانہ ہونا، پاگلوں جیسی حرکات کرنا ؛ گرداب۔بھنور ؛ کہسار۔
پہاڑی سلسلہ ؛ غرفہ۔کھڑکی، جھروکہ ؛ چلمن۔چک، پردہ ؛ ضیا برسانا۔روشنی پھیلانا ؛ کاوش۔
کوشش۔جدوجہد ؛

تعارف | جوش نے غروبِ آفتاب کے بعد بادل کے ٹکڑے میں چاند کے غائب ہونے اور پھر ظاہر ہو کر سارے ماحول کو چاندنی کے نور سے معمور کر دینے کے منظر کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔اور نور و ظلمت کے ایک دوسرے پر غالب آنے کی جدوجہد کا تقابل انسانی فطرت کی بے چینی و بے قراری سے کیا ہے۔نظم میں جوش کی شوکتِ الفاظ اور بلند آہنگی کی صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

شعر نمبر ۱: خورشید، وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب، وہ ہلکے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا

تشریح | جوش غروبِ آفتاب کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ دیکھو سورج ڈوب گیا اور ہر طرف تاریکی پھیلنے لگی جب ہر طرف تاریکی کا دور دورہ ہو گیا تو چاند ہلکے بادلوں کے پیچھے سے چاندی کے اوراق کی بارش کرنے لگا۔شاعر نے بادل کی اوٹ سے چاند کی شعاعوں کے چھن چھن کر آنے کو چاندی کے چمکتے ہوئے اوراق کے برسنے کے خوبصورت استعارے سے بیان کیا ہے۔

شعر نمبر ۲: وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

تشریح | جیسے ہی چاند نے بادل کی اوٹ سے تھوڑا سا نکل کر اپنی روشن پیشانی کا جلوہ دکھایا تو دور تک پھیلے ہوئے میدان کی سیاہی اور تاریکی میں ایک ہلکا سا اُجالا پھیلتا ہوا چلا گیا۔

شعر نمبر ۳: لو پھر ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو، پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

تشریح | چاند اک ذرا سی جھلک دکھا کے پھر بادل میں چھپ گیا اور بادل میں روشنی کی لکیریں کھنچتی چلی گئیں مگر تھوڑی سی دیر کے بعد پھر بادل چھٹ گئے اور ہر طرف روشنی کیا پھیلنے لگی کہ تاریکی کے پاؤں بھی خوف سے کانپنے لگے یعنی تاریکی کو اپنا وجود قائم رکھنا مشکل نظر آنے لگا۔

شعر نمبر ۴: بادل میں چھپا، تو کھول دیئے، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا، تو گردوں، دریا کی طرح لہرانے لگا

تشریح | روشن چاند آسمان پر عجیب و غریب کرشمے دکھاتا ہے جب یہ بادلوں میں چھپتا ہے تو بادل کی اوٹ سے اس کی شعاعیں یوں چھن چھن کر آتی ہیں جیسے کہ ہیرے سے روشنی

منعکس ہو رہی ہو اور جب یہ صاف آسمان پر ظاہر ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے نور کا دریا ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

شعر نمبر ۵:۔ سمٹی جو گھٹا، تاریکی میں چاندنی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

تشریح: جب آسمان پر کالی گھٹائیں سمٹ گئیں تو ان میں چاند یوں محسوس ہوا جیسے تاریکی میں چاندی کی چمکتی ہوئی کشتی ہولے ہولے بہتی جا رہی ہو اور جب ہوا نے دیوانگی میں بادلوں کو اِدھر اُدھر حرکت دی تو ایسا معلوم ہوا جیسے چاند بادلوں کے بھنور میں غوطے کھا رہا ہو۔

شعر نمبر ۶:۔ غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا

تشریح: ذرا اس روشن چاند کی شوخیاں ملاحظہ ہوں کہ جب یہ بادل کے دریچوں سے جھانکتا ہے تو گویا آسمان بھی اس پر نثار ہو جاتا ہے اور اُس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو جاتی ہے اور جب یہ بادل کے حلقوں میں بھاگتا ہے تو پہاڑی سلسلے بھی گھومتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

شعر نمبر ۷:۔ پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پر تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

تشریح: چاند جب بادل کا پردہ اپنے روشن چہرے سے ہٹاتا ہے یعنی بادلوں سے باہر آ جاتا ہے تو زمین کے سینے پر بہتے ہوئے دریا کا پانی چمک کر اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہے اور جب یہ بدلی کی چلمن کے پیچھے چھپ جاتا ہے تو میدان کے چہرے پر تاریکی پھیلتی چلی جاتی ہے اور وہ گھبرائے ہوئے سے لگتے ہیں۔

شعر نمبر ۸:۔ اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی، ڈوبا، تو فلک بے نور ہوا
الجھا، تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

تشریح: چاند بادلوں سے اُبھر کر سامنے آتا ہے تو ہر طرف حسن و نور کے جلوے بکھر جاتے ہیں۔ اور جب بادل میں چھپ گیا تو آسمان کے چہرے پر سیاہی پھیل جاتی ہے گویا اس کا بادلوں میں الجھنا ماحول کو تاریک کر دیتا ہے اور بادل سے اپنے معاملے کو سلجھا لینا ہر طرف روشنی اور نور کے پھیلنے کی خوشخبری ہے۔

شعر نمبر ۹:۔ کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے، کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا، مفہوم سمجھ میں آنے لگا!

تشریح غرض بادل میں چھپنا اور پھر اس سے چاند کا نکل آنا یوں محسوس ہوتا ہے یہ نور اور ظلمت کی ایک دوسرے پر غالب آنے کی جدوجہد ہے اور چاند قید اور آزادی کا کیا سبق آموز منظر پیش کرتا ہے۔ نور و ظلمت کے اس معرکے کو دیکھ کر انسان کی بے قرار طبیعت اور بے چین فطرت کی حقیقت سمجھ میں آنے لگتی ہے یعنی انسان بھی اقبال کے بقول

ع ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

فراق گورکھپوری

غزل

حلِ لغات نگاہِ ناز۔ ناز و ادا والی نظریں ؛ حجاب۔ شرم، حیا ؛ نرم نگاہی۔ مہربانی کی نظروں سے دیکھنا ؛ پہلو بچانا۔ کنارہ کرنا ؛ نثارِ نرگسِ میگوں۔ نرگس جیسی نشیلی آنکھوں کے قربان ؛ تھرتھرانا۔ کانپنا۔ ڈولنا ؛ زخمِ نہاں۔ پوشیدہ زخم، وہ ظلم جو نظر نہ آئے ؛ چراغِ طور۔ کوہِ طور پر روشن چراغ ؛ بقدرِ ذوقِ نظر۔ دیکھنے کے ذوق کے مطابق ؛ دیدِ حسن۔ حسن کا دیدار ؛ نگاہِ شوق۔ شوق کی نگاہیں مراد ہے عاشق کی نظریں ؛ جلوے سمانا۔ حسن کا احساس ہونا ؛ دلِ برباد۔ وہ دل جو عشق میں تباہ ہو چکا ؛ خرامِ ناز۔ محبوب کا ناز و ادا سے چلنا ؛ فتنے اٹھانا۔ فساد کھڑے کرنا، ہنگامے کی صورت پیدا کرنا ؛ پیامِ حسن۔ مراد ہے محبوب کا پیغام ؛ پیامِ جنون۔ دیوانگی کا پیغام ؛ پیغامِ فنا۔ فنا ہونا یعنی موت کا پیغام ؛ فسانے سنانا۔ جھوٹے سچے قصے بیان کرنا ؛ بھرم گنوانا۔ اعتماد نہ رہنا ؛ راہِ وفا۔ وفا اور عشق کا راستہ ؛ سبک روی۔ آہستہ آہستہ چلنا، آگے بڑھنا ؛ قدم ڈگمگانا۔ لغزش ہونا، ثابت قدم نہ رہ سکنا ؛

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱۔ نگاہ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا　　حجاب اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا

تشریح محبوب کی مد بھری نگاہوں نے کیا کیا ناز و ادا دکھا کے حسن کی تجلیوں کے کچھ ایسے انداز دکھائے کہ اہلِ محبت یعنی عشاق بھی شرم و حیا محسوس کرنے لگے۔ گویا محبوب نے ہمارے سامنے کچھ ایسی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا کہ ہم جو اہلِ محبت ہیں جن کے دلوں میں عشق کا چراغ روشن ہیں ہم بھی ان حقیقتوں کو جان کر حجاب و شرم محسوس کرنے لگے ہیں۔

شعر نمبر ۲: جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی — چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

تشریح اے دوست! دنیا میں تو بس تیرے حسن و جمال کے بے مثل و بے مثال ہونے کی ابھی افواہ ہی پھیلی تھی کہ کفر و ایمان کی گرم بازاری ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ گویا محض تیرے حسن کی افواہ سن کر ہی لوگ تیرے حسن کے کچھ ایسے گرویدہ ہو چکے ہیں کہ دین و دنیا کی ساری باتیں بھول گئے ہیں۔ اگر یہ لوگ تمہارے حسن کو مجسّم دیکھ لیں تو نہ جانے ان کا کیا خیال ہو۔ عدم کا شعر ہے:

حسن وہ گرم حقیقت ہے الٹ دے جو نقاب — کعبہ و دیر کے ماتھے پہ پسینہ آجائے

شعر نمبر ۳: دوچار برق تجلی سے رہنے والوں نے — فریب نرم نگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا

تشریح جو لوگ محبوب کے حسن کے جلووں کا سامنا کرتے رہے اور اس کی برقِ تجلّی سے دوچار رہے گویا اُن کی عمر محبوب کی سختیاں برداشت کرتے گزر گئی انھیں جب بھی محبوب نے اپنی چشمِ کرم اور نظرِ التفات سے نوازا تو وہ کیسے کیسے فریب تمنّا سے دوچار ہوئے۔ اور انھوں نے محبوب کی نرم نگاہی سے کیا کیا دھوکے کھائے۔ مراد یہ ہے کہ عاشق عام طور پر محبوب کے جلووں میں ہی کھویا رہتا ہے مگر جب کبھی محبوب کی نظرِ کرم اُس پر پڑتی ہے تو کیسے کیسے دھوکوں کا شکار ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۴: دلوں پہ کرتے ہوئے آج آتی جاتی چوٹ — تری نگاہوں نے پہلو بچائے ہیں کیا کیا

تشریح اے دوست! تیری نازِ نگاہ نے اپنے چاہنے والوں پر کیا کیا ستم توڑے ہیں اور اُن کے دلوں کو کیسے کیسے گھائل کیا ہے بیان سے باہر ہے مگر حیرت اس بات پر ہے تمہاری نگاہیں آتے جاتے دلوں پر چوٹ کرنے کے باوجود خود ہر کیفیت سے لاتعلق اور کنارہ کش رہیں۔ گویا عشاق کے حساس دلوں پر سو قیامتیں ڈھانے کے باوجود محبوب اُن کی حالتِ زار سے بے نیاز و لاتعلق رہتا ہے۔

شعر نمبر ۵: نثار نرگسِ میگوں کہ آج پیمانے — لبوں تک آتے ہوئے تھرتھرائے ہیں کیا کیا

تشریح اے دوست! تیری نرگس جیسی اور کیف و سرور میں ڈوبی رہنے والی آنکھوں کے قربان جائیے، کہ ان کو دیکھ کر کتنے ہی رندِ بلانوش اپنے ہونٹوں تک آئے ہوئے شراب کے پیالوں کو بھول کر تیری آنکھوں کے نشے میں ڈوب گئے۔ انھوں نے تیری آنکھوں جیسی نشیلی آنکھیں کب دیکھی تھیں اور آج جب انھیں موقعہ ملا تو شراب کا کیف و سرور انھیں حقیر لگا اور وہ اسے بھول کر تیری آنکھوں کے نشے میں ڈوبنے کے خیال میں کھو گئے۔

شعر نمبر ۶: وہ اک ذرا سی جھلک برقِ کم نگاہی کی — جگر کے زخم نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا

تشریح اے دوست! تیری نگاہوں سے گرنے والی بجلی کی اک ذرا سی جھلک کا کمال یہ ہے کہ ہمارے جگر کے زخم پھر سے مسکرانے لگے ہیں۔ دراصل عشق میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے جب عاشق محبوب کے ظلم و ستم سے بھی لطف اندوز ہونا شروع کر دیتا ہے۔ شاعر بھی ایک عرصے سے محبوب کی التفاتی کا

نسکار ہے اور اُس کے جگر کے زخم بھی آہستہ آہستہ بھرنے لگے تھے کہ یکایک محبوب ایک بار پھر اس پر پر نگاہوں کی بجلی گرا کر اُسے لذتِ آزار سے دوچار کرتا ہے اور اُس کے زخمِ جگر مسکرانے لگتے ہیں یعنی یہ زخم پھر ہرے ہو جاتے ہیں۔

شعر نمبر ۷:- چراغِ طور جلے آئینہ در آئینہ حجاب برق ادا نے اٹھائے ہیں کیا کیا

تشریح: چراغِ طور کی تلمیح سے شاعر نے شعر کو معنوی حسن سے آراستہ کیا ہے۔ یہ اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے جب حضرت موسیٰؑ رات کے اندھیرے اور سردی میں طور کے پاس سے گزر رہے تھے اور کوہِ طور پر جلتی روشنی کو دیکھ کر اُدھر چلے گئے۔ زیرِ مطالعہ شعر میں اس مناسبت سے عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں حوالوں کا شعر ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ہمارے محبوب نے اپنے حسن کے جلووں سے جب پردہ اٹھایا تو ہمیں تو ہر آئینے میں اُسی کے حسن کی شمع روشن نظر آئی یعنی جب سے ہم نے محبوب کے حسن و جمال کو دیکھا ہے، ہمیں دنیا کے ہر خوبصورت منظر میں اُسی کے حسن کی تجلیاں نظر آتی ہیں۔

شعر نمبر ۸:- بقدرِ ذوقِ نظر دیدِ حسن کیا ہو مگر نگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا

تشریح: ہمارے ذوقِ نظر کے مطابق محبوب کے حسن و جمال کا دیدار کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ ہماری نگاہِ شوق ہے کہ اُس میں حسنِ دوست کے جلوے سمٹے چلے آئے ہیں مگر پھر بھی نگاہوں کا اشتیاق پورا نہیں ہوتا۔ شاعر کا استدلال یہ ہے کہ ہر شخص کو اُس کے ظرف کے مطابق نوازا جانا چاہیے اور ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ حسنِ دولت کی تجلیوں کو اپنے ذوقِ طلب کے مطابق اپنے دل و نظر و سمیٹ لیں مگر افسوس ایسا ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ ہماری تشنگی برقرار ہے۔ بقول غالب

؎ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

شعر نمبر ۹:- کہیں چراغ، کہیں گل، کہیں دلِ برباد خرامِ ناز نے فتنے اُٹھائے ہیں کیا کیا

تشریح: شاعر محبوب کے حسنِ خرام کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سراپا ناز جب محوِ خرام ہوتا ہے تو ایک طرف تو اُس کا حسنِ جہاں سوز قیامت ڈھاتا ہے پھر اُس کی چال اس قدر خوبصورت اور دل فریب ہے کہ جگہ جگہ ہنگامے بپا کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی خرامِ ناز کہیں راستوں کو منور کرتا چلا جاتا ہے کہیں اُس کے حسن کی جھلک دیکھ کر پھول کھل اٹھتے ہیں اور کہیں ہمارا دل تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا اُس کی خوش رفتاری کہیں چاہنے والوں کی خوشیوں کا سبب بنتی ہے اور کہیں ہمارے دل پر بجلی بن کر گرتی ہے اور تباہی و بربادی کا سبب بنتی ہے۔ میر نے کیا خوب کہا ہے۔

؎ اُس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا

یا پھر بقولِ غالب

؎ دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا ! موجِ خرام یار بھی گیا گل کتر گئی !

شعر نمبر ۱۰: پیامِ حسن، پیامِ جنون، پیامِ فنا تری نگہ نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا

تشریح: اے دوست! تمہاری نگاہِ ناز عشاق پر جب مہربان ہوتی ہے تو ہر کوئی اپنے حسنِ طلب اور توفیق کے مطابق اس مہربانی سے نتائج اخذ کرتا ہے یہی نظرِ التفات کسی کے لئے حسن وجمال کا پیغام بن کر اس کے قلب ونظر میں سما جاتی ہے، یہی نگاہِ ناز کسی کو دیوانگی کا پیغام دیتی ہے اور وہ دیوانہ بن جاتا ہے اور یہی شوخ نگاہی ہمارے لئے فنا کا پیغام لاتی ہے اور ہماری تباہی دبربادی کا سامان ہو جاتا ہے۔ غرض تمہاری اک نگاہِ ناز تمہارے چاہنے والوں کو مختلف

شعر نمبر ۱۱: تمام حسن کے جلوے تمام محرومی بھرم نگاہ نے اپنے گنوائے ہیں کیا کیا

تشریح: کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جمالِ دوست کی تجلیاں جابجا بکھری ہوتی ہیں مگر انسان اپنی کم نگاہی کی بدولت پھر بھی محروم رہتا ہے یہی کچھ شاعر اپنی ذات کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے حسن وجمال کے جلوے دنیا میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ دنیا کی کون سی چیز ہے جس میں اللہ کی صفاتِ جمال موجود نہیں۔ مگر انسان کی نگاہوں کی کم نصیبی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کی آنکھیں دیکھنے کا بھرم بھی گنوا دیتی ہیں اور انسان خود کو تمام تر محروم ونامراد محسوس کرتا ہے۔

شعر نمبر ۱۲: فراقؔ راہِ وفا میں سبک روی تیری بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

تشریح: شاعر مقطع میں شاعرانہ تفاخر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے فراقؔ! راہِ عشق کی منزلیں طے کرنے کے لئے تیرا طریق کار یقیناً قابلِ تقلید اور درست ہے کہ تو مستقل مزاجی سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے گویا کامیابی سے عشق کے مراحل طے کر رہا ہے جبکہ عام طور پر عشاق کا رویہ یہ ہے کہ ابتدا میں تو بہت تیز گام ہوتے ہیں مگر پھر راہِ وفا کی صعوبتوں سے گھبرا کر اُن کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں جبکہ شاعر مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سبک روی سے راہِ وفا کی منزلیں طے کر رہا ہے اور اپنے اس استقلال اور کامیابیوں پر خوش اور نازاں بھی ہے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

سوانحی حالات: محمد حفیظ نام اور حفیظؔ تخلص تھا۔ ابوالاثر آپ کی کنیت تھی۔ حفیظ ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو مشرقی پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم جالندھر میں حاصل کی مگر کچھ نامساعد حالات اور گھریلو

ذمہ داریوں کے سبب اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے مگر اردو زبان اور شاعری سے فطری مناسبت کی بدولت محض گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور فارسی کے مشہور شاعر مولانا غلام قادر گرامی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ انہی کی فیضِ صحبت اور اپنی ذاتی کاوش سے علمی و ادبی دنیا میں اپنی شعری صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ۱۹۲۵ء کو خیرپور سندھ کے فرماں روا نے حفیظ کو تین سو روپے کے مشاہرے پر اپنا درباری شاعر مقرر کیا۔ مگر حفیظ کو درباری کی یہ زندگی پسند نہ آئی۔ اُن کی مشہور نظم "رقاصہ" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ خیرپور سے واپسی پر حفیظؔ نے لاہور میں "ہونہار بک ڈپو" کے نام سے اپنا اشاعتی ادارہ شروع کیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران حفیظ دہلی میں سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے ڈائریکٹر ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ تقسیم برِصغیر کے بعد کچھ عرصہ حفیظؔ نے آزاد کشمیر میں بھی پبلسٹی کے کام کی نگرانی کی۔ ۱۹۲۶ء میں حفیظ کا پہلا مجموعہ کلام "نغمہ زار" شائع ہوا۔ حفیظ کی شاعرانہ عظمت اور شہرت کا سبب اُن کا "شاہنامہ اسلام" ہے جس میں انہوں نے ایک طویل مثنوی کی صورت میں تاریخِ اسلام کو رقم کیا ہے اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" اُن کے دوسرے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ پھر اُن کی شاعری کا فن اُن کے گیتوں سے بھی نمایاں ہے۔ حفیظؔ کو پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کا منفرد اعزاز بھی حاصل ہوا۔ حفیظؔ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ لاہور میں گزارا، اور یہیں ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو عازمِ ملکِ عدم ہوئے اور میانی شریف کے معروف قبرستان میں مدفون ہوئے۔

محاسنِ کلام

حفیظؔ جالندھری ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ انھیں نظم و غزل ہر دو پر یکساں قدرت حاصل ہے مگر اُن کی شہرت اور مقبولیت اُن کی نظموں اور طویل مثنوی شاہنامہ اسلام کی رہینِ منت ہے غنائیت اور شگفتگی اُن کی نظموں کا خاص وصف ہے قومی اور ملّی فکر اور شاعری انہیں مولانا حالیؔ اور علامہ اقبال کے سلسلے کا شاعر بنا دیتی ہے۔ شاہنامہ اسلام نہ صرف منظوم تاریخِ اسلام ہے بلکہ اس میں حفیظؔ نے اُمتِ مسلمہ کو اُن کی عظمتِ رفتہ کے مرقعے دکھا کر دعوتِ فکر و عمل دی ہے۔ حفیظؔ منفرد لب و لہجے کا شاعر ہے انہوں نے کم پڑھا لکھا ہونے کے باوجود ذاتی کاوشوں سے شاعری میں یہ مقام حاصل کیا وہ خود کہتے ہیں۔

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے   بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

مناظرِ فطرت کی عکاسی حفیظؔ کو مناظرِ فطرت کی عکاسی اور تصویر کشی میں ملکہ حاصل ہے۔ اُن کی نظمیں اُن کی تجزیاتی صلاحیتوں کا خوبصورت اظہار ہیں۔ خاص

طور پر اُن کی طویل نظم تصویرِ کشمیر اُن کی حقیقت پسندانہ منظر نگاری کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ جس میں مشاہدے کی قوت کے ساتھ ساتھ طبقاتی اونچ نیچ کا حقیقت پسندانہ اظہار اُن کے حساس دل کی جذباتی کیفیات کا ترجمان و عکاس ہے۔ اس نظم کے بند ملاحظہ ہوں :۔

وادیٔ کہسار پر ایسی بہار آئی ہوئی ۔۔۔ نخلِ آدم زاد پر لیکن خزاں چھائی ہوئی

اس قدر خوش رنگ کلیاں اور مرجھائی ہوئی ۔۔۔ راکھ میں چنگاریاں جیسے ہوں کجلائی ہوئی

حسرت آلودہ ہے چہرہ ہر جوان و پیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اک سہانی چاندنی رات اور شالامار باغ ۔۔۔ دیکھ روشن ہو گیا ہر ایک لالے کا چراغ

خود بخود دم بھر کے رنگین پھولوں نے ایاغ ۔۔۔ عرش پر جلنے لگا پامال سبزے کا دماغ

رنگ و بو کو بھی سہارا مل گیا تشہیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حفیظ کا رنگِ تغزل حفیظ کی غزلیں اگرچہ زندگی کی نئی صورت حال سے کم تعلق رکھتی ہیں مگر اُن کی غزل میں روایت سے وابستہ رہ کر سادگی، ایک ملائم سوز و گداز کی کیفیت اور حزن و ملال کی دھیمی لہریں جاری و ساری محسوس ہوتی ہیں۔ پھر غنائی لہجے میں ذکرِ شباب اُن کے تغزل کی شان کو اور بڑھا دیتا ہے۔ حفیظ کے رنگِ تغزل کی یہ خصوصیت انہیں دوسرے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔

تم ہی نہ سن سکے اگر، قصۂ غم سنے گا کون، ۔۔۔ کس کی زبان کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

صبحدم اپنی اپنی راہ گئے! ۔۔۔ شمع کے جاں نثار، پروانے!

زہے وہ گوشۂ راحت کہ جس میں! ۔۔۔ ہجومِ رنج لے کر جا رہا ہوں

ہاں یہ ویرانہ، یہ دل، یہ آرزوؤں کا مزار ۔۔۔ تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہوں میں

غنائیت اور موسیقیت حفیظ کی شاعری میں موسیقی اور ترنم کی پُر کیف کیفیت موجود ہے، جو اُن کی مترنم بحروں، تکرارِ لفظی اور موسیقی میں دسترس کی بدولت ہے۔ ذکرِ شباب اور وہ بھی طربیہ لہجے میں حفیظ کی شاعری کا خاصہ ہے۔ پھر ہندی کے نرم اور ملائم الفاظ کے استعمال کا سلیقہ اُن کی گیت نما نظموں میں موسیقی کی گھلاوٹ اور چاشنی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں۔

"ابھی تو میں جوان ہوں" اور "جاگ سوزِ عشق جاگ" حفیظ کی غنائیت اور موسیقیت کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اِسی غنائیت کے سبب وہ مشاعروں میں اپنی غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھتے اور ہمیشہ مشاعرے لوٹتے تھے۔

؎ جوانی کے ترانے گا رہا ہوں — دبی چنگاریاں سلگا رہا ہوں

؎ یوں میں نے جیتی الفت کی بازی — اک بار کھیلا، سو بار ہارا!

؎ آنکھوں میں آنسو، لب پر تبسّم — اُن کا تصوّر، اپنا نظارا

؎ کب کیا میں نے عشق کا دعویٰ — تیرا اپنا گمان ہے پیارے

؎ میں تجھے بے وفا نہیں کہتا — دشمنوں کا بیان ہے پیارے

سادگی اور حسنِ ادا

حفیظ کی شاعری سادگی اور حسنِ ادا کا خوبصورت نمونہ ہے۔ دراصل شاعری کے آغاز کے وقت ہی اُن کے اُستادِ گرامی مولانا عبدالقادر گرامی نے انھیں لفظی صنعت گری سے پرہیز کرنے اور سادگی، سلاست اور شعر کے حسنِ معنی پر توجہ دینے کی تربیت دی تھی۔ اور حفیظ نے اپنے استاد کی ہدایات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا نتیجتاً ان کا کلام سادگی اور حسنِ ادا کا عمدہ نمونہ بن گیا اور اُن کے کئی شعر سہل ممتنع کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اور ان کی نظموں کو قبولیت کی سند حاصل ہوئی۔

؎ دل ابھی تک جوان ہے پیارے — کس مصیبت میں جان ہے پیارے

؎ ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل — مسلسل چل رہا ہوں آ رہا ہوں

؎ بلا کافی نہ تھی اک زندگی کی — دوبارہ یاد فرمایا گیا ہوں!

؎ آئینہ دیکھیے، مری صورت نہ دیکھیے — میں آئینہ نہیں مجھے حیراں نہ کیجیے

ندرتِ تشبیہ و استعارہ

حفیظ کا اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ بہت گہرا ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کی تشبیہات میں بے ساختہ پن اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ حفیظ کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ اپنے پیشِ نظر کے بیان کے لئے تشبیہ و استعارہ کے ساتھ ایسے شعری قرینے استعمال کرتے ہیں کہ اسی طرح وہی کیفیت دوسرے پر وارد ہو جاتی ہے جو خود اُن کے دل پر اثر انداز ہوتی تھی۔

؎ چراغِ خانۂ درویش ہوں میں — اِدھر جلتا، اُدھر بجھتا رہا ہوں

؎ کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں میں — پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو!

؎ عکسِ شفق نے کی ہے اس طرح زر فشانی — گھل مل کے بہہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی

حفیظ کی گیت نگاری

دنیا کی ہر زبان میں گیتوں کو معاشرت کی عکاسی اور ذوق و سرمستی کا بہترین مظہر تسلیم کیا گیا ہے اور یہ امر طے شدہ ہے کہ اردو میں گیت کی صنف کو معتبر بنانے والا حفیظ جالندھری ہے۔ اس کے گیتوں نے اردو شاعری میں ایک لذت و سرور کی نئی دنیا آباد کر دی۔ سچ تو یہ ہے کہ حفیظ نے اردو میں گیت کو وہ اہمیت اور مقام عطا کیا کہ

اردو زبان ہمیشہ اس کی ممنون رہے گی۔ حفیظ کے گیتوں میں ہندی کے نرم و ملائم لفظ اور لب و لہجے کی حلاوت رچ بس کر موسیقی کا خوبصورت آہنگ ترتیب دیتی ہے۔ "پربت کا گیت" اور "جھوٹا سب سنسار" اپنے عہد کے ہی نہیں آج کے بھی مقبول گیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔

"جھوٹا سب سنسار" کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

جھوٹا سب سنسار ہے پیارے — جھوٹا سب سنسار
تن کے اجلے، من کے میلے! — دھن کی دھن اسوار!
اوپر اوپر راہ بتائیں — اندر سے بٹ مار
پیارے، جھوٹا سب سنسار

حفیظ کی قومی و ملّی شاعری

حفیظ کی ابتدائی شاعری رومان کی شاعری ہے مگر تحریک آزادی اور امتِ مسلمہ کی زوال پذیری نے اُن کے ملّی شعور کو بیدار کیا اور اُن کی شاعری قومی امنگوں اور ملّی تقاضوں کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔ پھر حفیظ حالی اور اقبال کی فکر اور شاعری سے بھی متاثر تھے۔ شاہنامہ اسلام نہ صرف منظوم تاریخِ اسلام ہے بلکہ مسلمان قوم کی عظمتِ رفتہ کے اثرانگیز مرقعے بھی پیش کرتی ہے۔ اس طرح حفیظ نے برصغیر کے مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دی ہے۔ اُن کا لکھا ہوا پاکستان کا قومی ترانہ بھی اُن کے ملّی شعور اور قومی فکر کا زندہ جاوید شاہکار ہے۔

مقامی رنگ اور معاشرت کی عکاسی

ہماری شاعری کا المیہ رہا ہے کہ ہمارے شعرا نے اپنے اردگرد کے ماحول اور موسموں کے علاوہ معاشرت کے شاعری میں بیان کو عام طور پر توجہ کے قابل نہیں سمجھا جبکہ حفیظ کے ہاں ہمیں برصغیر کی معاشرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اور اُن کے ہاں بسنت، بہار اور برسات کے موسموں کی ہنگامہ خیزیاں خالص مقامی رنگ اور حقیقت پسندانہ انداز میں اپنی بہار دکھاتی ہیں، ہندوستانی عورت کی اس سے بڑھ کر خوبصورت ترجمانی اور کیا ہو سکتی ہے:

اٹھلا رہی ہے — اترا رہی ہے
خوبانِ ہندی ——— حورانِ ارضی ——— رونق گھروں کی
نازک دوپٹے! — رنگین ہلکے!
سر پر سنبھالے — شانوں پہ ڈھلے
مینہ لاکھ برسے — جی لاکھ ترسے
نکلیں نہ گھر سے — شوہر کے ڈر سے
اپنی نظر سے — شرما رہی ہے
اٹھلا رہی ہے — اترا رہی ہے!

ہلالِ عید

حلِ لغات ابر ۔ بادل ؛ خسر ۔ سسر ؛ ہلالِ عید ۔ عید کا چاند ؛ کلام حکیم ؛ قرآن مجید ؛ خدائے کریم ۔ کرم اور مہربانی کرنے والا خدا ؛ تار سا ۔ تار کی مانند باریک ؛ صد شکر ۔ سو بار شکر ؛ فریضۂ مغرب ۔ مغرب کی نماز ؛ عاصی ۔ گناہگار ؛ نگہ نہ کر ۔ توجہ نہ دے ؛ شانِ کریمی ۔ بخشنے اور معاف کرنے کی شان ؛ نورِ نظر ۔ آنکھوں کا نور ، مراد بیٹا ؛ بے کس ۔ بے بس اور مجبور ؛ صدقہ رسول کا ۔ رسولِ پاکؐ کے صدقے ؛

اشعار کی تشریح

تعارف زیرِ مطالعہ نظم " ہلالِ عید " میں ایک بوڑھی خاتون کے عید کے چاند کو دیکھنے کے اشتیاق کو نہایت جامعیت اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے یہ ایک ایسی خاتون ہے جس کی بینائی کمزور ہے اور جس کا بیٹا پردیس تلاشِ معاش میں گیا ہوا ہے ۔ بوڑھی خاتون اپنی بہو کی مدد سے عید کا چاند دیکھتی ہے ، نمازِ مغرب پڑھتی ہے اور اپنے بیٹے کی صحت و تندرستی کے لئے دل سے دُعا کرتی ہے ۔ نظم کی بحر نہایت رواں دواں اور شاعر کا پیرایہ اظہار نہایت دلنشیں ، موثر اور حقیقت پسندانہ ہے ۔

شعر نمبر ۱ : جیتی رہو مگر مجھے آتا نہیں نظر ۔ بیٹی ! کہاں ہے چاند ! مجھے بھی بتا کدھر

تشریح بوڑھی خاتون اپنی بہو سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ اے بیٹی ! اللہ تمہاری عمر دراز کرے مجھے صحیح طور پر دکھائی تو دیتا نہیں ، تو کہتی ہے کہ چاند نظر آ رہا ہے ذرا مجھے بھی بتا کہ بھلا ہلال عید کہاں طلوع ہوا ہے ۔

شعر نمبر ۲ : افسوس اب نگاہ بھی کمزور ہو گئی ۔ نعمت خدا نے دی تھی بڑھاپے میں کھو گئی

تشریح افسوس اللہ تعالیٰ نے بینائی کی نعمت سے نوازا تھا مگر بڑھاپے میں یہ نعمت بھی ضائع ہو گئی اور اب نظر اتنی کمزور ہے کہ کوئی چیز بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی ۔

شعر نمبر ۳ : مینار خانقاہ کے اوپر ! کہاں کہاں ۔ کچھ بھی نہیں ، کہیں بھی نہیں ، ہے وہاں کہاں

تشریح اے بیٹی ! تو کہتی ہے کہ عید کا چاند خانقاہ کے مینار کے اوپر دکھائی دے رہا ہے مگر وہاں کہاں ہے مجھے تو دکھائی نہیں دیتا کہیں تو ایسے ہی تو نہیں کہہ رہی ۔

شعر نمبر ۴ : ہاں ڈالیوں کے بیچ میں ہوگا وہیں کہیں ۔ وہ ہے جہاں پر ابر کی سرخی ہیں کہیں

تشریح ہاں وہ جو درختوں کی ڈالیاں ہیں ان کی اوٹ میں کہیں ہوگا کیا چاند وہاں تو نہیں ہے جہاں

آسمان پر بادلوں کی سرخی پھیلی ہوئی ہے۔

شعر نمبر ۵ اب ہو چکی ہے عمر بھی نو اور ساٹھ سال — گزرے ترے خسر کو بھی، گزرے ہیں آٹھ سال

تشریح اب بیٹی! کیا بتاؤں اب تو میری عمر بھی انہتر سال ہو چکی اور تمہارے سسر کو وفات پائے بھی اب تو آٹھ سال بیت چکے۔

شعر نمبر ۶ نغمے خوشی کے اور وہ زمانے گزر گئے — وہ دن گزر گئے وہ زمانے گزر گئے

تشریح بوڑھی عورت اپنے ماضی کو یاد کرتی ہوئی کہتی ہے کہ ماضی کے خوشیوں بھرے دن اور زمانے بھی اب تو بیت چکے کیا زمانہ تھا جب ہر طرف خوشیاں بکھری ہوتی تھیں اور خوشیوں کے نغمے فضاؤں میں بکھرے رہتے تھے۔

شعر نمبر ۷ تیری طرح میں بھی کبھی ہاں جوان تھی — وہ دن بھلے تھے اور بھلی ان کی شان تھی

تشریح اے بیٹی! کبھی میں بھی تیری طرح جوان تھی اور جوانی کے دِن کیا اچھے دن تھے اور جوانی کے دنوں کی کیا شان و شوکت تھی۔

شعر نمبر ۸ ہر اک سے پہلے دیکھتی تھی میں ہلالِ عید — دس بیس دن سے رہتا تھا ہر دم خیالِ عید

تشریح جوانی میں جب بھی عید آتی تو میں ہر کسی سے پہلے عید کا چاند دیکھتی تھی اور عید سے دس بیس دن پہلے ہی عید کی فکر لگ جاتی تھی اور اس کی تیاریاں شروع کر دیتی تھی۔

شعر نمبر ۹ یہ ان دنوں کی بات ہے وہ بات اب کہاں — وہ شام و صبح اور وہ دن رات اب کہاں

تشریح جن دنوں کی میں بات کر رہی ہوں وہ بات بھلا اب کہاں ہے نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ صبح و شام رہے اور نہ وہ دن رات۔ اب تو ہر چیز اور ہر بات بدل چکی ہے۔

شعر نمبر ۱۰ اب دن تمہارے، وقت تمہارا، تمہاری عید — بیٹی تمہاری عید سے ہے اب ہماری عید

تشریح بیٹی! اب تو تمہارا زمانہ ہے ہمارا زمانہ تو کب کا بیت چکا۔ اب تو سب کچھ تمہارا ہے اور تمہارے دم قدم سے ہی ہماری عید ہے۔ یعنی تم خوش اور آباد رہو تو میری بھی عید ہے۔

شعر نمبر ۱۱ ہے لاکھ لاکھ شکر خدائے کریم کا — کرتی ہوں روز ورد کلامِ حکیم کا!

تشریح اللہ تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور میں تمہاری خوشیوں کے لئے قرآنِ مجید پڑھ کر تمہارے لئے دعائیں کرتی ہوں۔

شعر نمبر ۱۲ عینک بغیر معنی و تفسیر پہ مگر — افسوس ہے کہ میری ٹھہرتی نہیں نظر

تشریح افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس بڑھاپے میں میری نظر اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ عینک کے بغیر کلامِ پاک کے معنی اور تفسیر پڑھنا میرے بس میں نہیں کیونکہ کی تحریر پر بھی میری نظر زیادہ

دیر تک ٹھہرتی نہیں اور صاف دکھائی نہیں دیتا۔

شعر نمبر ۳ او صدقے! کہاں ہے چاند مجھے بھی ذرا دکھا — میں بھی تو چاند دیکھ لوں عینک میری اُٹھا

تشریح اے میری بیٹی! میں تیرے صدقے اور قربان جاؤں! عید کا چاند کہاں ہے ذرا مجھے بھی دکھاؤ۔ ذرا میری عینک اٹھا کر مجھے دے دے تاکہ عینک کی مدد سے ہی میں عید کا چاند دیکھنے کی کوشش کروں۔

شعر نمبر ۴ ہاں ہاں وہ ہے۔ وہ تار سا، بیشک وہی تو ہے — مجھ کو نظر نہ آیا تھا اب تک، وہی تو ہے

تشریح بوڑھی عورت عینک لگا کر آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی ہے کہ اب مجھے چاند نظر آ رہا ہے وہ تار کی طرح باریک چاند جو اب تک نظر نہ آیا تھا وہ اب بھی دیکھ رہی ہوں شعر میں مکالمے کے بے ساختہ پن کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔

شعر نمبر ۵ او صد شکر چاند دیکھ لیا آ دعا کریں — اور چل کر پھر فریضۂ مغرب ادا کریں

تشریح اے میری بیٹی! اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ مجھے عید کا چاند دیکھنے کی سعادت ملی۔ آ اللہ سے دعا کریں کہ یہ نیا چاند خیر و برکت کا امین ہو اور چل کر نمازِ مغرب کا فرض ادا کریں۔

شعر نمبر ۶ یا رب ترے حضور میں حاضر کھڑی ہوں میں — عاصی گناہگار تو بے شک بڑی ہوں میں

تشریح بوڑھی خاتون اللہ کے حضور دعا کرتی ہے کہ اے میرے خدا! میں تیرے حضور نہایت عاجزی سے دعا کر رہی ہوں، اگرچہ میں نہایت گناہگار، اور خطا کار ہوں مگر پھر بھی تجھی سے دعا کرتی ہوں۔

شعر نمبر ۷ لیکن مرے گناہ و خطا پر نگہ نہ کر — یا رب تو اپنی شان کریمی رکھ نظر

تشریح اے اللہ تعالےٰ! تُو بہت غفور و رحیم ہے میں تیری شانِ کریمی پر یقین رکھتے ہوئے عرض گزار ہوں کہ تُو میری خطاؤں اور گناہوں کو نظر انداز کر کے اپنی بخشش اور عفو و درگزر کی شان کو دیکھ۔

شعر نمبر ۸ اللہ میرے چاند کی۔ نورِ نظر کی خیر — میرے کماؤ! میرے مسافر پسر کی خیر

تشریح اے اللہ تعالےٰ! میں اپنے چاند سے بیٹے اور اپنی آنکھوں کے نور کی خیر و عافیت کے لئے تجھ سے دعا کر رہی ہوں میرا بیٹا جو رزق کی تلاش میں مسافر بن کر پردیس گیا ہوا ہے۔ اے اللہ! میں اُس کی بھلائی اور خیر کے لئے دعا کرتی ہوں۔

شعر نمبر ۹ اللہ مجھ کو گھر کا اجالا نصیب ہو — بیٹا بہو کو، اور مجھے پوتا نصیب ہو

تشریح اے اللہ تعالےٰ! تو مجھے میرے گھر کا اجالا عطا کر یعنی میرا بیٹا پردیس سے خیر و عافیت سے لوٹ آئے، اے اللہ! تو میری بہو کو بیٹا اور مجھے پوتا عطا کر۔

شعر نمبر ۲:۔ بے کس کے عجز کو ملے رتبہ قبول کا سن لے مری دعاؤں کو صدقہ رسولؐ کا

تشریح: آخر میں بوڑھی عورت اپنی دعا کو سمیٹتے ہوئے کہتی ہے کہ اے اللہ! میں بہت عاجز و بے کس ہوں میری دعاؤں کو اپنے حبیبؐ اور آخری رسولؐ کے صدقے قبولیت کا درجہ عطا فرما اور میری آرزوؤں اور تمناؤں کو پورا فرما۔

غزل نمبر ۱

حلِ لغات: چاک کرنا۔ پھاڑ لینا، شعبدہ گر۔ عجیب و غریب کھیل دکھانے والا، بازی گر، برتر و بالا۔ بلند، اونچا، مراد ہے زیادہ قدر و قیمت والا، مشیت۔ مرضی، رضا،

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱:۔ غم موجود ہے۔ آنسو بھی ہیں۔ کھا تو رہا ہوں جی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

تشریح: حفیظؔ اپنی غم زدہ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کا سامنا ہے اور اسی سبب میرے آنسو بھی بہتے رہتے ہیں۔ میری زندگی کا معمول یہ ہے کہ میں غم کھاتا ہوں اور اپنے آنسو پیتا ہوں۔ دوسرا مصرعہ شدتِ غم اور بھرپور طنز کا خوبصورت امتزاج ہے کہ اے دوستو! تم اور زندگی کسے کہتے ہو میں اچھا خاصا تو جی رہا ہوں گویا ہماری زندگی غم و اندوہ کی تصویر ہے اور آنسو بہانا ہمارا معمول ہے آج تک کوئی آرزو اور خواہش بھی تو پوری نہیں ہوئی بقول شاعر۔

؎ آرزو، پھر آرزو کے بعد خونِ آرزو ایک مصرعے میں ہے ساری داستانِ زندگی

شعر نمبر ۲:۔ یارو میں نے اپنا سینہ اپنے ہاتھوں چاک کیا ہے
سچ کہتے ہو لیکن دیکھو۔ اپنے ہاتھوں سی تو رہا ہوں

تشریح: اے دوستو! تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ عشق سے رشتہ جوڑ کر میں نے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور اپنا سینہ ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہے۔ ہاں یہ اذیت اور عذاب واقعی میرا پالا ہوا ہے مگر یہ بھی دیکھو کہ میں اپنے کئے پر پشیمان نہیں ہوں اگر اپنا سینہ خود ہی چاک کیا ہے تو اب اسے سی بھی خود ہی رہا ہوں، تمہاری مدد کا طالب تو نہیں ہوں کسی سے کوئی فریاد تو نہیں کر رہا بلکہ جو عشق کا راستہ میں نے اختیار کیا ہے مشکلات کے باوجود اب بھی اس پر چل رہا ہوں۔

شعر نمبر ۳:۔ خونِ جگر آنکھوں سے نہ ٹپکا منہ سے شعلہ بن کر لپکا

شعبدہ گر ہوں مجھ پر ہنسئے۔ میں بھی ہنستا ہی تو رہا ہوں

تشریح شاعر اہلِ دنیا کے طعنوں کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عشق میں ہمارے جگر کا خون اگر ہماری آنکھوں سے نہ ٹپکا تو یہ فریاد کا شعلہ بن کر ہمارے منہ سے برآمد ہونے لگا گویا دردِ عشق کے ظہور کا کوئی ایک راستہ تو نہیں ہے۔ میری مثال تو ایک شعبدہ گر کی ہے جو کبھی کوئی کرتب دکھاتا ہے اور کبھی دوسرا اور لوگ اُس پر ہنستے ہیں میری اِن حرکتوں پر تم بھی میری ہنسی اڑاؤ کیونکہ جب عشق کا روگ نہیں لگا تھا تو میں بھی اسی طرح لوگوں کے دردِ عشق کی ہنسی اڑایا کرتا تھا، گویا جو کچھ میں نے بویا تھا آج وہی کاٹ رہا ہوں۔

شعر نمبر ۴: سیم و زر سے برتر و بالا شاید کوئی شے پا جاؤ

راکھ ذرا میری بھی کریدو کیمیا گر میں بھی تو رہا ہوں

تشریح اے دوست! میں بھی اپنی زندگی میں کیمیا گر رہا ہوں، میری ساری زندگی سونا بناتے گزری ہے اگر تمہیں کسی نہایت اعلیٰ اور سونے چاندی سے بھی قیمتی چیز کی تلاش ہے تو میرا جسم جو عشق کی آگ میں جل کر راکھ ہو چکا اُس کو کریدو، کوئی بعید نہیں تمہاری حسبِ خواہش کوئی نہایت قیمتی چیز مل ہی جائے۔ گویا شاعر کا دعویٰ ہے کہ ہماری زندگی مختلف طرح کے تجربات اور عشق کی سختیاں اور تلخیاں برداشت کرتے گزری ہے اگر تم راہِ عشق کے رموز سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو مجھ سے رجوع کرو۔ مجھ سے تمہیں وہ اصولِ زرّیں ملیں گے جو کہیں اور دستیاب نہیں ہیں۔

شعر نمبر ۵: ہاں میں حفیظ ہوں تیرا بندہ۔ بت خانے کے اندر اب تک

میری نیت پوچھتا کیا ہے تیری مشیت تھی تو رہا ہوں

تشریح غزل کے اس مقطع میں شاعر اللہ تعالےٰ کی ذاتِ گرامی سے مخاطب ہے کہ اے اللہ تعالےٰ! میں حفیظ تیرا بندہ ہوں، تیری عبادت اور بندگی میرا طریق ہے۔ اِس دنیا کے بت کدے میں جہاں ہر طرف حسین و جمیل لوگ بتوں کی سی دلربائی اور خصوصیات لئے ہوئے آباد ہیں، اگر میں نے کچھ زمانہ گزارا ہے تو یہ اس لئے ممکن ہوا کہ تیری مرضی اور مشیّت یہی تھی اور اس میں میری نیت اور ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ کیونکہ بندے تو ہمیشہ اپنے آقا کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں اِس لئے دنیا کے اس بتکدے میں میری موجودگی میری نیت اور مرضی کی بجائے تیری رضا اور حیثیت کو ظاہر کرتی ہے۔

غزل نمبر ۲

حلِ لغات دام و قفس۔ جال اور پنجرہ، صیاد۔ شکاری، قیدِ وفا۔ مراد ہے زندگی، رشتہ ٹوٹنا

تعلق ختم ہونا ؛ تارِ نفس ۔ سانسوں کا تار ؛ خار و خس ۔ کانٹے اور گھاس پھونس ؛ راہ گزار سیل ۔ دھارے کے گزرنے کا راستہ ؛ ہجر ۔ جدائی ؛ وصل ۔ ملاپ ، قرب ؛ ہوس ۔ لالچ ، حرص ؛ سازِ تعبیرِ خواب ۔ نیند میں خواب دیکھتے ہوئے انسان کے منہ سے جو آوازیں بلند ہوتی ہیں ؛ غش ہونا ۔ بے ہوش ہونا ؛ قافلۂ آرام طلب ۔ آرام کا رسیا قافلہ ؛ اندازِ خامشیِ لب ۔ لبوں کے خاموش رہنے کا انداز ؛ آوازِ جرس ۔ قافلے کی روانگی کے اعلان کے طور پر بجائی جانے والی گھنٹی کی آواز ؛ نوش ۔ شہد ، آبِ حیات ؛ نیش ۔ ڈنگ ، زہر ؛ تذکرہ ۔ ذکر ؛ مور و مگس ۔ چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں ، مراد ہے کیڑے مکوڑے ؛ کارِ مغاں ۔ شراب بیچنے والے کا کام ؛ قند کا شربت ۔ میٹھا شربت ؛ رس ۔ مٹھاس ؛ تشکیل و تکمیلِ فن ۔ شعر و ادب کے فن کو مکمل کرنے اور شکل و صورت دینا ؛

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱:

جھگڑا دانے پانی کا ہے دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں صیاد کے بس کی بات نہیں

تشریح حفیظ صیاد اور دام و قفس کی مناسبت سے صنعت مراعات النظیر کی خوبی شعر میں پیدا کرتے ہوئے زندگی کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ زندگی پر کسی کا اختیار نہیں ، نہ شکاری ہی کسی کا دانہ پانی ختم کر سکتا ہے اور نہ ہی جال اور پنجرے کی بات ہے ۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی محض قسمت اور مقدر کی بات ہے ۔ اور کسی کی دی ہوئی مصیبتوں اور تکلیفوں سے ختم نہیں ہوتی ، بلکہ قسمت میں زندگی کے جو دن جس طرح لکھے ہوتے ہیں وہ پورے ہو کر رہتے ہیں اور اپنے تمام اختیارات اور طاقت کے باوجود اللہ کے سوا کوئی کسی کی زندگی ختم نہیں کر سکتا ۔

شعر نمبر ۲:

جان سے پیارے یار ہمارے قید وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے اک تارِ نفس کی بات نہیں

تشریح شاعر مرنے والے اپنے پیارے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمارے وہ پیارے دوست جو ہمیں اپنی جان سے بھی عزیز تھے اور زندگی بھر ہم نے اُن سے اپنا خلوص کا رشتہ قائم رکھا مگر یہ پیارے دوست بھی ایک ایک کر کے ہمیں تنہا چھوڑ گئے اور وفا کی قید سے آزاد ہو گئے اور اُن کی موت محض سانس کی ڈوری کا کٹ جانا نہیں تھی بلکہ ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ اُن کی موت نے اُن سے ہمارے سارے رشتے ختم کر دیئے اور اب ہم خود کو تنہا محسوس کر رہے ہیں ۔ حفیظ کا شعر ہے ۔

؎ میری بزمِ وفا سے جانے والو ٹھہر جاؤ کہ میں بھی آ رہا ہوں

شعر نمبر ۳:- تیرا پھولوں کا بستر بھی راہ گزار سیل میں ہے
آقا! اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں!

تشریح: اس میں شک نہیں کہ عام طور پر کمزور لوگ ہی گردشِ زمانہ کی زد میں ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی یوں ہی بپھرے ہوئے طوفان غریب کے جھونپڑے کے ساتھ محلِ شاہی کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے ہیں۔ شاعر ایسے ہی طوفان کو مصروفِ عمل دیکھتا ہے تو حاکمِ وقت کو طنزاً مخاطب ہوتا ہے کہ آقا! وہ وقت گیا جب مجھ جیسے غریبوں کے گھر اور جھونپڑے ہی طوفان کی نذر ہوتے تھے۔ اس بپھرے ہوئے سیل خانہ کی زد میں تو آپ کے آراستہ ایوان اور پیراستہ خواب گاہیں بھی ہیں اور ہمارے جھونپڑے کے ساتھ آپ کے بلند و بالا محلات بھی تباہی کا منظر پیش کریں گے۔

شعر نمبر ۴:- دونوں ہجر میں رو دیتے ہیں دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہچانے عشق ہوس کی بات نہیں

تشریح: یہاں حفیظؔ نے حسن اور عشق کے لفظ محبوب اور عاشق کے لئے استعمال کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عشق میں طالب و مطلوب دونوں ہی ایک دوسرے کی کمی محسوس کرتے ہیں دونوں ہی فراق و ہجر کی گھڑیوں میں ایک دوسرے کے غم میں آنسو بہاتے ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کی قربت کے خواہاں ہیں۔ لیکن محبوب کی احتیاط اور ہچکچاہٹ محض اس وجہ سے ہے کہ وہ عشق کی صداقتوں اور حرص و ہوس میں تمیز کرنے میں مشکل پاتا ہے اور یہی مشکل اسے عاشق سے دوری پر مجبور کرتی ہے۔

شعر نمبر ۵:- سازِ نفیرِ خواب سے غش ہے قافلۂ آرام طلب
اندازِ خاموشی لب آوازِ جرس کی بات نہیں!

تشریح: سارا قافلہ تو آرام طلبی کا شکار ہے اور عالمِ خواب میں سانسوں کی موسیقی کے نشے میں چور ہے۔ شاعر نے سوتے ہوئے سانسوں کے زیر و بم کو سازِ نفیر کہا ہے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں لبوں پر خاموشی کی مہر ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں جب اہلِ قافلہ خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوں۔ اپنے سفر اور منزل سے بے نیاز ہو چکے ہوں تو پھر بھلا قافلے کی روانگی کے لئے جرس کی بات ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ گویا جب پوری قوم ہی اپنے گوہرِ مقصود کو پانے کے لئے جد و جہد کو ترک کر کے خوابِ غفلت میں ڈوب جائے تو محض دعوت کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

شعر نمبر ۶:- نوش ہے عنوان، نیش نتیجہ! ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے انسانوں کا یہ مور و مگس کی بات نہیں!

تشریح شاعر انسان کے دوہرے کردار پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسانی زندگی کے سبھی معاملات میں انسان قول اور فعل کے تضاد کا شکار ہے اور اس کے ظاہر و باطن کے اسی تضاد کی وجہ سے عجیب و غریب قصے جنم لیتے ہیں، ان بظاہر خوبصورت افسانوں کا عنوان شہد اور آب حیات کی مٹھاس اور لذت اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے جبکہ نتائج زہرناک اور خطرناک ڈنگ کی مانند ہوتے ہیں گویا ہم انسان جو اشرف المخلوقات کے منصب پر فائز ہیں زہر بھی آب حیات اور شہد بتا کر پلا دیتے ہیں ہم سے تو پھر کیڑے مکوڑے اور مکھیاں ہی بہتر ہیں جن کی صفات تو متعین ہیں اور ان سے وہ روگردانی نہیں کرتے۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے کہ

~ چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق　　　آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے

شعر نمبر ۷:
کارِ مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں خالی رس کی بات نہیں

تشریح حفیظ نام نہاد شاعروں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح قند کا شربت بیچنے والے کو شراب بیچنے والے　　کا ہنر نہیں آتا اور وہ کارِ مغاں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں اسی طرح غزل کہنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ شاعر کہلانے والے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر غزل میں لفظوں اور لہجے کی مٹھاس اور رس شامل کر دیا جائے تو غزل گوئی کا فن آ جاتا ہے تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ بھائی لوگو! غزل خالی خولی اس کا نام نہیں بلکہ اس میں تو تلخی اور مستی کے جذبوں اور احساسات کو بھی شامل کرنا پڑتا ہے تب کہیں غزل کے شعر تر کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

شعر نمبر ۸:
تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

تشریح حفیظ شاعرانہ تفاخر اور تعلّی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج اگر مجھے شعر و ادب کے فن میں کوئی مقام حاصل ہے، فنِ شعر گوئی کی تعمیر و تشکیل میں میری کاوشوں کو سراہا جاتا ہے اور شاعری کو اس مقام تک لانے میں میرا حصہ تسلیم کیا جاتا ہے تو مجھے یہ حیثیت اور مقام دو چار سال کی محنت سے حاصل نہیں ہو گیا بلکہ مجھے اردو کی خدمت کرتے آدھی صدی گزر چکی تب کہیں میری اس حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

حفیظ کا ہی شعر ہے کہ:-

~ حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اختر شیرانی

برکھارت (مسوری جاتے ہوئے)

حلِ لغات ابر پارے - بادلوں کے ٹکڑے ؛ نو بہار - جس پر نئی نئی بہار آتی ہے ؛ کوہسار - پہاڑی سلسلے ؛ بیخود و بے تاب - بے چین و بے قرار ؛ رود بار - کئی نہروں کے نکلنے کی جگہ - مراد ہے کئی نہریں ؛ میگسار - شرابی ؛ بادہ خوار - شرابی ؛ حجاب - شرم ، حیا ؛ نور پارہ - نور کا ٹکڑا ، مراد ہے نہایت خوبصورت ؛ سفینے - کشتیاں ؛ بادبان - جہاز اور کشتی کی پال ؛ پیچ و خم کھانا - بل کھانا - چکر کھانا ؛ خمیدہ - جھکا ہوا ؛ چار سُو - چاروں طرف ؛ مرغزار - سبزہ زار ؛ الامان - اللہ اپنی پناہ میں رکھے ؛ الحذر - اللہ بچائے ؛ ماہ پارہ - چاند کا ٹکڑا ، مراد ہے نہایت خوبصورت ؛ مخمور - نشیلی ؛ حسن نازنین - نازک اندام حسینہ ؛

اشعار کی تشریح و تعارف

تعارف زیرِ مطالعہ نظم "برکھارت" صنفِ شاعری کے اعتبار سے مستزاد کہلاتی ہے۔ مستزاد کے معنی "زیادہ کیا گیا" کے ہیں اصطلاح میں مستزاد اُس غزل یا رباعی کو کہتے ہیں جس کے مصرعوں کے آخر میں ایک، ایک موزوں فقرہ یا ٹکڑا بڑھا دیا جائے جو فقرہ بڑھایا جائے اُس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ جس مصرعہ میں بڑھایا جائے اس کے وزن اور بحر میں ہو۔ زیرِ مطالعہ مستزاد غزل کی فارم میں ہے اختر شیرانی نے اہتمام یہ کیا ہے کہ ہر مصرعے کے آخر میں جو ٹکڑا بڑھایا ہے وہ اسی مصرعے کی ردیف اور قافیہ میں ہے۔ نظم میں مسوری جاتے ہوئے برسات میں بھیگتے مناظر کا نہایت دلکش منظر کھینچا گیا ہے۔

بند نمبر ۱: آسمان پر چھا رہا ہے ابر پاروں کا ہجوم — نو بہاروں کا ہجوم !
آہ یہ رنگین آوارہ نظاروں کا ہجوم — کوہساروں کا ہجوم !

تشریح موسمِ برسات میں آسمان کا منظر کیا حسین و دلکش ہے کہ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے جمع ہو رہے ہیں جو اپنی نئی جوانی کی ترنگ دکھا رہے ہیں آسمان پر اِدھر اُدھر آزادی سے بکھرے ہوئے اِن رنگین نظاروں کا منظر اپنی بہار دکھا رہا ہے اور کچھ پہاڑی سلسلے ہیں جو اپنی رنگینیوں سمیت آسمان کی وسعتوں میں پھیل گئے ہیں۔

بند نمبر ۲: بدلیاں ہیں یا کسی کے جیسے بسرے خواب ہیں — بیخود و بے تاب ہیں !

یا ہوا پر تیرتا ہے رود باروں کا ہجوم — آبشاروں کا ہجوم!

تشریح آسمان پر مصروفِ خرام بادلوں کے یہ ٹکڑے بھولے بسرے خوابوں کی مانند بے چین و بے قرار اور خوبصورت لگتے ہیں۔ یہ بادل ہیں یا آسمان میں آبشاروں اور نہروں نے اپنے ڈیرے لگا دیئے ہیں۔ برستے بادل آبشاروں کے گراتے ہوئے پانی کا منظر پیش کرتے ہیں۔

بند نمبر ۳: پھرتی ہیں آوارہ متوالی گھٹائیں اسطرح — اور ہوائیں اس طرح
جھومتا پھرتا ہو جیسے میگساروں کا ہجوم — بادہ خواروں کا ہجوم

تشریح ہواؤں کے کندھوں پر سوار بدلیاں آسمان کے طول و عرض میں یوں جھومتی پھرتی ہیں جیسے شرابی شراب کے نشے میں چور لڑکھڑاتے اور جھومتے پھر رہے ہوں۔

بند نمبر ۴: نیلگوں پریاں افق میں پر ہیں پھیلائے ہوئے — بال بکھرائے ہوئے
یا امنڈ آیا ہے ساون کی بہاروں کا ہجوم — ابر پاروں کا ہجوم

تشریح دور افق پر جہاں زمین آسمان ملتے نظر آتے ہیں نیلے نیلے بادل یوں محسوس ہوتے ہیں۔ جیسے نیلے لباسوں میں پریاں اپنے بال بکھرائے رقص کر رہی ہوں یا ساون کے بادل اپنی بہار دکھا رہے ہوں۔

بند نمبر ۵: ننھی ننھی بوندیں گرتی ہیں حجاب ابر سے — یا نقاب ابر سے
چھن رہا ہے قطرے بن بن کر ستاروں کا ہجوم — نور پاروں کا ہجوم

تشریح بادلوں سے چھوٹی چھوٹی بوندیں کچھ اس طرح گر رہی ہیں جیسے بادل اپنے نقاب کے پیچھے سے قطروں کے موتی برسا رہا ہو تو یہ قطرے سورج کی روشنی میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ بادلوں سے زمین کی طرف نور کے چمکدار ٹکڑے آہستہ آہستہ بڑھے آ رہے ہوں۔

بند نمبر ۶: یہ گھٹائیں ہیں کہ خوابوں کے سفینے ہیں رواں — بے قرینے ہیں رواں
بادبانوں میں چھپائے چشمہ ساروں کا ہجوم — جوئباروں کا ہجوم

تشریح آسمان کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے یہ بادل ہیں یا خوابوں کی خوبصورت کشتیاں نیند کی سطح پر بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر گھوم رہی ہیں اور ان کشتیوں کے بادبانوں میں چشمے اور ندیاں پوشیدہ ہیں جن سے پانی بہہ رہا ہے۔

بند نمبر ۷: بجلی ہے یا نور کی زنجیر لہراتی ہوئی! — پیچ و خم کھائی ہوئی
یا خمیدہ مرمری پھولوں کے ہاروں کا ہجوم — اور ستاروں کا ہجوم

تشریح برستے بادلوں میں جب بجلی کوندتی ہے تو اس کا لپکنا یوں لگتا ہے جیسے کوئی چمکتی ہوئی زنجیر کو بل دے کر لہرا رہا ہو اور کبھی یہ چمکتی بجلی خوبصورت نازک پھولوں اور روشن ستاروں

کے ہاروں کی مانند لگتی ہے جیسے کسی کے بے قرار ہاتھ بدلیوں کے گلے میں پہنانے کی کوشش میں لرز رہے ہیں۔

بند نمبر ۸: کوہساروں میں خوشی کی بستیاں آباد ہیں — مستیاں آباد ہیں!
چار سو بکھرا پڑا ہے سبزہ زاروں کا ہجوم — مرغزاروں کا ہجوم!

تشریح: برسات کیا آئی ہے کہ پہاڑوں پر ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے اور ہر کوئی نشے میں جھوم رہا ہے۔ برستے پانی میں پہاڑوں کے سبزہ زار اور نشیب و فراز اور بھی سبز اور دلکش ہو گئے ہیں۔

بند نمبر ۹: یہ سفر، یہ رات، یہ برسات اور پھر ہم سفر — الامان والحذر!
ایک حسن یاسمین، رنگین بہاروں کا ہجوم — ماہ پاروں کا ہجوم!

تشریح: برسات کی اس خوبصورت رات میں میری خوش نصیبی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ میرا ہم سفر وہ محبوب ہے جس کا حسن بہاروں کی رنگینیوں کو شرماتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے اُسے چاند کے روشن ٹکڑوں سے بنایا ہو اور اللہ ہی اس حسن کی فسوں کاری سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

بند نمبر ۱۰: آہ یہ مخمور آنکھیں، مست سی، بے خواب سی — نیند میں بیتاب سی!
جن سے چھلکا پڑ رہا ہے حشر پاروں کا ہجوم — فتنہ زاروں کا ہجوم!

تشریح: اپنے اس حسین ہم سفر کی نیند کے لئے بے چین و بے قرار آنکھوں کی مستی اور خمار کی تصویر کیسے کھینچوں مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ان آنکھوں سے قیامت برپا کرنے والا کیف و سرور اور فتنے کھڑے کرنے والا نشہ چھلک رہا ہے۔

بند نمبر ۱۱: آہ یہ شاداب چہرہ اور یہ حسن نازنین — اف یہ جسم یاسمین!
جیسے یکجا ہو سمٹ کر نو بہاروں کا ہجوم — اور ستاروں کا ہجوم!

تشریح: اس حسنِ مجسّم کے تر و تازہ اور شاداب چہرے کی دلکشی، اُس کی آنکھوں کی دلفریبی اور اُس کے یاسمین کی مانند معطر جسم کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تازہ بہاروں کی رنگینیوں اور ستاروں کی چمک دمک اس محبوب کے خدوخال میں سمٹ آئے ہوں۔

بند نمبر ۱۲: یہ سہانے منظر اختر مدتوں یاد آئیں گے! — مدتوں تڑپائیں گے!
آہ یہ رات، اف یہ مستانہ نظاروں کا ہجوم — یہ بہاروں کا ہجوم!

تشریح: اے اختر! برکھا رت کی یہ بہار، مناظر فطرت کی دلکشی، رات کے اس سفر میں جمالِ ہم سفر کی یاد ہمارے دل سے کبھی نہ بھولے گی اور مدتوں یہ یاد ہمیں تڑپاتی رہے گی اور سفر کی یہ رات اور اسکے مست کرنے والے نظارے ہماری زندگی کا ایک ایسا یادگار واقعہ ہیں جو کبھی ہمارے دل سے محو نہ ہو گا۔

سید محمد جعفری

بور

حلِ لغات تقدیر کی گردش - بدنصیبی ؛ زندہ در گور ہونا - جیتے جی مرجانا - سخت مصیبت میں مبتلا ہونا ؛ پالا پڑنا - واسطہ پڑنا ؛ مروّت - لحاظ ، پاسداری ؛ مردم بیزار - انسانوں سے اُکتایا ہوا ؛ جان کو آجانا - سخت ناراض ہونا ، غصے میں ہونا ؛ معتقد - اعتقاد اور یقین رکھنے والا ؛ بادیہ پیمائی - جنگل اور صحرا میں پھرنا ؛ یکتائی - انفرادیت ؛ عیادت کرنا - تیمارداری کرنا ؛ شہ زور - طاقتور ؛ عنایت - مہربانی ؛

اشعار کی تشریح و تعارف

تعارف سید محمد جعفری اردو کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں - زیرِ مطالعہ نظم میں انھوں نے ایک ایسے شخص کا احوال طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے جو اپنی کم عقلی ، بسیار گوئی اور بد سلیقگی کی بدولت ہر کسی کو بور کرتا ہے یہاں تک کہ اُس کے ملنے جلنے والے بھی اُس سے ملنے سے کتراتے ہیں - نظم کی بحر نہایت رواں دواں اور اندازِ بیاں دلکش ہے -

بند نمبر ۱ : جان پہچان ہے اس سے تو نہیں چلتا ہے زور   میری تقدیر کی گردش نے بنایا اسے بور
جو ملا اس سے سمجھ لو ہوا زندہ در گور   نہ وہ ہنستا ہے نہ روتا ہے نہ کر سکتا ہے شور

جس کا پالا پڑا اس بور سے جاں سے گزرا
آنکھ میں جس کی مروت ہو جہاں سے گزرا

تشریح شاعر اپنی بدنصیبی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بدبختی اور تقدیر کی گردش ہی کا نتیجہ ہے کہ میری جان پہچان کا یہ شخص نہایت ہی بیزار کرنے والا بور بن گیا چونکہ اُس سے دوستی کا تعلق پیدا ہو چکا ہے اس لئے اس پر ہمارا کوئی زور ہی نہیں چلتا جس شخص کی بھی ایک دفعہ اس سے ملاقات ہو گئی یوں سمجھ لو کہ وہ جیتے جی مر گیا اُس سے ملاقات کے بعد وہ زندگی سے اِس حد تک بیزار ہو چکا ہو گا کہ ہنسنا مسکرانا یا رونا تو ایک طرف رہا کوئی بات کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہو گا - غرض جس کی کا بھی اُس بور سے واسطہ پڑ گیا وہ فوراً زندہ در گور ہو گیا اور اُس کے جس ملنے والے کی آنکھ میں لحاظ اور مروت قسم کی چیز ہو گی وہ تو یقیناً اُس کی بور باتیں سُن سُن کر بالآخر اس دنیا سے ہی کوچ کر جائے گا -

بند نمبر۲:- دور سے بور سڑک پر جو نظر آتا ہے
اس سے واقف جو ہے وہ دیکھ کے گھبراتا ہے
اپنی سمت آتا ہوا دیکھے تو کتراتا ہے
راستہ چھوڑ کر گلیوں میں نکل جاتا ہے
بور کر دیتا ہے انسان کو مردم بیزار!
سب کو معلوم ہے وہ ڈھونڈتا پھرتا ہے شکار

تشریح: سڑک پر چلتے ہوئے اگر دور سے یہ بور شخص نظر آجائے تو اُس کا ہر واقف کار اُسے دیکھ کر گھبرا جاتا ہے کہ اب اُس کی اکتا دینے والی باتوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اور جب وہ بور کو اپنی طرف آتا دیکھے گا تو اپنا راستہ بدل کے گلیوں میں نکل جانے میں عافیت سمجھے گا تاکہ اُس سے ملاقات کی صورت ہی پیدا نہ ہو کیونکہ اُسے مل کر تو انسان انسانوں سے بیزار اور متنفر ہو جاتا ہے اور پھر اُس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنا شکار تلاش کرتا رہتا ہے تاکہ اُسے اپنی گفتگو سے اتنا بیزار کرے کہ وہ مردم بیزار بن کر ہی اُٹھے۔

بند نمبر۳:- راستہ چلتے ہوئے جس سے بھی ٹکراتا ہے
ٹھہر جاتا ہے وہیں جان کو آجاتا ہے
سن چکا ہوں جو لطیفے انھیں دہراتا ہے
اور ہنسانے کی بجائے مجھے رلواتا ہے
وقت کو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سرمایہ ہے
بور کے حصے میں لیکن یہ بہت آیا ہے

تشریح: راہ چلتے اگر اس کی کسی جان پہچان والے سے ملاقات ہو جائے تو وہ وہیں اُسے کھڑا کر کے اپنی بور گفتگو شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ ملنے والا غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے کیونکہ وہ ہزار مرتبہ سُنے ہوئے گھسے پٹے بور لطیفے سناتا ہے جنھیں سن کر ہنسنے کی بجائے رونے کو جی چاہتا ہے۔ دانا لوگ وقت کو بہت بڑی دولت اور سرمایہ قرار دیتے ہوئے نصیحت کرتے ہیں کہ وقت کی قدر کرو۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ بور کے حصے میں ضائع کرنے کے لئے وقت کی کوئی کمی نہیں۔

بند نمبر۴:- بور کو دیکھ کے گھبراتے ہیں اکثر انساں
وہ نکل بھاگیں گے اس جلسے سے وہ جائے جہاں
بور اگر چاہے اگر چہ میں بھی ہو وہ خالی مکاں
بلکہ ہو جائیں محلے کے محلے ویراں
معتقد اس نے کیا بادیہ پیمائی کا
سب کو مقبول ہے دعویٰ ای یکتائی کا

تشریح: بور آدمی کو دیکھ کر ہر ذی شعور انسان پریشان ہو جاتا ہے جہاں کہیں یہ بور شخص ہو گا۔ عقلمند لوگ وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت محسوس کریں گے۔ اسے دیکھ کر لوگ کیسے بدکتے ہیں، اس کا اندازہ اِس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر یہ بور کراچی میں کسی خالی مکان کی تلاش

میں نکل کھڑا ہو تو اُس سے مڈبھیڑ ہونے سے بچنے کے لئے لوگ کئی محلے خالی کر جائیں گے۔ لوگ اس کے پڑوس میں رہنے سے جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھاننا برداشت کریں گے انھیں دیوانگی قبول ہوگی مگر اس بور سے ملاقات منظور نہیں۔

بند نمبر ۵: بور نہ کرے بور ہمیں گر تو عنایت ہوگی ورنہ محرومیٔ قسمت سے شکایت ہوگی
جس کو وہ بور کرے اسکی حمایت ہوگی بلکہ جس سے وہ ملا اس کی عیادت ہوگی
کاش اس بور سے بڑھ کر کوئی شہ زور ملے
جو اسے بور کرے ایسا کوئی بور ملے

تشریح: اگر یہ بور شخص ہمیں اپنی بوریت سے بچائے رکھے تو یہ اُس کی عین نوازش ہوگی ورنہ ہمیں اپنی بدنصیبی کا گلہ رہے گا۔ اب تو ہم نے یہ سوچا ہے یہ شخص جس کسی کو بھی بور کرے گا ہم نہ صرف اس کی حمایت کریں گے بلکہ اس کی خیریت دریافت کرنے کے لئے اور اظہارِ ہمدردی کے لئے اُس کے پاس جائیں گے۔ اے کاش ایسا ہوتا کہ اس بور شخص سے بھی زیادہ بور کرنے والا شخص کوئی ہوتا اور وہ اس بور کو اپنی بوریت سے سبق سکھاتے تو اسے پتہ چلے کہ جب انسان بور ہوتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔

شعر نمبر ۶: بور کو بور جو کردے اسے بلواؤں گا لطف آئے گا جو دو بوروں کو ٹکراؤں گا
اولاً یہ کہ بڑا بور کہاں پاؤں گا دوسرے ڈر ہے کہ دو بوروں میں پھنس جاؤں گا
فرض کر لیجئے اک بور گیا بھی مارا
دوسرے بور سے ممکن ہی نہیں چھٹکارا

تشریح: اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اس کو بور کرنے والا بھی کوئی صاحبِ فن موجود ہے تو میں اُس بور کو اس بور سے ملوانے کا بندوبست کروں گا، اور پھر جب یہ دونوں ایک دوسرے کو بور کرنے کے جتن کریں گے تو یہ کیا ہی لطف کا معرکہ ہوگا، مگر مشکل یہ ہے کہ اس بور سے بڑا بور ڈھونڈنا بھی تو مشکل کام ہے اور فرض کیجئے اگر ایسا کوئی شخص مل بھی گیا تو ملاقات کرواتے وقت خطرہ ہے کہ ان دو بوروں میں نہ پھنس کر رہ جاؤں۔ پھر یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ اگر اس معرکے میں ایک بور مارا بھی گیا تو پھر بھی ایک بور بچ جائے گا اور پھر اُس سے جان بچانی ناممکن ہو جائے گی۔

ن ۔ م ۔ راشد

اجنبی عورت

حلِ لغات دور افتادہ ۔ دور دراز ؛ شبستان ۔ آرام گاہ ، عشرت گاہ ؛ رومان ۔ عشق کی داستان ؛ دیوارِ ظلم ۔ زیادتی کی دیوار ، رکاوٹ ؛ حائل ہونا ۔ بیچ میں ہونا ، آڑ ، رکاوٹ ؛ خیاباں ۔ کیاریاں ، باغ ؛ لالہ زار ۔ جہاں گُلِ لالہ اُگے ہوں ، مراد ہے پھولوں کی جگہ ؛ نوحہ خواں ۔ مرثیے پڑھنے والا ۔ ماتم کرنے والا ؛ دستِ غارت گر ۔ تباہی کرنے والے کے ہاتھ ، دشمن کے ہاتھ ؛ نہاں خانہ ۔ پوشیدہ جگہ ، تہہ خانہ ؛ سیہ پیکر ، حبشی ؛ راہرو ۔ مسافر ، راہی ؛ زہر خند ۔ ناگواری اور شرمندگی کی ہنسی ؛ مشتعل ۔ بے قابو ، نہایت غصّے میں ؛ سیلابِ عظیم ۔ بہت بڑا سیلاب ؛ ارضِ مشرق ۔ مشرقی تہذیب کی حامل سرزمین ؛ مبہم ۔ غیر واضح ؛ لرزاں ۔ کانپتا ہوا ؛ حرمت ۔ عزت ، آبرو ، عظمت ؛ بے باک ۔ بے خوف ، دلیر ؛

نظم کی تشریح و تعارف

تعارف یہ نظم ہیئت کے اعتبار سے نظمِ آزاد ہے ۔ نظمِ آزاد میں ردیف اور قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی ۔ اگر کہیں کہیں یہ اہتمام ہو بھی تو کسی مسلّمہ قاعدے کے مطابق نہیں ہوتا ۔ البتہ ساری نظم کسی ایک ہی بحر اور وزن میں ہوتی ہے ۔ مختلف مصرعوں میں ارکان کی تعداد کم یا زیادہ ہو سکتی ہے اسی لئے آزاد نظم کے کچھ مصرعے بڑے اور کچھ چھوٹے ہوتے ہیں ۔ ن ۔ م ۔ راشد نظمِ آزاد کے بانیوں میں سے ہیں ۔ اُن کی زیرِ مطالعہ اس نظم " اجنبی عورت " میں ایک تصوراتی اور تسکین بخش رفاقت سے محرومی کا نوحہ بیان کرتے ہوئے شاعر اُن اسباب اور وجوہات کا ذکر کرتا ہے جن کی وجہ سے انسان اپنا گوہرِ مقصود پانے میں ناکام رہتا ہے ۔

شعر نمبر ۱ تا ۱۲

ایشیا کے دور افتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں !
کاش اک دیوارِ ظلم
میرے ان کے درمیان حائل نہ ہو ۔
یہ عماراتِ قدیم
یہ خیاباں ، یہ چمن ، یہ لالہ زار

چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دست غارت گر سے ہیں
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں
کاش اک "دیوار رنگ"
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو

تشریح: ایشیا کے اِن دور دراز علاقوں میں واقع جس عشرت گاہ میں میں زندگی گزار رہی ہوں۔ ان میں بھی میرے خوابوں کی طرح خوبصورت اور میرے آئیڈیل کے مطابق کوئی رومان اور عشق کی گہما گہمی موجود نہیں ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ میرے اور میرے خوابوں کے درمیان سماج کی کوئی دیوار اور ظلم کی کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوتی تو کچھ اور ہی بات ہوتی۔ اس عشرت گاہ کی قدیم عمارتیں اور اس کے باغ، سبزہ زار اور پھولوں سے بھری ہوئی کیاریاں اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود کسی اجنبی کی غارت گری کی بدولت چاندنی رات میں ماتم و گریہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی ظاہری خوبصورتی اور زیب و زینت کے باوجود ان عشرت گاہوں میں بھی میرے خوابوں کے مطابق کوئی رومان، کوئی کشش اور کوئی جاذبیت نہیں۔ گویا گزرتی زندگی میری خواہشوں اور مرضی کے مطابق نہیں گزر رہی بلکہ زندگی کے دن ایک مجبوری کی نذر ہو رہے ہیں۔ کاش ایسا ہوتا کہ میرے اور اُن کے درمیان رنگ و نسل اور سماج کی دیوار حائل نہ ہوتی تو ممکن ہے میرے لئے اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی۔

مصرعہ نمبر ۱۳ تا ۲۱:

یہ سیہ پیکر برہنہ راہرو
یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہر خند
یہ گزرگاہوں پہ دیو آسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل بے باک مزدوروں کا سیلاب عظیم!
ارضِ مشرق، ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں

تشریح: میرے اردگرد پھیلے ہوئے ماحول میں وہ عجیب و غریب لوگ ہیں، ننگے بدن جبشی ہیں کہ

معروفِ سفر ہیں، گھروں میں مقیّد خوبصورت مگر بدنصیب عورتیں ہیں جو اپنی ناگواری اور شرمندگی کے باوجود مجبوری کی ہنسی ہنسنے پر مجبور ہیں اور انتہائی رنج و غم آشنا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو خوش و خرّم ظاہر کرنے پر مجبور ہیں۔ پھر یہ راستوں میں پھیلے ہوئے دیووں جیسی جسامت والے مکروہ چہرہ جوان ہیں جن کی بھوکی آنکھوں میں اُن کی ناتمام اور تشنہ خواہش اور آرزوئیں صاف دکھائی دیتی ہیں اور بے شمار مزدوروں کا ایک سیلاب ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ جس میں بے خونی اور غصّے کی بھری ہوئی لہریں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ اسی مشرق کی سرزمین پر ہو رہا ہے جو مشرقی تہذیب و تمدن اور روایات کی گہوارہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی لئے مشرق کی سرزمین ایک اَن جانے خوف سے کانپ رہی ہے کیونکہ آج تک ہم اپنی جن خواہشوں کی آبرو اور عظمت کے لئے اہلِ مغرب کے خلاف صف آرا رہے ہیں آج انھیں روایات اور اقدار کا نام و نشان تک مشرق کی سرزمین سے اُٹھ گیا ہے۔

ن۔م۔راشد کی زیرِ مطالعہ نظم کا عنوان "اجنبی عورت" دراصل نئی مگر اجنبی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے اور شاعر اس علامت کے حوالے سے اُس بدیسی تہذیب سے (جو غلامی کے سبب سے ایشیا کا مقدر ٹھہری) اپنی بیگانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایشیا کی وہ تہذیب جس میں کبھی حسین خوابوں کے رومان پرورش پاتے اور پروان چڑھتے تھے اب اس اجنبی تہذیب کے ہاتھوں اپنی پہچان اور شناخت کھو چکی ہے۔

وزیرے چنیں

حلِ لغات نادر۔ انوکھا ؛ گراں تر۔ زیادہ قدر و قیمت والا ؛ مردِ دانا۔ عقل مند آدمی ؛ ذہینِ رسا۔ بات کی تہہ تک پہنچنے والا ذہن ؛ زنگ آلودہ۔ پرانا ؛ کاسۂ سر۔ سر کا پیالہ، کھوپڑی ؛ آلائشیں۔ میل کچیل، غلاظت، گندگی ؛ کامل۔ ماہر ؛ وزیرِ کہن سال۔ بوڑھا وزیر ؛ از سرِ نو۔ نئے سرے سے، پوری طرح ؛ ناگاہ۔ اچانک ؛ جنابِ وزارت پنہ۔ جنابِ وزیر صاحب ؛ سراسیمہ ہونا۔ گھبرانا، پریشان ہونا ؛ دلاّک۔ نائی ؛ تقاضا کیا۔ مطالبہ کیا ؛ حیف۔ افسوس ؛ روزنِ در۔ دروازے کا سوراخ ؛ دماغِ فلک ناز ؛ وہ دماغ جس پر فلک بھی ناز کرے ؛ حکمِ سرکار۔ سرکار کا حکم، مراد ہے آپ کا حکم ؛ دانیالِ زمانہ۔ زمانے بھر کی عقل والا۔ دانیال ایک پیغمبر کا نام ہے ؛ فراست، عقل و دانش ؛ کاروبارِ وزارت۔ وزارت کا کام ؛ چاک و چوبند تر۔ پہلے سے زیادہ تیز طرّار، فعّال ؛

نظم کی تشریح و تعارف

تعارف اس آزاد نظم میں ن۔م۔ راشد نے الف لیلائی داستانوں میں سے ایک داستان نہایت رواں دواں انداز اور دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے اور یہ ایک ہزار راتوں میں سے سات سو آٹھویں رات ہے جس میں شہرزاد (ایک خاتون کا نام) شہزادے کو سات سو آٹھویں کہانی سناتی ہے جو ایک وزیر باتدبیر کی عقل و دانش کے بارے میں طنز ہے۔

نظم: ..... تو جب سات سو آٹھویں رات آئی۔
تو کہنے لگی شہرزاد
اے جواں بخت
شیراز میں ایک رہتا تھا نائی
وہ نائی تو تھا ہی
مگر اس کو بخشا تھا قدرت نے
اک اور نادر، گراں تر ہنر بھی،
کہ جب بھی،
کسی مرد دانا کا ذہن رسا،
زنگ آلود ہونے کو آتا
تو نائی کو جا کر دکھاتا،
کہ نائی دماغوں کا مشہور ماہر تھا،
وہ کاسۂ سر سے ان کو الگ کر کے
ان کی سب آلائیش پاک کر کے
پھر اپنی جگہ پر لگانے کے فن میں تھا کامل!
خدا کا: یہ کرنا ہوا،
ایک دن
اس کی دکاں سے
ایراں کا اک وزیر کہن سال گزرا
اور اس نے بھی چاہا
کہ وہ بھی ذرا

اپنے الجھے ہوئے ذہن کی
از سرِ نو صفائی کرائے!
کیا کاسۂ سر کو نائی نے خالی،
ابھی وہ اسے صاف کرنے لگا تھا
کہ ناگاہ آکر کہا ایک خواجہ سرا نے
"میں بھیجا گیا ہوں جناب وزارت پنہ کو بلانے"
اور اس پر
سراسیمہ ہو کر جو اٹھا وزیر ایک دم
رہ گیا پاس دلاک کے مغز اس کا
وہ بے مغز سر لے کے دربار سلطاں میں پہنچا
— مگر دوسرے روز اس نے
جو نائی سے آکر تقاضا کیا
تو وہ کہنے لگا
حیف!
کل روز پڑوسی کی بلّی
کسی روزن در سے گھس کر
جناب وزارت پنہ کے
دماغ فلک تاز کو کھا گئی ہے!
اور اب حکم سرکار ہو تو،
کسی اور حیوان کا مغز لے کر لگا دوں؟
تو دلاک نے رکھ دیا،
دانیالِ زمانہ کے سر میں،
کسی بیل کا مغز لے کر!
تو لوگوں نے دیکھا
جناب وزارت پنہ اب
فراست میں
دانش میں

اور کاروبارِ وزارت میں ،

پہلے سے بھی چاق و چوبند تر ہو گئے ہیں !

تشریح شہرزاد جو شہزادے کو ہر رات ایک کہانی سنانے کی پابند تھی جب سات سو آٹھویں رات آئی تو اس نے جواں بخت شہزادے سے مخاطب ہو کر کہا کہ ایک دفعہ ایران کے مشہور شہر شیراز میں ایک نائی رہتا تھا اپنی پیشہ ورانہ مہارت کے علاوہ اللہ تعالےٰ نے اُسے ایک انوکھا اور بے مثال ہنر بھی عطا کر رکھا تھا اور وہ یہ کہ جب بھی کسی دانا آدمی کا ہر بات کی تہہ تک پہنچنے والا دماغ کچھ پرانا ہونے لگتا تو وہ اس نائی کے پاس آتا کیونکہ یہ نائی دماغوں کی صلاحیتیں بیدار کرنے میں بے حد مہارت رکھتا تھا ، نائی کرتا یہ تھا کہ مریض کی کھوپڑی سے دماغ کو الگ کر کے تمام غلاظتوں اور میل کچیل کو نکال کر دماغ کی صفائی کرتا اور پھر اسے اپنی جگہ لگا دیتا۔ یہ منفرد کام کرنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک دن اس کی دکان کے سامنے سے ایران کے ایک بوڑھے وزیر کا گزر ہوا اور اُس وزیر کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ بھی اپنے الجھے ہوئے ذہن کی نئے سرے سے صفائی کروالے ۔ نائی نے صفائی کی غرض سے وزیر با تدبیر کی کھوپڑی سے اُس کے دماغ کو جدا کیا اور ابھی صفائی کا عمل شروع کرنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک خواجہ سرا شاہی دربار سے وزیر موصوف کا بلاوا لے کر آ گیا ۔ شاہی حکم پاتے ہی وزیر صاحب پریشان ہو کر اُٹھے اور بغیر دماغ کے ہی شاہی حکم بجالانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے اور اُس کا دماغ نائی کی دکان میں ہی رہ گیا مگر جب دوسرے روز اُس نے نائی سے اپنے دماغ کا تقاضا کیا تو نائی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ رات پڑوسی کی بلّی دروازے کے سوراخ سے نہ جانے کیسے اندر گھس گئی اور وہ آپ کا آسمان کے لئے بھی باعثِ رشک دماغ ہڑپ کر گئی ۔ اب کیا ہو سکتا ہے ہاں اگر آپ حکم فرمائیں تو میں کسی حیوان کا دماغ آپ کی کھوپڑی میں لگا دیتا ہوں ۔ وزیر صاحب کی رضامندی سے نائی نے اس کے سر میں کسی بیل کا دماغ رکھ دیا اور وزیر صاحب اُسی پر قناعت کر کے آ گئے ۔ مگر لوگوں کو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وزیر موصوف پہلے سے بھی زیادہ عقل و دانش ، سوجھ بوجھ اور چابک دستی سے امورِ وزارت انجام دینے لگے ہیں گویا بیل جو اپنی سادگی اور بیوقوفی کے لئے مشہور ہے اُس کا دماغ حاصل کر کے وزیر صاحب کی کارکردگی ، عقل و دانش اور فہم و فراست میں اضافہ ہو گیا تو اس سے اُن کی گزشتہ فہم و فراست کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

فیض احمد فیض

سوانحی حالات فیض احمد نام اور فیض تخلص تھا۔ فیض شہرِ اقبال سیالکوٹ میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سلطان محمد خاں بار ایٹ لا اپنے علاقے کی ایک متمول اور معروف شخصیت تھے۔ گھر کا ماحول خاصا مذہبی اور علمی تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مسجد مکتب میں حاصل کی اور پھر مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوگئے اور وہیں سے بی اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ اور انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر عربی زبان میں بھی ایم اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا دورانِ تعلیم فلسفہ بھی اُن کا خاص مضمون رہا تکمیل تعلیم کے بعد ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرار ہوگئے۔ دورانِ جنگِ عظیم ۱۹۴۲ء میں فوج میں بھرتی ہوگئے اور ۱۹۴۶ء میں میجر کی حیثیت سے فوج سے استعفیٰ دے دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور منتقل ہوگئے اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد امروز بھی ان کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ اس سے قبل کچھ عرصہ انہوں نے لیل و نہار کی ادارتی خدمت بھی انجام دی۔ ۱۹۵۳ء میں فیض کو راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کر لیا اور بعد کی زندگی میں بھی انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ۱۹۶۲ء میں حکومتِ روس نے فیض کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں لینن پرائز سے نوازا۔ کچھ عرصہ آپ حکومتِ پاکستان کی وزارتِ تعلیم میں مشیر کے طور پر بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں اُن کا نام نوبل انعام کے لئے بھی زیرِ غور رہا۔ تقسیمِ پاکستان کے بعد پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے انہوں نے عالمی ادارہ محنت میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ موت سے قبل فیض افرو ایشیائی ادیبوں کی انجمن سے وابستہ ہوگئے اور اس کے تحت شائع ہونے والے جریدے "لوٹس" کے چیف ایڈیٹر تھے۔ فیض کا انتقال ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں ہوا اور یہیں میانی شریف کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

تصانیف: شاعری نقشِ فریادی، دستِ تہہ سنگ، دستِ صبا، سرِ وادیٔ سینا، مرے دلِ مرے مسافر، شامِ شہرِ یاراں۔ یہ تمام مجموعے "نسخہ ہائے وفا" کے نام سے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

نثر: "میزان" "لوح و قلم" اور خطوط کا مجموعہ "صلیبیں مرے دریچے میں"

محاسنِ کلام

فیض اردو شاعری میں ایک منفرد اور توانا لہجے کے شاعر ہیں ترقی پسند تحریک سے وابستہ

اُن کی سوچ اور نصب العین کا تعین مشکل نہیں وہ اپنے فن کے ذریعے معاشرتی اور اقتصادی مساوات کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے اردو غزل میں الفاظ کو نئے مفاہیم میں برتنا اور علامتوں اور استعاروں کی ایک نئی روایت کو فروغ دیا جو اپنی معنویت، نشتریت اور رمز و ایمائیت کے اعتبار سے انہی کے ساتھ مخصوص ہو گئی اور جس نے عصرِ حاضر کے شعراء کی ایک بڑی کھیپ کو متاثر کیا۔ اس طرح فیضؔ کی شاعری عہدِ حاضر کی ترجمان و عکاس بن گئی۔

فیض کا منفرد تصورِ عشق

فیضؔ کی شاعری کا مرکزی موضوع اگرچہ عشق ہے۔ مگر روایت سے ہٹ کر فیضؔ کے تصورِ عشق میں معروضی مسائل کا احساس اور زندگی کے بدلتے تقاضوں کا شعور پایا جاتا ہے۔ وہ عشق کو تکمیلِ ذات سے وابستہ کرنے کے باوجود دلفریبیٔ غمِ روزگار کو محبوب سے بالاتر خیال کرتے ہیں۔ اور اُن کا جذبۂ عشق ایک جذبۂ عمل اور انقلابی شعور کا امین بن جاتا ہے۔

؎ اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں — ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

؎ دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا — تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

؎ گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہے لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

؎ کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

سیاسی اور سماجی حالات کی ترجمانی

فیضؔ کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے عشقیہ اشعار میں سیاسی و سماجی حالات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے جو اُن کے جذبۂ عشق کی کارفرمائی کے سبب تغزل کی چاشنی سے بھی مالامال ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سیاسی مضامین کو تغزل کے خوشنما لبادے میں پیش کرنے کی روایت فیضؔ ہی نے قائم کی اور اُن کے سیاسی اشعار میں ایک منفرد تازگی، شگفتگی اور سوز و گداز کی کیفیت بہت نمایاں ہے۔

؎ وہ جب بھی کرتے ہیں اِس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

؎ اُن کی نظر میں کیا کریں پھیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم!

؎ ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے غمگسار چلے گئے

تری راہ میں کرتے تھے سرِ طلب، سرِ رہگذار چلے گئے!

ے نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لٹا دیا

سوز و گداز کی مدھم لے

فیض کی شاعری میں سیاسی و سماجی شعور کی ترجمانی کے باوجود سوز و گداز کی ایک ہلکی اور مدھم لے موجود ہے۔ اُن کی غزلوں میں درد بھری آواز دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اُن کے ذاتی اور اجتماعی درد و غم اور سوز و گداز کی کسک نے اُن کی شاعری کو مقبولیت کے کمال تک پہنچا دیا ہے۔

۱ے تری کج ادائی سے ہار کر شبِ انتظار چلی گئی
مرے عرضِ حال سے روٹھ کر مرے غم گسار چلے گئے

۲ے نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے
نہ کرم ہے ہم پہ حبیب کا، نہ نگاہ ہم پہ عدو کی ہے

۳ے قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو — کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

۴ے نہ گُل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے نہ مے پی ہے — عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

فیض کا کلاسیکی مزاج

علی سردار جعفری کے بقول "روایت پرستی، رجعت پرستی ہے لیکن روایت کا احترام کرنا اور اس کے مطالعے سے ایک تنقیدی شعور پیدا کرنا ترقی پسندی ہے" روایت کے اِس وسیع تر مفہوم کو پیشِ نظر رکھ کر اگر فیض کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اساتذہ فن کے کلام سے استفادہ کرنے کے بعد ہی فیض کا وہ کلاسیکی مزاج تشکیل پایا جو اُن کی پہچان بھی ہے اور ان کا اردو کی روایت سے ایک مضبوط رشتہ بھی جوڑتا ہے:۔

ے یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم — ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

ے اُدھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھے گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

ے ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا — بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے

ے گھر رہیے تو ویرانیِ دل کھانے کو آوے — رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

داخلی اور خارجی کیفیات کی عکاسی

فیض کی غزلوں میں جہاں شدتِ احساس اور حد درجہ داخلیت سے دروں بینی کی خوبی پیدا ہو گئی ہے وہاں اُن کی شاعری میں خارجی اندازِ فکر اور خارجی کیفیات کی بھرپور عکاسی بھی ملتی ہے۔ اُن کے ایسے اشعار

داخلی اور خارجی کیفیات کے نہایت عمدہ نمونے ہیں۔

داخلیت

؎ تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں ۔ کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

؎ جب تمہیں یاد کر لیا، صبح مہک مہک گئی ۔ جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

؎ دل ہر تار، لرزشِ پیہم! ۔ جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

خارجیت

؎ رنگِ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام ۔ موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

؎ صحنِ چمن میں کبھی اے شہِ شمشاد قداں ۔ پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا

فیض کا رجائی لہجہ

اپنی زندگی کی تمام تر مشکلات اور قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود فیض کے ہاں ایک امید افزا رجائی لہجہ نمایاں ہے جس کا سبب زندگی کے بلند مقاصد اور عالمگیر سچائیوں پر اُن کا کامل یقین ہے۔ اور اُن کے حصول کی جدوجہد میں ناکامی بھی اُن کے لئے باعثِ افسوس نہیں۔

؎ گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

؎ صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے!

؎ بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی!
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

؎ کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

فیض کی علامتیں

اردو ادب کی روایت سے گہرا تعلق رکھنے کے باوجود فیض نے علامتوں، استعاروں اور اشاروں کنایوں کے استعمال کی ایک بالکل نئی راہ نکالی۔ اُن کی علامتیں پرانی ہیں جن کا رشتہ ہماری ماضی کی ادبی روایت سے ہے لیکن ان کو نئے مفہوم اور نئے معنی میں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ قدامت کے باوجود نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔

؎ دستِ صیّاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی ۔ بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

؎ لو سنی گئی ہماری یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے ۔ وہی گوشۂ قفس ہے وہی فصلِ گل کا ماتم

؎ جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے ۔ رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

وحدتِ احساس کا تسلسل

فیض کی غزلوں کی ایک اہم خصوصیت اُن کا غیر محسوس تسلسل

ہے اور یہ وحدتِ احساس اُن کی غزل کے حُسن میں اضافے کا سبب ہے۔ فیض کی مشہور کتاب "سروادیٔ سینا" کی غزلوں میں تسلسل کا یہ حسن اور بھی نکھر کر اُن کی وحدتِ احساس و فکر کو نمایاں کرتا ہے۔ مثلاً اُن کی غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے — جو دل پہ گزرتی ہے، رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی — ہاں اہلِ ستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے
مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے — تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

طنز کی شدت اردو شاعری میں غالب کے بعد فیض نے طنز کے نشتروں کا استعمال بڑی فنکاری اور سلیقے سے کیا ہے۔ یہ طنز کی شدت دراصل فیض کی ذاتی زندگی کی پیچیدگیوں، ادبی اور سیاسی مخالفتوں اور دوسرے معروضی حالات کا ردِ عمل ہے۔ طنز کے فنکارانہ استعمال سے ان کی غزلوں میں بالخصوص جو نشتریت پیدا ہو گئی ہے وہ اُن کی غزلوں کا ایک امتیازی وصف قرار پاتی ہے۔

فقیہہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں — کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں
فیض اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں — آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام
برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حسن — گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں
اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف — مہر اُس کی ہے میزان بدستِ دگراں ہے

تغزل کی سحر کاری غزل اور تغزل کو لازم و ملزوم خیال کیا جاتا ہے اور تغزل کی سحر کاری کے بغیر کسی اچھی اور معیاری غزل کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس نقطہ نظر سے جب فیض کی غزل کا جائزہ لیا جائے تو سماجی اور سیاسی مضامین کے باوجود اس کی غزل میں تغزل کی شمع ہر جگہ روشن نظر آتی ہے، اور یہ خوبی اُن کی مقبولیت اور شہرت کا جواز بھی فراہم کرتی ہے۔

دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی، شامِ فراقِ یاراں

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

غزل

حلِ لغات شامِ فراق ۔ جدائی اور ہجر کی رات ؛ دل بہل جانا ۔ وقتی طور پر مطمئن ہو جانا، تسلّی ہو جانا ۔ بزمِ خیال ۔ خیالوں کی محفل مراد ہے سوچ، فکر ؛ مہک جانا ۔ ہر طرف خوشبو کا پھیل جانا ؛ آخرِ شب ۔ رات کا آخری حصّہ ؛ صبا ۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا ۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱ :۔
شامِ فراق ، اب نہ پوچھ ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا ، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

تشریح اے دوستو! عشق میں ہم کیسے کیسے اذیت ناک اور کڑے حالات سے دوچار ہوئے یہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں تم جدائی کی رات کا پوچھتے ہو بس اتنا جان لو کہ ہمیں اس کی تلخیوں اور سختیوں سے بھی دوچار ہونا پڑا مگر ہمارے جذبۂ عشق کی صداقت نے ثابت قدم رکھا اور شامِ فراق بھی آئی اور ہماری جانِ ناتواں پر ایک قیامت ڈھا کے بالآخر ٹل ہی گئی اور پھر آہستہ آہستہ ہمارا دل محبوب کے ظلم و ستم کا عادی ہوتا گیا اور ہم اپنے دل و جاں کو بہلانے اور سنبھالنے میں کامیاب ہو ہی گئے ۔

شعر نمبر ۲ :۔
بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ، ہجر کی رات ڈھل گئی

تشریح غالبؔ کے بقول انسان بذاتِ خود ایک محشرِ خیال ہے ۔ تنہائی میں وہ کیسی کیسی خیالی بزم آرائیاں کرتا ہے ۔ فیضؔ ایک ایسی ہی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے دوست! ہم جب کبھی بھی تنہا ہوئے تو ہمارے خیالوں کی محفل میں تیرے حسن و جمال کی شمع روشن ہو گئی اور ہماری تنہائیاں جمالِ دوست کے تصوّر سے ہی مہک اٹھیں اور ہم حسنِ دوست کی تجلّیوں میں کچھ ایسے کھوئے کہ درد کا چاند ماند پڑ گیا اور رفتہ رفتہ ہجر کی طویل رات بھی ختم ہو گئی ۔ گویا ہجر کی راتوں میں خیالوں میں ہی جمالِ دوست کی قربت ہمارے درد و غم کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے ۔ مومنؔ نے تنہائی میں محبوب کی ایسی ہی خیالی بزم آرائی کو اپنے مشہورِ زمانہ شعر میں بیان کیا ہے ۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شعر نمبر ۳ :۔
جب تجھے یاد کر لیا ، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا ، رات مچل مچل گئی

تشریح اے دوست! ہم اپنی سوچوں اور جذبوں پر اس حد تک حاوی ہیں کہ حسبِ منشا کسی بھی کیفیت سے دوچار ہو سکتے ہیں چونکہ ہماری سوچوں اور جذبوں کا محور و مرکز تمہاری ہی ذات ہے ۔

اس لئے جب بھی تجھے یاد کر لیتے ہیں تو ہماری صبحیں اور بھی روشن اور معطر ہو جاتی ہیں ہمارے ماحول کی ہر شے تمہاری خوشبو سے مہک اٹھتی ہے گویا تیری یاد کا بے اختیار آجانا تمنا کی فصل بہار کے آجانے کے مترادف ہے اور جب کبھی تمہارا غم جاگ اٹھتا ہے تو رات بھی ہمارے غم میں شریک ہو کر مچلنے، رونے اور آنسو بہانے لگتی ہے۔ گویا تمہاری یاد اور غم ہی ہمیں خوشی اور غمی کی انتہائی کیفیت سے دوچار کرنے کے لئے کافی ہے۔ بقول شاعر

تیری یادوں کے دیئے جب بھی جلاتا ہے خیال ۔ حسن کچھ اور شبِ غم کا نکھر جاتا ہے

شعر نمبر ۴: دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم — کہنے میں انکے سامنے بات بدل بدل گئی

تشریح عشق میں کبھی کبھی عاشق کو اس کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ محبوب کے روبرو وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے قرب دوست کا احساس اور ہجوم خیال اس میں گڑ بڑ کر دیتا ہے اور وہ اپنا مدعائے دل بیان نہیں کر پاتا، فیض اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ ہمیں محبوب سے بہت سے گلے اور شکایتیں تھیں مگر جب ہم اس سے ملاقات کے لئے چلے تو ان سب کو دل سے بھلا دیا اور کوئی گلہ شکوہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کیا۔ مگر جب اس کے روبرو پہنچے تو ہمیں اپنے حواس پر قابو نہ رہا اور جو باتیں کہنے کا ارادہ کر کے چلے تھے ہماری بدحواسی نے انھیں بیان کرتے ہوئے نہ جانے کیا مفہوم دے دیا اور یہ حسرت لے کر لوٹے کہ اپنا مدعائے دل بیان نہ کر پائے۔

شعر نمبر ۵: آخر شب کے ہم سفر فیض نجانے کیا ہوئے — رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

تشریح غزل کے اس خوبصورت مقطع میں فیض اظہار حسرت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پچھلی رات کے اس سفر میں ہمارے وہ دوست جنہیں ہماری ہم سفری کا دعویٰ تھا وہ نہ جانے کہاں گئے گویا ہم تو اب بھی اپنی منزل کی طرف مصروفِ سفر ہیں مگر ہمیشہ ساتھ دینے کا دعویٰ کرنے والے ہمارے ہم سفر نہ جانے کیوں ساتھ چھوڑ گئے پھر رات ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی، نہ جانے صبا اپنی موجِ خرام سے صبح کے قریب آنے کی خوشخبری کب سنائے گی۔ مگر ابھی تو یوں لگتا ہے کہ سفر کی طویل رات جاری ہے۔ ہمارے ساتھی نہ جانے کیا ہوئے صبا کس جگہ رہ گئی اور صبح کون جانے کس طرف نکل گئی ہے۔ معلوم نہیں سفر کی اس طویل رات کے بعد ہمیں صبح کی روشنی میں منزلِ مقصود کو دیکھنا نصیب بھی ہو گا کہ نہیں۔

آجاؤ افریقا

حلِ لغات ترنگ ۔ لہر، امنگ، جوش۔ تال ۔ ڈھول کی آواز کا نشیب و فراز۔ جال توڑ دینا۔ آزاد ہو جانا۔ گرز ۔ دشمن کے سر پر مارنے والا ہتھیار۔ طوق ۔ وہ حلقہ جو مجرموں کو

پہنلتے ہیں ؛ ہرگ نین - ہرن جیسی خوبصورت آنکھیں ؛ تال دینا۔ سُر کا ساتھ دینا ؛ ببّر کی چال - شیر کی چال ؛

نظم کی تشریح

تعارف فیضؔ کے ہاں نظم میں ہیئت کے نئے تجربے ملتے ہیں انہوں نے نظم کی مروجہ فارم سے انحراف کرتے ہوئے عالمی ادب کے زیرِ اثر اظہار کی نئی راہیں اختیار کی ہیں۔ زیرِ مطالعہ نظم بھی اردو نظم میں یقیناً ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں پہلا بند دو مصرعوں، دوسرا چار مصرعوں، تیسرا اور چوتھا دو دو مصرعوں اور آخری بند پھر چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور ہر بند کے بعد گیت کے سے انداز میں ٹیپ کا ٹکڑا "آجاؤ ایفریقا" دہرایا گیا ہے۔ نظم افریقہ کی سیاسی اور سماجی بیداری کا پیغام لئے ہوئے ہے۔ شاعر افریقہ کے سیاسی اور سماجی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عوام کو اپنے حقوق کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی پُرجوش دعوت دیتا ہے جس طرح ڈھول کی تھاپ کی لے بڑھتی چلی جاتی ہے اسی طرح نظم کا ہر اگلا بند جوش و خروش میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے اور بالآخر آزادی کا مژدہ بن کر چھا جاتا ہے۔

بند نمبر ۱:

آجاؤ، میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال

"آجاؤ ایفریقا"

تشریح شاعر افریقہ کے مظلوم اور غلام عوام کو آزادی کا مژدہ سناتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ اے اہلِ افریقا! میں نے تمہارے دلوں میں بیدار ہونے والی آزادی کی لگن اور تڑپ محسوس کرلی ہے اور اب تمہارے اعلانِ آزادی کو اپنے کانوں سے سن بھی رہا ہوں یہاں تک کہ تمہارے نغمۂ آزادی نے میری رگوں میں دوڑنے والے لہو کو اس حد تک گرما دیا ہے ...... کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ میرا لہو بھی آزادی کے گیت کی سُر تال میں حرکت کر رہا ہے - اور مجھے یقین ہے کہ یہی حال افریقا کے ہر باسی کا ہو گا - پھر آؤ سب مل کر افریقا کی آزادی کے لئے جدوجہد کا آغاز کریں۔

بند نمبر ۲:

آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اُٹھا لیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال

"آجاؤ ایفریقا"

تشریح اے اہل افریقا! میری طرف دیکھو، میں نے غلامی کی زندگی سے انکار کر دیا ہے اور اپنا سر خاک سے اٹھا کر اپنے خود مختار اور خود دار ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور میں نے

اپنی آنکھوں سے غموں کی چھال تک کو چھیل دیا ہے یعنی میں نے غلامی تجسے ہر غم کو ختم کرنے کا عہد کر کے غلاموں کے دیئے ہوئے دکھوں سے پیچھا چھڑا لیا ہے اور اپنی بے بسی اور مجبوری کے ہر جال کو توڑ کے پھینک دیا ہے اور یہ سب اپنی دھرتی کی آزادی کے لئے کیا ہے۔ اس لئے اے اہل افریقیا! آؤ میرے قدم سے قدم ملا کے چلو تا کہ ہم آزادی کی منزل پر پہنچ کر جشن منائیں۔

بند نمبر ۳:- پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز!
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
"آجاؤ ایفریقیا"

تشریح سامراجی آقاؤں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنائی تھی میرے عزم جواں نے اُسے گرز بنا دیا ہے اور یہی دشمن کا سر توڑیں گی۔ میری گردن میں میرے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں جو طوقِ غلامی پہنا دیا تھا وہ میرے جذبہ آزادی کی بدولت ڈھال بن گیا ہے گویا اقبال کے لفظوں میں

؎ غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ تقدیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

بند نمبر ۴:- جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال

تشریح ہر وہ جگہ جہاں کہیں بھی سامراجی درندوں نے پناہ سے رکھی تھی وہ حریت کے متوالوں کی زد میں آگیا اور ہر کچھار میں آزادی کے جاں نثاروں کے بھالوں کی روشن آنکھیں چمکنے لگیں اور افریقہ کی تاریک رات دشمن ہی کے لہو سے شفق رنگ ہو گئی اس لیے ہر افریقی کے لئے دعوتِ عمل ہے کہ وہ اٹھے اور ہماری صفوں میں شامل ہو جائے۔

بند نمبر ۵:- دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقیا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں ایفریقیا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقیا"
آؤ ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقیا"

تشریح شاعر آزادی کے جوش و جذبے کو ہر فرد اور ہر شے میں موجزن دیکھتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ اے افریقیا! صرف میں ہی آزادی کے نغمے نہیں الاپ رہا بلکہ میری بیداری کے نغمے کی دھن پر افریقہ کی سرزمین رقص کر رہی ہے دریاؤں کی لہریں آزادی کی تڑپ سے سرشار ہیں تو جنگل تک اسی نغمے کی لے پر رقص کر رہے ہیں اور افریقہ کی ہر چیز حریت کا یہ نغمہ الاپ

رہی ہے کہ میں افریقہ ہوں اور میں بیدار ہو چکا ہوں میرے ہر قول اور فعل سے ڈر خوف نکل چکا ہے اور میری چال میں ببر شیر کی سی بے باکی اور بے خوفی کی شان نمایاں ہو گئی ہے۔ اس لئے اے اہلِ افریقا! آؤ ہم سب مل کر ببر شیر کی چال چلیں اور آزادی کی منزل کو پالیں۔

سنکیانگ

حلِ لغات طبل بجانا۔ ڈھول بجنا، میدانِ جنگ کی طرف کوچ کا اعلان ؛ موت کی وادی۔ مراد ہے میدانِ جنگ ؛ دل دھڑکنا۔ خوفزدہ ہونا ؛ وہم۔ شک و شبہ ؛ مے و ساغر۔ شراب کا پیالہ ؛ خون لٹانا۔ قتل ہونا ؛ اشک بہانا۔ گریہ زاری کرنا، رونا ؛ رقصِ صبا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کا چلنا ؛ مطربا۔ مغنّیہ، گانے والی۔ رنگِ حنا۔ مہندی کا رنگ ؛

نظم کی تشریح

تعارف فیضؔ نے زیرِ مطالعہ نظم میں بھی نظم کے مروّجہ اسالیب سے انحراف کرتے ہوئے ہیئت کا نیا تجربہ کیا ہے نظم میں چار چار مصرعوں کے دو بند اور تین مصرعوں پر مشتمل ایک بند شامل ہے۔ نظم چین کی تحریکِ حریّت کی کامیابی کا طربیہ ردِ عمل ہے۔ جس میں جنگ کی ہولناکیوں سے نجات پانے کے بعد روشن مستقبل کے امن و سلامتی والے دنوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے جشنِ مسرت برپا کرنے کی تیاری کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

بند نمبر ۱:- اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہسوار ــــــ صبحدم موت کی وادی کو روانہ ہوگا
۲:- اب کوئی جنگ نہ ہوگی نہ کبھی رات گئے ــــــ خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا

تشریح سنکیانگ میں برپا ہونے والے معرکہ نے تحریکِ حریّت کو آزادی کی منزل پر پہنچا دیا ہے اور جنگ کی ہولناکیوں نے بالآخر اپنا دامن سمیٹ لیا ہے چین آزاد ہو گیا ہے۔ اب کبھی بھی میدانِ جنگ کی طرف کوچ کے اعلان کے طور پر طبلِ جنگ نہیں بجے گا اور نہ ہی کوئی جیالا نوجوان موت کو گلے لگانے کے لئے میدانِ جنگ کو روانہ ہوگا، اب چونکہ دشمن میدان چھوڑ کے بھاگ چکا تو یقین ہو چلا ہے کہ اب کبھی کوئی جنگ نہ ہوگی اور نہ ہی کبھی رات گئے کوئی لاش آئے گی اور نہ اس خون آلود لاش پر گریہ و ماتم کا ہنگامہ برپا ہوگا۔

بند نمبر ۳:- کوئی دل دھڑکے گا شب بھر نہ کبھی آنگن میں ــــــ وہم منحوس پرندے طرح آئے گا

تشریح جنگ کے خاتمے نے بہت سے خطرات کے عذاب سے بچا لیا ہے اور خوف و دہشت کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے۔ اب کوئی اپنے پیاروں کے لئے رات بھر آنگن میں پریشان

نہیں ہوگا اور کسی منحوس خبر سننے کی اذیت سے بھی چھٹکارا مل گیا ہے۔اب وہم کا یہ ہولناک احساس بھی ختم ہوگیا ہے کہ میدانِ جنگ سے ہمارے پیاروں کے بارے میں کوئی دل شکن خبر نہ جانے کب آجائے اور اب ڈر اور خوف ایک خونخوار درندے کی طرح ہمارے ذہنوں پر مسلط نہیں رہے گا۔گویا جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی تمام خطرات، وہم، ڈر اور خوف ذہنوں سے جاتے رہے۔

بند نمبر ۴:۔ اب کوئی جنگ نہ ہوگی ہے وساغر لاؤ   خوں لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا
ساقیا! رقص کوئی رقص صبا کی صورت   مطربا! کوئی غزل رنگ حنا کی صورت

تشریح اے دوستو! بالآخر جنگ اور اُس کی ہولناکیاں ختم ہوگئیں۔انسانی خون کے بے دریغ بہنے کا سلسلہ بھی بند ہوگیا اس خوشی میں آؤ جشن منائیں شراب کے ساغر لنڈھائیں کہ اب نسلِ انسانی کا خون نہیں بہے گا اور نہ ہمیں اپنے پیاروں کی موت پر آنسو بہانا اور گریہ و ماتم کرنا پڑے گا۔ اے ساقی! تیری خیر ہو، اس خوشی کے موقع پر تو رقص کا اہتمام ہونا چاہیے۔ایک ایسے دلنواز رقص کا جس میں صبح کی ٹھنڈی ہوا کی تازگی، شگفتگی اور خوش خرامی ہو اور اے مغنیہ! کوئی ایسی پھڑکتی ہوئی غزل گنگنا، جس میں مہندی کی رنگت کی فسوں کاری اور دلفریبی رچی بسی ہو۔

میراجی

گیت

حلِ لغات بیرن۔ بھائی؛ مورا۔ میرا؛ ساون من بھاون۔ ساون یعنی برسات کا موسم جو دل کو بھاتا ہے؛ من بستی۔ دل کی بستی؛ بندھن۔ رشتہ؛ ہردے۔ دل، ضمیر، ہندوؤں کا روزمرہ؛ سندیسہ، پیغام؛ ماں جایا۔ بھائی؛ اجیارا چھانا۔ اُجالا ہوجانا مراد ہے ہر طرف خوشی اور رونق نظر آنا؛ دھیر۔ ہمت، حوصلہ؛ بال پنا۔ بچپن؛ سنگی۔ دوست، ساتھی؛ پونچی، جھانجھن، عورتوں کے زیور؛

تشریح و تعارف

تعارف گیت نظم کی مشہور صنف ہے جس میں شاعر مختلف سماجی اور معاشرتی موضوعات کو نہایت رواں دواں اور رسیلے لہجے میں نظم کرتا ہے۔اردو شاعری میں گیت کی صنف

کو رواج دینے والوں میں میراجی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے اردو میں گیت لکھتے ہوئے ہندی لب و لہجے اور لفظوں کو استعمال کر کے اردو کے دامن کو وسعت دی ہے۔ زیرِ مطالعہ گیت ایک ایسی بہن کے دل کی آواز ہے جو عرصے سے اپنے سسرال میں اپنے میکے کے حالات سے بے خبر ہے اور پھر بھائی کا ساون کے بھیگے موسم میں آنا گویا اُس کے لیے عید کی خوشیاں لاتا ہے، وہ اس سے نہ صرف اپنے میکے کی خیر و عافیت معلوم کر کے خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہے بلکہ اپنے بچپن کے اس سنگی کے لائے ہوئے تحائف پا کر اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اُسے ہر طرف خوشیوں بھرا اجالا پھیلا نظر آتا ہے اور اپنے گھر کی رونق کو چار چاند لگے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ گیت ایک پیار کرنے والی بہن کے اپنے بھائی کے لئے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

بند نمبر ۱:۔ آیا بیرن مورا رے

پھر ساون من بھاون آیا — آیا مورا بیر، آیا بیرن مورا رے
پھر ساون من بھاون آیا — پل میں من کی بستی کو سجایا
ساون آیا ٹوٹا دکھ کا بندھن مورا رے

تشریح: میرا پیارا بھائی آیا۔ ایک عرصے کے بعد اُسے دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ بھائی کیا آیا کہ ساون کا بھیگتا ہوا موسم پہلے سے بھی پیارا اور خوبصورت نظر آنے لگا۔ اپنے میکے کی اِس پیاری نشانی کو دیکھ کر ایک لمحے میں میرے دل کی کلی کھل اٹھی اور میری دنیا آباد ہو گئی اور میرے بھائی کے آنے پر ساون جو برسا تو میرے دکھوں کا بندھن ٹوٹ گیا اور ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہنستی مسکراتی نظر آنے لگیں۔

بند نمبر ۲:۔ ہنسی بہن بھائی سے مل کے — اب دکھ دور ہوتے ہیں دل کے
اب تو کوئی سوچ نہیں اب ساون مورا رے

تشریح: پیارا بھائی آیا تو بہن اُس سے مل کر نہال ہو گئی۔ میکے کی کوئی خیر خبر نہ پا کے دل پر جو دکھ کا یا دل چھایا ہوا تھا وہ چھٹ گیا۔ بھلا اب کیا غم، اب تو خوشیاں منانے کا پیارا موسم ساون بھی آیا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ ساون منانا صرف میرا حق ہے۔

بند نمبر ۳:۔ اب سسرال بنا ہے میکا — حال ہی اور ہے کچھ ہردے کا
لایا سندیسہ ماں جایا بیرن مورا رے

تشریح: اب میرے دل کی خوشی کا حال مت پوچھو۔ بھائی کے آنے پر اب تو سسرال بھی میکا ہی محسوس ہوتا ہے کیونکہ میرا ماں جایا (بھائی) میرے میکے کے شاد آباد ہونے کی خوشخبری لے کے آگیا پھر بھلا میں خوشیاں کیونکر نہ مناؤں۔

بند نمبر ۴:۔ دھرتی پر چھائے ہریالی　　اُٹھے گھٹائیں کالی کالی
گھر بھر میں اجیارا چھایا　　پل میں بندھائی دھیر
آیا بیرن مورا رے

تشریح میرا پیارا بھائی گیا آیا کہ ہر چیز سے خوشیاں ٹپکتی نظر آتی ہیں۔ دھرتی پر چاروں طرف ہریالی لہرا رہی ہے اور کالی کالی گھٹائیں ہر طرف سے امڈی چلی آتی ہیں جو ماحول کے حسن میں اور اضافہ کردیں گی۔ میرے بھائی نے آکر میرے غم زدہ دل کی ڈھارس جو بندھائی تو سارے گھر میں خوشیوں کا اجالا پھیل گیا اور میرے پیارے بھائی کے آنے سے ہر طرف رونق ہی رونق محسوس ہونے لگی۔

بند نمبر ۵:۔ آیا بال پتے کانگی　　لایا چوڑیاں رنگ برنگی
پونہچی لایا، جابجن لایا، چاندی کی زنجیر
لایا بیرن مورا رے
پھر ساون من بھاون آیا
آیا مورا بیر
آیا بیرن، مورا رے

تشریح میرے بچپن کا ساتھی میرا یہ بھائی، میرے لئے کس پیار سے تحفے لایا ہے۔ اِن تحفوں میں اُس کے پیار کا تحفہ رنگ برنگی چوڑیاں ہیں، پونہچیاں، جھانجھن اور چاندی کی زنجیر ہے مجھے یہ تحفے اس لئے پیارے اور عزیز ہیں کہ یہ میرے بھائی اور میکے کی محبت ظاہر کرتے ہیں کہ میرا میکہ مجھے بیاہنے کے بعد مجھے بھولا نہیں۔ اس لئے یہ سب چیزیں پاکر میں خوشیاں کیوں نہ مناؤں کیونکہ میرا بیرن اپنی چاہتوں اور محبتوں کی سوغات لے کر آیا ہے اور ساون کے اس خوبصورت بھیگے موسم میں میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔

راجہ مہدی علی خاں

ایک جہلم پر

حل لغات عداوت ۔ دشمنی ؛ رنج و محن ۔ دکھ، تکلیف اور افسوس ؛ بین کرنا ۔ ماتم کرنا، گریہ زاری کرنا ؛ کلیجے پر آری چلنا ۔ بہت دکھ اور تکلیف ہونا ؛ جان کھونا ۔ ہلاک ہونا، مرنا ؛ چورن ۔ ہاضمے کی دوائی ؛

نظم کی تشریح و تعارف

تعارف راجہ مہدی علی خاں اردو میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں بلند مقام رکھتے ہیں انہوں نے ہاں معاشرتی اور سماجی معاملات میں لوگوں کے عمومی اور ظاہرداری کے رویے پر اپنے مخصوص انداز میں بھرپور طنز کرتے ہوئے خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ زیرِ مطالعہ نظم بھی اُن کے اسی اندازِ فکر کی ترجمان ہے۔ جس میں راجہ صاحب نے مرنے والے کے پس ماندگان سے اظہارِ تعزیت پر طنز کا نشتر چلایا ہے۔ کہ ہم دردمندی اور خلوص سے کسی کی تعزیت بھی نہیں کرتے اور وہاں بھی ہمارا رواروی کا رویہ قائم رہتا ہے۔ شاعر ایک چہلم کے موقع پر ایک بزرگ خاتون کی گفتگو بیان کرتا ہے کہ وہ کس طرح دعوت اڑاتے ہوئے مرنے والے کے اوصاف بیان کرنے کے لئے روایتی جملے بولتی ہیں اور اہل خانہ سے پلاؤ، قورمہ طلب کر کے ہڑپ کر جاتی ہیں اور پھر چوہن یا کھاری بوتل کا تقاضا کرنے سے بھی نہیں چوکتی۔ گویا وہ کسی چہلم پر نہیں بلکہ کسی شادی کے ولیمے میں شامل ہوں۔

بند نمبر ۱:

بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
کسی سے بھی رکھی نہ اس نے عداوت! کہ پیشہ تھا اس نوجوان کا شرافت
ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا
نہ رو رو کے بے حال ہو اے دلہن تو نہ کر اس قدر آہ رنج و محن تو!
وہ جنت میں خوشیاں منائے گا مت رو وہ حوروں سے اب دل لگائے گا مت رو
وہ آخر ہمیں بھی تو تھا جاں سے پیارا مگر دے لیا ہم نے دل کو سہارا
نہ کر بین اتنے، نہ رو اتنا پیاری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

تشریح تعزیت کے لئے آنے والی خاتون اہل خانہ سے مرنے والے ہی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتی ہے۔ کہ مرنے والا نہایت خوبصورت جوان تھا اور نیکی اور شرافت تو گویا اُس کی فطرت میں شامل تھی۔ بھلا ایسے نیک اور خوبصورت جوان اب کہاں۔ مرنے والا تو ہزاروں جوانوں میں ایک تھا۔ اُس کی نہ کسی سے دشمنی تھی کیونکہ اُس نے شرافت اور نیکی کو اپنی زندگی کا معمول بنایا ہوا تھا۔ وہ جب کبھی بھی ہمارے محلے میں آتا تو اور کسی کو ملے نہ ملے مگر ہمیں سلام کرنے ضرور آتا تھا اور یہ چیز اُس کے دل میں ہماری محبت اور عزت کو ظاہر کرتی ہے۔

اے دلہن! زندگی اور موت پر خدا کا اختیار ہے۔ اس معاملے میں انسان بے بس ہے۔ اس لئے تو رو رو کے اپنا اس طرح برا حال مت کر، ٹھیک ہے تمہارا سہاگ اجڑا ہے اور غم کی جس کیفیت

سے تو دو چار ہے اُس کا اندازہ مشکل ہے مگر نہیں یہ سوچ کر اللہ کی رضا پر راضی اور مطمئن ہوجانا چاہیے کہ تمہارا میاں جنت میں اللہ کی نعمتوں سے لطف اٹھائے گا اور جنت کی حوروں سے دل بہلائے گا۔ وہ تمہیں ہی نہیں ہمیں بھی اپنی جان سے پیارا تھا مگر اللہ کی مرضی کے سامنے ہم نے سر جھکا لیا اور اپنے دل کو دلاسہ دے ہی لیا ہے۔ پھر وہ مرنے والے کی بیوہ کو نصیحت کرتی ہیں کہ اے بی بی! اس طرح رو رو کے بین نہ کر کیونکہ تمہارے غم کو محسوس کر کے ہمارے دل پر بھی آری چلتی ہے۔

بند نمبر ۲۰: رضیہ ذرا گرم چاول تو لانا ؛ ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی پلانا

بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

منگانا پلاؤ ذرا اور خالہ بڑھانا ذرا قورمے کا پیالہ

ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا!

پڑا ہے پلاؤ میں گھی ڈالڈے کا خدا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا

دلہن سے کہو آہ اتنا نہ روئے بچاری نہ بے کار میں جان کھوئے

اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے یہ پھوٹا لکھا تھا مقدر میں میرے

بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

دلہن گھر میں چورن اگر ہو تو لانا نہیں تو ذرا کھاری بوتل منگانا

نہ کر بین اتنے نہ رو اتنا پیاری

ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

تشریح موصوفہ مرنے والے کے پس ماندگان سے اظہارِ ہمدردی کرنے کے ساتھ کھانے کے ساتھ انصاف کرنے میں بھی پیچھے نہیں ہیں وہ لڑکیوں کو حکم دیتی ہیں کہ اے رضیہ! ذرا گرم چاول تو لانا اور ذکیہ ذرا تم ٹھنڈا پانی تو پکڑاؤ مجھے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ "مرنے والا بیچارہ نہایت ہی خوبصورت اور نیک تھا۔ اُس جیسا شریف نوجوان تو ہزاروں میں بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے"۔

"اے خالہ ذرا کچھ گرم پلاؤ تو منگاؤ اور یہ قورمے کا ڈونگا بھی میرے قریب کر دو"۔ "مرنے والا جب بھی ہمارے محلے میں آتا تھا تو ہمیں ضرور مل کر جاتا تھا"۔

غرض وہ تقاضا کر کے سامانِ خور و نوش بھی منگواتی ہیں اور مرنے والے کے اوصاف بھی بیان ہو رہے ہیں کھانے پر تبصرہ بھی ہو رہا ہے کہ پلاؤ میں بناسپتی گھی بہت ڈالا ہوا ہے بھاب گلے کا خدا ہی حافظ ہے یعنی گلا تو ضرور خراب ہو گا پھر وہ بیوہ کے بارے میں ہدایت فرماتی ہیں کہ دلہن سے کہو کہ اتنا رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں خواہ مخواہ بے چاری ہلکان ہو رہی ہے۔ بھلا اُس کے رونے سے مرنے والا لوٹ آئے گا۔ پھر وہ پاس بیٹھی ایک خاتون کی رکابی کو دیکھ کر اُسے کہتی ہیں

کرا رہے واہ! تمہارے سالن میں تین تین بوٹیاں اور ذرا میری رکابی دیکھو! یہ چھیچھڑا میری قسمت میں لکھا تھا، ہمیں تو ڈھنگ کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوا۔ پھر وہ مرنے والے کی خوبصورتی، نیکی اور شرافت کا ذکر کرتے ہوئے بیوہ سے مخاطب ہوتی ہیں کہ اے دلہن! گھر میں ہاضمے کی کوئی دوائی یا چورن وغیرہ ہو تو لانا اور اگر چورن نہیں تو بازار سے کوئی کھاری بوتل ہی منگوا دو۔ پھر وہ بیوہ کو روتے دیکھتی ہیں تو اپنی نصیحت دہراتی ہیں کہ اے دلہن! اس طرح تو بین نہ کر، تجھے غم زدہ اور روتا دیکھ کر ہمارے دل پر بھی آری چلتی ہے۔ نظم میں شاعر نے چہلم جیسی تقریبات میں عورتوں کے عمومی رویے کا ذکر خوبصورتی سے کیا ہے کہ کس طرح وہ کھانا بھی ڈٹ کر کھاتی ہیں اور کھانے کے ساتھ ساتھ مرنے والے کی خوبیوں پر بھی تبصرہ کرتی جاتی ہیں۔

مجید امجد

سوانحی حالات

مجید امجد ۲۹، جون ۱۹۱۴ء کو جھنگ مگھیانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد علی محمد محکمہ تعلیم میں ملازم تھے اور والدہ جھنگ کی مشہور علمی اور مذہبی شخصیت میاں نور محمد کی صاحبزادی تھیں۔ مجید امجد ابھی صرف چھ ماہ کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور تین سال کے تھے کہ والد نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے مجید امجد کو گھر کے سکون سے محروم کر دیا اور آپ کو اُن کے نانا میاں نور محمد نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ مجید امجد نے اپنے نانا کے علمی و مذہبی ماحول میں تربیت پائی۔ پانچ سال کی عمر میں قرآنِ مجید، گلستان، بوستان اور پند نامہ پڑھ چکے تھے۔ نانا سے ہی عربی و فارسی صرف و نحو میں دسترس حاصل کی۔ اسی دوران ۱۹۳۰ء میں میٹرک کے بعد گورنمنٹ انٹر کالج جھنگ میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ایف اے کیا اور اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۳۴ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور جھنگ آ کر محکمہ دیہات سدھار میں پہلے پبلسٹی افسر مقرر ہوئے اور پھر ڈپٹی کمشنر کی زیرِ نگرانی شائع ہونے والے ہفت روزہ "عروج" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اگرچہ مجید امجد نے سکول کے زمانے میں ہی شعر کہنا شروع کر دیئے تھے مگر "عروج" کی ادارت کا زمانہ اُن کی ادبی زندگی کا اہم دور ہے کیونکہ اس دور میں شعر و سخن کا مطالعہ اور صحافتی ذمہ داریاں ہی اُن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں امجد "عروج" سے علیحدہ ہو کر ڈسٹرکٹ کونسل جھنگ میں ملازم ہو گئے۔ اور ملک کے اہم ادبی جریدوں میں آپ کا کلام شائع ہونا شروع ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں محکمہ خوراک میں انسپکٹر کے عہدے پر تقرر ہوا اور اسی ملازمت کے دوران فیصل آباد، جڑانوالہ، گوجرہ، سرگودھا، اوکاڑہ، راولپنڈی، لاہور اور ساہیوال

میں محکمے کی خدمت انجام دی۔ اپنے لاہور اور ساہیوال کے قیام کے دوران منیر نیازی کے اخبار "سات رنگ" کو مرتب کرتے رہے۔ خودداری اور قناعت کا یہ عالم تھا کہ اپنے جائز حقوق کے لئے بھی کسی بڑے افسر کی خدمت میں حاضری کو توہین خیال کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں ریٹائرمنٹ کے وقت اے ایف سی کے عہدے پر تھے۔ جبکہ اُن کے کئی جونیر ساتھی ترقیاں پا کر بڑے عہدوں پر پہنچ چکے تھے۔ بالآخر اس فقر و غنا کے پیکر نے ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء کو ساہیوال میں وفات پائی اور ۱۲ مئی ۱۹۷۴ء کو آبائی شہر جھنگ میں مدفون ہوئے۔

تصانیف شبِ رفتہ، شبِ رفتہ کے بعد آج کل اُن کے کچھ کلیات زیرِ اشاعت ہیں۔

محاسنِ کلام

مجید امجد اردو شاعری میں ایک نئے اور جدید لہجے، منفرد سوچ اور رویے کا حامل شاعر ہے۔ امجد کی نظم اور غزل دونوں اپنے متنوع موضوعات، اچھوتے احساسات اور منفرد لہجے کی بدولت اپنے معاصرین سے بالکل الگ اور منفرد نظر آتی ہیں۔ مگر اس توانا فکری اثاثہ اور منفرد شعری سرمایہ رکھنے والے شاعر کو اپنی زندگی میں نہ سمجھا گیا، نہ اہمیت دی گئی اور نہ پذیرائی کے قابل سمجھا گیا۔ لیکن آج اُس کا کمالِ فن ادبی دنیا میں اپنی جدت، وجد آفرینی، انفرادی و اجتماعی غم کی عکاسی اور اپنی معصوم حیرت و تحیّر کے سبب ہر کسی سے اپنا لوہا منوائے ہوئے ہے۔ وہ بجا طور پر نظم کا شاعر ہے مگر اُس کی غزل بھی اپنی توانائی، تغزل اور جامعیت کے اعتبار سے اپنے عہد کے کسی بڑے شاعر سے کم نہیں۔

احساساتِ رنج و غم کی عکاسی اگرچہ غم انسان کے شوریدہ جذبوں اور تند و تیز ولولوں کی تطہیر کرتا ہے مگر یہ شاعر کے حساس دل کو اداسی اور کرب کی ایک مسلسل کیفیت سے بھی دوچار کرتا ہے۔ مجید امجد اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے ہمیشہ غم کی ایسی ہی کیفیت سے دوچار رہا۔ مگر یہ غم قنوطیت کی ذیل میں نہیں آتا۔ وہ زندگی کے عیشِ رفتہ کا ماتم کرتا ہے۔ اور یہ اُس کی شاعری کی ایک مستقل قدر بن جاتی ہے اور یوں اس کی تقریباً تمام نظموں کی فضا حزن انگیز بن جاتی ہے۔

دل نے ایک ایک دکھ سہا تنہا	انجمن انجمن رہا تنہا!
نگاہ اُٹھی تو زمانے کے سامنے ترا روپ	پلک جھکی تو مرے دل کے روبرو ترا غم
طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہیٔ شب	تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم

ـــ جھکیں جو سوچتی پلکیں تو میری دنیا کو — ڈبو گئی وہ ندی جو ابھی بہی بھی نہ تھی

ـــ سنی جو بات کوئی اَن سنی تو یاد آیا — وہ دل کہ جس کی کہانی ابھی کہی بھی نہ تھی

فراق اور تحیّر کا اچھوتا عنصر مجید امجد کی غزل اور اہم عنصر وہ معصوم حیرت ہے جو محبوب سے جدائی کا ردِ عمل ہے اور تحیّر کی یہ کیفیت ایک تسلسل کے ساتھ اُن کی زندگی اور شاعری کے منظر نامے میں موجود رہتی ہے اور یوں فراقِ یار بھی اُن کے لئے ایک مسحور کن تجربہ بن جاتا ہے جس کے کرب اور لذّت دونوں اس کی روح کے لئے ایک جاودانی کیف بن کر اُس کی شاعری میں رچ بس گئے ہیں۔

ـــ جنونِ عشق کی رسمِ عجیب کیا کہنا — میں اُن سے دور، وہ میرے قریب کیا کہنا

ـــ شاید اِدھر سے گزرے، پھر بھی ترا سفینہ۔ — بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر نے بلب کبھی کا

ـــ خیالِ یار تیرے سلسلے نشوں کی رتیں — جمالِ یار تیری جھلکیاں، گلاب کے پھول

ـــ میری زیست پر اُن کے جلووں کے نقش — ابھرتے گئے، دِن گزرتے گئے

جذبۂ عشق کا منفرد اظہار امجد کے ہاں جذبۂ عشق محض خمارِ گندم کا نتیجہ نہیں۔ اس کے محبوب کا پیکر رنگوں، روشنیوں، پھولوں، نغموں اور فطرت کے دیگر متحرک عناصر سے ترتیب پاتا ہے جسے گرفت میں لینا ممکن نہیں اور یہ پیکر کبھی غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی دیارِ شب کے اندھیرے میں ڈولتی ہوئی بنسری کی مدھرے بن کر ماحول کے سکوت کو توڑ دیتا ہے۔ پھر محبوب سے قرب کی خواہش مجید امجد کے ہاں دبی ہوئی آرزوؤں اور سہمی ہوئی تمناؤں کا روپ دھار کر اُن کے اشعار کی صورت میں ڈھل گئی ہے۔

ـــ آ، اک دن میرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر — اِس دشت کے سکوتِ سخن جو سے بات کر

ـــ روشن ترا بیوں میں اترتی ہوا میں آج! — دو چار گام لغزشِ مستانہ چاہیے

ـــ تری سانسوں کی سوغاتیں، بہاریں — تری نظروں کے نذرانے، زمانے

ـــ نگاہ میں بسا بسا، نگاہ سے بچا بچا — رکا رکا، کھچا کھچا، یہ کون میرے ساتھ ہے

جدّت پسندی مجید امجد بلاشبہ اردو غزل کی بدلتی ہوئی روایت کا ایک اہم سنگ میل ہے اس کی جدت پسندی کی بدولت غزل کے فنی اور فکری تناظرے میں اضافہ ہوا۔ مجید امجد کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے غزل میں جدید نظم کا امتداد اور مزاج شامل کیا اور غزل کے مزاج میں نئی علامتیں اور جدید استعارے استعمال کر کے اس کے شعری آہنگ کو عظمت عطا کی۔

؎ اپنے دل کی راکھ چن کر کاش ان لمحوں کی بہتی آگ میں
میں بھی اک سیّال شعلے کے ورق پر لکھ سکوں تفسیرِ دل

؎ نژرخ کی گرد کی تہہ سے اگر کہیں کچھ پھول — کھلے بھی، کوئی تو دیکھے گا، کون دیکھے گا!

؎ میں روز اِدھر سے گزرتا ہوں، کون دیکھتا ہے — میں جب اِدھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

؎ پلٹ پڑا ہوں شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے — نشیبِ زینۂ ایام پر عصا رکھتا

خود کلامی کا مخصوص انداز

مجید امجد کے کلام میں ایک منفرد خصوصیت اُن کا خود کلامی کا انداز ہے۔ خاص طور پر ان کی غزل میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو مخاطب کیا ہے اور اُن کے دکھ ایک لطیف اور نرم لہجے میں زیرِ لبی کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اور یوں اُن کے آشوبِ ذات کے آئینے میں ہر کوئی اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔

؎۱ امجدؔ طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط — اک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

؎۲ غموں کی راکھ سے امجدؔ وہ غم طلوع ہوئے — جنہیں نصیب اک آہِ سحر گہی بھی نہ تھی

؎۳ ضمیرِ خاک میں خفتہ ہے میرا دل امجد — کہ نیند مجھ کو ملی خوابِ رفتگاں کیلئے

سماجی اور معاشرتی مسائل کی ترجمانی

مجید امجد کے ہاں سماجی اور معاشرتی زندگی کا گہرا مطالعہ اور شعور ملتا ہے اور یہ ادراکِ حقیقت انھیں کربِ احساس سے بھی دو چار کرتا ہے اور اُن کا جذبۂ ہمدردی کبھی طنز یہ اور کبھی بغاوت کا لہجہ اپنا کر اُن کے کلام میں ابھرتا ہے اور ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی کی حقیقت پسندانہ تصویریں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔ اُن کی مشہور نظم "شاعر" کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا
گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دنیا
محبت کے دشمن، سماجوں کی دنیا
اگر میں خدا اس زمانے کا ہوتا
تو عنواں کچھ اور اس فسانے کا ہوتا
عجب لطف دنیا میں آنے کا ہوتا

یا نظم "پیش رو" کا یہ بند

اس تخ کدہ یقینِ غم میں
دیکھو یہ شگفتہ دل شگوفے

ماحول نہ کائنات ان کی
ایک ناز نمو ، حیات ان کی

مجید امجد کا رنگِ تغزل | مجید امجد کی غزل میں داخلی گہرائی ، فکری بالیدگی اور معنوی گہرائی کے ساتھ ساتھ ایک شانِ تغزل بھی قاری کے قلب و نظر کو مسحور کرتی ہے ۔ اُن کا یہ رنگِ تغزل اُن کے ذاتی دکھ اور روح کی تشنگی کا نتیجہ ہے ۔ اُن کا یہ دکھ غزل کی روایتی حد بندیوں سے الگ معاشرے کے ہر فرد کے درد مند جذبے کی تمثیل ہے ۔

عمروں کے معمورے میں ہے کوئی ایسا دن بھی جو
روح میں ابھرے پھاند کے سورج کے سیّال سمندر کو

نگاہ اٹھی تو زمانے کے سامنے ترا روپ ۔ پلک جھکی تو میرے دل کے روبرو ترا غم

بنے یہ زہر ہی وجہِ شفا جو تو چاہے ۔ خرید لوں میں یہ نقلی دوا ، جو تو چاہے
تجھے تو علم ہے کیوں میں نے اسطرح چاہا ۔ جو تو نے یوں نہیں چاہا تو کیا ، جو تو چاہے
کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ ۔ مری لحد پر کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

ہری بھری فصلو

حلِ لغات | جگ جگ جیو ۔ ہمیشہ زندہ رہنے کی دُعا ؛ جگ ۔ دنیا ، جہان ؛ شوبھا ۔ شان و شوکت ؛ دھرتی ۔ زمین ، مراد ہے وطن ؛ مان ۔ غرور ، فخر ؛ ارمان ۔ خواہش ؛ آنے والی مست رتوں ۔ آنے والے خوشی کے دن ، روشن مستقبل ؛ مُسکان ۔ مُسکراہٹ ؛ ڈنٹھل ۔ فصل کی خوشبو سے بھری ہوئی ڈالیاں ۔ کھلیان ۔ انبار ، ڈھیر ، وہ جگہ جہاں غلّے کا ڈھیر لگاتے ہیں ؛ جیون سنگ بسو ۔ زندگی کے ساتھ آباد رہو ۔ چندن روپ ۔ چاند جیسی خوبصورت ۔ قرنوں ، صدیوں ۔ دورِ زماں ۔ زمانے کے مختلف دور ؛ شاخِ جبیں کا خم ۔ ایک خوبصورت ٹہنی کا جھکنا ؛ عظمتِ فطرت ۔ فطرت کی بڑھائی ؛ طنطنۂ آدمؑ ۔ حضرت آدمؑ کی عظمت ، بزرگی ، شان و شوکت ، مراد ہے انسان کا بلند مقام ؛

نظم کا تعارف اور تشریح

تعارف | مجید امجد نے اپنی اس آزاد نظم میں اگرچہ ہرے بھرے کھیتوں کو خطاب کیا ہے مگر ہرے بھرے کھیت آبادی اور خوشحالی کی علامت ہوتے ہیں جس ملک میں کھیت آباد ہوں گویا وہ خوشحال ہوتا ہے ۔ شاعر جب اپنے دیس کے کھیتوں کی شادابی کو ہمیشہ اسی حالت میں دیکھنے

کی دعا کرتے ہیں تو گویا اپنے وطن کی خوشحالی اور ہم وطنوں کی خوشحال زندگی کی دعا کرتے ہیں۔ نظم میں شاعر نے لوک گیتوں کا سا رسیلا اور میٹھا لہجہ اختیار کر کے اس کے لفظی اور معنوی حسن کو بھرپور بنایا ہے۔

بند نمبر ۱

ہری بھری فصلو ! جگ جگ جیو، پھلو !
ہم تو ہیں بس دو گھڑیوں کو اس جگ میں مہمان
تم سے ہے اس دیس کی شوبھا، اس دھرتی کا مان
دیس بھی ایسا دیس کہ جس کے سینے کے ارمان
آنے والی مست رتوں کے ہونٹوں پر مسکان
جھکتے ڈنٹھل، پکتے بالے، دھوپ رچے کھلیان
ایک ایک گھروندا خوشیوں سے بھرپور جہان
شہر شہر اور بستی بستی جیون سنگ بسو
چندروپ سجو ! دامن دامن، پلو پلو، جھولی جھولی ہنسو
ہری بھری فصلو ! جگ جگ جیو، پھلو،

تشریح

شاعر اپنے وطن کی ہری بھری لہلہاتی فصلوں کو دعا دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے مرے وطن کی ہری بھری فصلو! تم ہمیشہ شاداب، آباد اور اسی طرح لہلہاتی رہو، چونکہ تم سے ہی اس وطن کی شان و شوکت اور خوبصورتی ہے اور تم ہی سے اس وطن کی قدر و منزلت اور آبرو قائم ہے۔ ہمارا کیا ہے ہم تو تھوڑے وقت کے لئے اس دنیا میں مہمان کے طور پر آتے ہیں اور پھر کوچ کر جاتے ہیں۔ تمہاری شادابی سے میرا پیارا وطن مستقبل کے روشن اور خوشیوں بھرے دنوں کا امین ہوگا، ہر طرف خوشی اور مسرت کا دور دورہ ہوگا۔ گویا آنے والے خوبصورت دنوں کی مسکراہٹ آج ہی کھیتوں کی شادابی کی صورت میں وطن کے ہونٹوں پر اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ میرے وطن کے کھیت پکی ہوئی سنہری بالیوں والی فصلوں سے جھوم رہے ہیں۔ دھوپ میں چمکتے کھلیان بھی بہار دکھا رہے ہیں اور ہر کسان کا گھر خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا ہے یوں لگتا ہے گویا ساری دنیا کی خوشیاں ہر کسان کے گھر میں اتر آئی ہوں۔ میرے وطن کو شاد و آباد کرنے والی فصلو! میری دعا ہے کہ تم میرے وطن کے ہر گاؤں، بستی اور شہر میں ہمیشہ اسی طرح خوشحالی کی پیامبر بن کر لہلہاتی رہو، ہنستی مسکراتی رہو اور چمکتے چاند کی مانند اپنے حسن و جمال کی بہار دکھاتی رہو، ہمیشہ ہمیشہ شاد اور آباد رہو۔

بند نمبر ۲:

قرنوں کے بجھتے انگار، اک موج ہوا کا دم
صدیوں کے ماتھے کا پسینہ، پھولوں پر شبنم

دورِ زماں کے لاکھوں موڑ، اک شاخِ حسیں کا خم
زندگیوں کے تپتے جزیروں پر رکھ رکھ کے قدم
ہم تک پہنچی عظمتِ فطرت، طنطنۂ آدم
جھومتے کھیتو! ہستی کی تقدیرو! رقص کرو
دامن دامن، پلو پلو، جھولی جھولی ہنسو
چندن روپ سجو — ہری بھری فصلو!
جگ جگ جیو، پھلو

تشریح صدیوں کے عذاب گزرے، شعلے بجھے تب کہیں جاکر اس مادرِ وطن کی ہواؤں میں خوش خرامی کا غرور پیدا ہوا۔ صدیوں تک محنت کشوں کی محنت کے بعد یہ دن آئے کہ ہماری ہری بھری فصلوں پر شبنم کے قطرے بھی سجنے لگے۔ زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلیں، انقلاب برپا ہوئے تب کہیں ہمارے کھیتوں کے پودوں میں یہ خوبصورتی اور حسن پیدا ہوا کہ ہر شاخ نزاکت سے لچکنے لگی۔ نہ جانے نسلِ انسانی نے زندگی کے کتنے کڑے امتحان دیئے اور کیسے کیسے عذاب برداشت کئے اور آج ہماری قوم کو یہ شرف اور عزت حاصل ہوئی کہ آج یہ قوم عظمتِ انسانی کی امین اور فطرت کی شان و شوکت سے سربلند ہے۔ اے لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیتو! تم ہی ہماری اس زندگی کی خوش نصیبی اور تقدیر ہو، لہٰذا تمہارے لہراتے ہوئے خوشوں کا رقص بھی ہماری خوش نصیبی کی علامت ہے۔ میری دعا ہے کہ تم سدا اسی طرح رقص کرتے رہو اور ہر طرف تمہاری خوشیوں کا نور پھیلا ہے تمہارا روپ چاند کی مانند جگمگاتا رہے اور تم اسی طرح شاد و آباد رہو۔

آٹو گراف

حلِ لغات خود نوشت۔ اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے؛ کتابچے۔ یہاں مراد ہے آٹو گراف بک (چھوٹی کتاب)؛ منتظر۔ انتظار کرتے ہوئے؛ مہیب۔ خوفناک، ڈراؤنے؛ پُرہراس۔ خوف سے سہمے ہوئے؛ بیاضِ آرزو بکف۔ خواہشوں کی کتاب اپنے ہاتھوں میں لئے، مراد ہے آٹو گراف بک کھولے ہوئے؛ نارسا۔ جن کی رسائی نہ ہو، جن کی پہنچ نہ ہو؛ دم بہ دم۔ ہر سانس؛ تمکنت۔ شان و شوکت؛ زرنگار۔ سنہرے نقش و نگار والے؛ نازِ بے نیاز۔ بے نیازی کی شان دکھاتے ہوئے؛ حروفِ کج تراش۔ ٹیڑھے میڑھے حروف کی لکھائی؛ مہ وش۔ چاند جیسے چہرے والی، خوبصورت خاتون؛ بصد غرور۔ بہت غرور اور نکبر سے؛ کلک۔ قلم۔ پابہ گل۔ جس کے پاؤں مٹی میں ہوں مراد ہے مفلس آدمی؛ رفعتِ مقام، سب کا بلند ہونا؛ شہرتِ دوام۔ ہمیشہ کی شہرت؛ لوحِ دل۔

نظم کا تعارف اور تشریح

تعارف مجید امجد نے اس آزاد نظم میں نہایت دلنشین انداز میں اُن شوخ و شنگ لڑکیوں کا ذکر کیا ہے جو کرکٹ کے میدان میں مشہور کھلاڑیوں سے آٹو گراف لینے جاتی ہیں اُن کے انداز میں ایک انجانا اشتیاق اور آنکھوں میں ایک خاص چمک ہوتی ہے اور آٹو گراف لیتے ہوئے وہ اِن کھلاڑیوں کی شخصیت سے اِس حد تک مرعوب ہوتی ہیں کہ اُن کی انگلیاں تک کانپ رہی ہوتی ہیں اور کھلاڑی ہیں کہ بے نیازی سے آٹو گراف بُک کے صفحے پر آڑے ترچھے حروف کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ پھر شاعر کو ان کھلاڑیوں کے مقابلے میں اپنی ذات حقیر اور کم مایہ محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ نہ شہرت رکھتا ہے اور نہ کسی کی توجہ کا مرکز ہے۔

بند نمبر ا:-
کھلاڑیوں کے خود نوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لئے ہوئے
کھڑی ہیں منتظر حسین لڑکیاں
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر حسین لڑکیاں

تشریح کرکٹ کے میدان کے باہر کتنی ہی حسین و جمیل لڑکیاں اپنے ڈھلکتے دوپٹوں سے بے نیاز نہایت اشتیاق سے کھلاڑیوں کے میدان سے باہر آنے کا انتظار کر رہی ہیں تاکہ وہ اُن سے انہی کی تحریر میں کوئی یادگار جملہ اپنی آٹو گراف بُک میں لے سکیں یا پھر اُن کے دستخط ہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

بند نمبر ۲:-
مہیب پھاٹکوں کے ڈولتے کواڑ چیخ اُٹھے
ابل پڑے الجھتے بازوؤں چٹختی پسلیوں کے پر ہراس قافلے
گرے، بڑھے، مڑے، بھنور ہجوم کے

تشریح جب میدان کی طرف کھلنے والے خوفناک بھاری گیٹ کے کواڑ چیخے تو کھلاڑی کو ایک نظر قریب سے دیکھنے کے لئے کتنے ہی لوگ لپکے۔ ہجوم کا یہ عالم کہ لوگوں کے بازو آپس میں الجھ رہے تھے اور پھر اس دھکم پیل میں کچھ لوگ آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ خوف زدہ ہو کر واپس مڑ گئے۔

بند نمبر ۳:-
کھڑی ہیں یہ بھی راستے پہ اک طرف
بیاضِ آرزو بکف!

نظر نظر میں نارسا پرستشوں کی داستاں

لرز رہا ہے دم بدم — کمانِ ابرواں کا خم

تشریح یہ حسین دوشیزائیں اپنے ہاتھوں میں اپنی خواہشوں کی بیاض یعنی آٹو گراف بک لئے ہوئے اسی راستے کے ایک طرف کھڑی ہیں۔ ان کی نظروں سے اپنے محبوب کھلاڑیوں تک نہ پہنچ سکنے کی کہانی کا دکھ پڑھا جا سکتا ہے۔ ان کے دلوں اور سانسوں کی دھڑکنیں تیز ہو چکی ہیں اور ان کے ابروؤں کی کمان احساسِ محرومی کی وجہ سے خم ہو چکی ہے۔

بند نمبر ۴: کسی عظیم شخصیت کی تمکنت

حنائی انگلیوں میں کانپتے ورق پہ جھک گئی

تو زرنگار پلوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبض رک گئی

تشریح جب کوئی عظیم اور شان و شوکت کا مالک کھلاڑی آٹو گراف دینے کے لئے ان کے کانپتے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کتاب کے ورق پر کچھ لکھنے لگتا ہے تو ان دوشیزاؤں کے خوشنما رنگین لبادوں سے جھانکتی ہوئی کلائیوں کی نبض تیز ہو جاتی ہے اور جوشِ مسرت سے ان کا وجود کانپنے لگتا ہے۔

بند نمبر ۵: کوئی جب ایک نازِ بے نیاز سے — کتابچوں پہ کھینچتا چلا گیا

حروف کج تراش کی لکیر سی

تو تھم گئیں لبوں پہ مسکراہٹیں شریر سی

تشریح جب کوئی مشہور کھلاڑی بڑی بے نیازی سے ان کی آٹو گراف بک پر آڑے ترچھے حروف کھینچتا چلا گیا تو ان حسیناؤں کے لبوں پر آئی ہوئی شریر مسکراہٹیں کچھ دیر کے لئے رک سی گئیں۔

بند نمبر ۶: وہ باؤلر ایک مہوشوں کے جمگھٹوں میں گھر گیا

وہ صفحۂ بیاض پر

بصد غرور کلکِ گوہریں پھری

حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں وکٹ گری

تشریح ذرا اس مشہور باؤلر کی شان ملاحظہ ہو کہ وہ حسین و چنچل لڑکیوں کی ٹولی میں کھڑا ہوا کسی کی آٹو گراف بک میں کچھ ایسے غرور اور فخریہ انداز میں لکھ رہا ہے کہ گویا ان حسیناؤں کی مسکراہٹوں میں پھنسے ہوئے بال سے بھی کوئی وکٹ گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ باؤلر آٹو گراف

دے رہا ہے اور حسین لڑکیاں ہنس رہی ہیں تو یوں لگ رہا ہے جیسے کھیل کے میدان میں کوئی وکٹ گر گئی ہو۔

بند نمبر ۷:۔ میں اجنبی ۔ میں بے نشاں

میں پا بہ گل

نہ رفعتِ مقام ہے نہ شہرتِ دوام ہے

یہ لوحِ دل ، یہ لوحِ دل

نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے

تشریح شاعر کرکٹ کے اس میدان میں کھلاڑیوں کی شان و شوکت اور پذیرائی کو دیکھتا ہے تو اُسے اپنا آپ اس درجہ حقیر نظر آتا ہے کہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ میں تو یہاں ایک ایسا اجنبی ہوں جو بے نشاں ہے اور جسے کوئی جانتا تک نہیں اور میرا وجود تو گویا خاک میں پیوست ہے۔ مجھے نہ ان کی طرح دائمی شہرت حاصل ہے نہ مقبولیت اور نہ ہی حسن و جمال کے اِن پیکروں میں میرا چرچا ہے بلکہ میری لوحِ دل تو بیچاری بالکل سادہ ہے۔ اس پر کسی کی محبت اور گرمجوشی کا کوئی نشان نہیں اور نہ ہی دل کی اِس سادہ لوح پر کسی کے دستخط ثبت ہیں۔

پکار

حلِ لغات پنکھ ۔ پرندے کے پر ، چِپلائی ۔ چہچہانا ، موت کا جھولا جھولنا ۔ خطرناک کھیل کھیلنا جس میں موت کا خطرہ ہو ، بامِ اجل ۔ موت کی چھت ، سپنا ۔ خواب ، بے سُود ۔ فضول بے کار ،

بند نمبر ۱:۔ کالی چونچ اور نیلے پیلے پنکھوں والی

چوں چوں ، چِچر چِچر ، چِپلائی "لالی"

بیٹھے بیٹھے ، اڑ کر اڑتے اڑتے ، مڑ کر

بجلی کے اک تار پہ آکر بیٹھ گئی ہے

موت کا جھولا جھول رہی ہے

تشریح شاعر ایک کالی چونچ اور نیلے پیلے پروں والی "لالی" کو دیکھتا ہے جو چوں چوں کرتی اور خوشی کے گیت الاپتی اِدھر اُدھر پھدکتی پھرتی ہے۔ کبھی یہاں بیٹھتی ہے اور کبھی اڑ کر وہاں جا بیٹھتی ہے اور پھر بے نیازی سے بجلی کے ایک تار پر جا بیٹھتی ہے اور اُسے یہ بھی احساس نہیں کہ وہ موت کا جھولا جھول رہی ہے یعنی برقی تار میں سے گزرنے والا کرنٹ کسی وقت بھی اُسے موت کی نیند سلا سکتا ہے مگر وہ اس خطرے سے بھی بے نیاز ہے۔

بند نمبر۲:- میرے دل سے چیخ اک ابھری، میں للکارا
(جیسے کوئی بجے نقارہ)
میری صدا پر بام اجل سے کندے تول کے اڑ گئی "لالی"
نیلے پیلے پنکھوں والی

تشریح: میں نے جب اس شوخ و چنچل پرندے کو موت کے اس قدر قریب دیکھا تو بے اختیار میں نے چیخ کر اُسے خبردار کرنے کی کوشش کی۔ جب میری آواز ایک نقارے کے سے شور کی طرح بلند ہوئی تو لالی خوفزدہ ہو کر موت کی اس چھت سے (یعنی بجلی کے اس تار سے) پر تول کر اڑ گئی۔ اس طرح یہ نیلے پیلے پروں والی "لالی" موت سے بچ کر زندگی کے کھلے میدان میں نکل گئی۔

بند نمبر۳:- اور اک تم ہو
انگاروں پر بیٹھے ہو اور پھولوں کے سپنوں میں گم ہو
میرے دل کی اک اک چیخ نہیں بے سود پکارے

تشریح: شاعر اس بظاہر معمولی سے واقع کا اپنی ذات سے تقابل کرتا ہے، تو خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے کہ تم ہو کہ نہ جانے کب سے زندگی کا عذاب سہہ رہے ہو زندگی تمہارے لئے دہکتے انگاروں سے کم نہیں اور تم ان انگاروں پر بیٹھ کر بھی پھولوں کے خواب دیکھ رہے ہو اور اس عذاب سے دوچار ہو کر بھی روشن مستقبل کی امید لگائے بیٹھے ہو میرا دل ہے کہ چیخ چیخ کر زندگی کے خطرات سے آگاہ کر رہا ہے مگر تم پر میرے دل کی اس تنبیہ اور چیخ و پکار کا ذرا بھر بھی اثر نہیں ہو رہا۔

احسان دانش

حل لغات: پرسشِ غم —— دکھ تکلیف کے بارے میں دریافت کرنا۔ حال پوچھنا ؎ آگہی۔ جاننا، علم ہونا ؎ شکوۂ بے رخی۔ محبوب کے توجہ نہ دینے کا گلہ ؎ قیمتِ بندگی۔ عبادت گذاری کی قیمت، عبادت کا صلہ ؎ حاصلِ بندگی۔ زندگی کا سرمایہ۔ زندگی کا مقصد ؎ ماہتاب۔ چاند۔ محبوب کے لیئے اشارہ ؎ لہو کے گھونٹ پینا۔ غصے کو برداشت کرنا، غصہ پی جانا ؎ لبوں کو سینا۔ خاموش رہنا، کچھ نہ بولنا ؎ دل لگی۔ کھیل ؎ ملول۔ غم زدہ۔ افسردہ ؎ دورِ بہار۔ موسمِ بہار کا خوشیوں بھرا زمانہ

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱:- پرسشِ غم کا شکریہ کیا تجھے آگہی نہیں   تیرے بغیر زندگی درد ہے زندگی نہیں

تشریح: شاعر محبوب کو گلے کے انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے دوست! بالآخر تمہیں میرا خیال آ ہی گیا کہ تم میرے غم کا احوال پوچھنے آئے ہو۔ پھر طنزاً شکریہ ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حالِ غم پوچھنے کے لیئے تمہارا بہت بہت شکریہ، کاش تم نے کبھی یہ بھی غور کیا ہوتا کہ تمہارے بغیر میری زندگی کا ہے کو ہے یہ تو ایک درد کی تصویر ہے۔ کیا واقعی تمہیں اِس حقیقت کا علم نہیں کہ تمہارے بغیر میرے دل پر کیا گذرتی ہے یا تم تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہو۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ بقول شاعر۔

؎ گذر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن   بہت اداس، بہت بے قرار گذرے گی

شعر نمبر ۲:- دور تھا اک گذر گیا نشہ تھا اک اُتر گیا   اب وہ مقام ہے جہاں شکوۂ بے رخی نہیں

تشریح: ایک عاشقِ صادق کو ابتدائے عشق کی کچھ صعوبتیں پریشان کرتی ہیں پھر یہ تلخیوں اور سختیوں کا سلسلہ کچھ ایسا طویل ہو جاتا ہے کہ دوست کی جفاؤں اور ظلم وستم پر شکایت کرنا بھی بے جا لگتا ہے۔ شاعر خود کو ایسے ہی مقامِ عشق پر پاتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب ہمیں اپنے جذبۂ عشق کی صداقت کا زعم تھا لیکن اب عشق کی سختیاں سہتے سہتے یہ حال ہے کہ محبوب کی بے رخی، جفا کاری اور ظلم وستم کا گلہ کرنے کا احساس تک مٹ چکا ہے۔ بقولِ حضرتِ غالب

؎ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

شعر نمبر ۳:- تیرے سوا کروں پسند کیا تیری کائنات میں   دونوں جہاں کی نعمتیں قیمتِ بندگی نہیں

تشریح: یہ شعر حمدیہ ہے اور اِس میں احسان دانش اللہ تعالےٰ سے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ تعالےٰ کی ذاتِ گرامی! تیری اس کائنات میں جہاں ہر طرف تیری ذات کا ظہور ہے میری پسند کوئی اور ہو اور میری سوچوں کا اور میری عبادت کا محور و مرکز کوئی اور ہستی ہو یہ ناممکن ہے۔ میرے نزدیک تو تیری بندگی کا یہ مقام ہے کہ اگر تیری بندگی کے بدلے کوئی مجھے دونوں جہانوں کی ساری نعمتیں بھی دے دے تو بھی میں اِن کو ٹھکرا کر تیرے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤں۔ گویا شاعر کے نزدیک اللہ کی عبادت اور بندگی ہر نعمت سے مقدم ہے۔

شعر نمبر ۴:- لاکھ زمانہ ظلم ڈھائے وقت نہ وہ خدا دکھائے

جب مجھے ہو یقیں کہ تو حاصلِ زندگی نہیں

تشریح: اس شعر میں بھی عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں کی کیفیت موجود ہے شاعر محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ زمانہ مجھ پر چاہے جتنے بھی ظلم و ستم کیوں نہ ڈھائے، زیادتی کا ہر ہتھکنڈہ آزما کر دیکھ لے مجھے اپنے جذبے کی صداقت پر یقین ہے کہ میں ثابت قدم رہوں گا۔ مگر خدا نہ کرے کہ کبھی وہ دن آئے کہ جب مجھے یقین ہو جائے کہ اے دوست! تو اب میری زندگی کا حاصل نہیں ہے۔ گویا مجھے یقین ہے کہ میری زندگی میں وہ دن کبھی نہیں آئے گا جب تیرا خیال اور جستجو میری منزل نہ رہے گی

شعر نمبر ۵ :- ایک وہ رات تھی کہ جب تھا مرے گھر وہ ماہتاب

ایک یہ رات ہے کہ اب چاند ہے چاندنی نہیں

تشریح: احسان دانش محبوب کے لیئے چاند کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زمانے کا انقلاب ملاحظہ ہو کہ ایک رات وہ تھی جب وہ چاند جیسے روشن چہرے والا محبوب میرے گھر میں موجود تھا اور اس کے حسن کی تابانیوں سے میرا تاریک گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا مگر قسمت کی گردش اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ فراقِ دوست میں ہماری راتوں کا یہ عالم ہے کہ آج رات آسمان کا چاند روشن ہے مگر ہمیں یوں لگتا ہے کہ ہر طرف ایسی تاریکی ہے کہ بڑھتی جارہی ہے یہاں تک کہ اس تاریکی نے ہماری روح اور دل میں بھی ڈیرہ ڈال دیا ہے۔

شعر نمبر ۶ :- زخم پہ زخم کھا کے جی اپنے لہو کے گھونٹ پی

آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں

تشریح: عشق میں ایک عاشقِ صادق کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے اس کا اندازہ شاعر کی اس خود کلامی سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ خود سے کہہ رہا ہے کہ اگر عشق کا راستہ اختیار کیا ہے تو ہر سختی اور ہر تلخی برداشت کرنا ہو گی، زخم کے بعد زخم کھا کر بھی فریاد کرنے کی بجائے غصّہ تھوکنا ہو گا، ہر زیادتی کے جواب میں لبوں کو سینا ہو گا اور ہر ذلّت و رسوائی برداشت کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرنا ہو گا کیونکہ یہ عشق ہے کوئی دل لگی یا مذاق کا کھیل نہیں ہے اس میں تو وفاداری ایک چاہنے والا کا ایمان ہوتا ہے میر نے کیا خوب کہا ہے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ۔۔۔ آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا

شعر نمبر ۷ :- دیکھ کے خشک و زرد پھول دل ہے کچھ اس طرح ملول

جیسے تری خزاں کے بعد دورِ بہار ہی نہیں

تشریح سوکھے ہوئے زرد پھول کو دیکھ کر دل کچھ اس طرح پریشان اور افسردہ ہو گیا کہ دنیا کی بے ثباتی اور حسن و جوانی کے ختم ہو کر پھر کبھی نہ لوٹنے کا یقین دل میں پختہ ہوتا چلا گیا۔ اور اے حسن و جوانی کے پیکر میرے محبوب! یہ سوچ کر ہی میرے دل پر قیامت گذر گئی کہ جب ایک دفعہ تیرا حسن وجمال خزاں کی زد میں آگیا تو پھر اس پر کبھی بھی بہار نہیں آئے گی گویا میرے لیئے یہ احساس ہی تکلیف دہ تھا کہ ایک نہ ایک دن تیرا حسن بھی زوال پذیر ہو جائے گا۔

احمد ندیم قاسمی

شباب کے پھُول

حلِ لغات رہگزر ــــ راستہ ؛ افق۔ دور جہاں زمین آسمان ملتے نظر آتے ہیں ؛ مہکار۔ خوشبو ؛ گردبادِ صحرا۔ صحرا کے بگولے ؛ شفق۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے کے بعد افق پر پھیلی ہوئی سرخی ؛ پھریرے۔ پرچم ؛ لبادے۔ لباس ؛ گردش۔ چکر۔ حرکت۔

نظم کا تعارف اور تشریح

تعارف احمد ندیم قاسمی کی یہ نظم عہدِ جوانی کے گذرے لمحوں کی صدائے بازگشت ہے۔ شاعر کی زندگی خزاں رسیدہ ہے اور وہ اپنے اِس بڑھاپے میں جوانی کی پُر بہار یادوں سے اپنی جوانی مانگتا ہے جوانی۔ جس میں مسرت و شادمانی کے خوش رنگ پھول کھلے تھے اور اُس کے تشنہ جذبے اُس کے جوان قلم سے شباب کے پھول بن کر ٹپکے تھے۔ پھر اُس کی امنگیں، خوش آئند امیدیں اور پختہ ارادے گل رنگ بہاروں کا منظر پیش کرتے تھے۔ شاعر حسرت سے سوچتا ہے کہ کاش میری زندگی کی خزاں میری جوانی کے اِن پھولوں کو لوٹا دے۔

بند نمبر ۱:۔ میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں
وہ پھول جن سے بہار کی رہگزر پہ میں نے دیے جلائے
بہار کی دیویوں کے قدموں کی چاپ کانوں میں گونجتی تھی

مرے ترستے ہوئے خیالوں کے آسمانوں میں گونجتی تھی
افق تک اپنے قلم سے میں نے شباب کے پھول یوں بچھائے
کہ جب بہاریں یہاں سے گزریں تو میری جھکار ساتھ جائے
میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں

تشریح: میں کہ بڑھاپے کی دہلیز پار کر چکا ہوں، سوچتا ہوں کہ میری زندگی کو خزاں نے اجاڑ کر رکھ دیا ہے کاش ایسا ہوتا کہ یہ خزاں میری جوانی کے پھول لوٹا دیتی تو کیا ہی لطف آتا کیونکہ جوانی کے انہی پھولوں سے میں نے بہاروں کے راستوں کو روشن کیا تھا اور یہ وہ حسین زمانہ تھا کہ ہر لمحہ مجھے بہاروں جیسی خوش رنگ مسرتوں اور شادمانیوں کی چاپ سنائی دیتی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا گویا میں دنیا بھر کی بہاروں کا مالک بننے والا ہوں اور میرے تشنہ خیالات اور پیاسے ارمان میرے قلم سے شعری فن پاروں کی صورت میں ٹپکتے تھے اور اپنے جواں فکر وفن کے ذریعے میں زندگی کی بہاروں کی رنگینی اور رعنائی میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ غرض میرا عہدِ جوانی میرے جوش و جذبے کی دلفریب یادگاریں تھیں جن پر میرے بڑھاپے کی خزاں چھا چکی ہے اے کاش میری زندگی کی یہ خزاں میری جوانی کا یہ خوبصورت زمانہ مجھے لوٹا دیتی۔

بند نمبر ۲:۔ وہ پھول جن پر بہار کے روپ میں چلے گردبادِ صحرا
وہ پھول وہ میرے شاہپارے ۔ مری امیدیں، مرے ارادے
شفق میں ڈوبے ہوئے بھرے، لہو میں بھیگے ہوئے لبادے
یہاں سے وہ قافلہ نہ گزرے، فضا میں گونجی تھی چاپ جن کی
میں عمر بھر منتظر رہا ہوں، گواہ گردش ہے رات دن کی
میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں

تشریح: شاعر اپنی جوانی کے زمانے کے ان یادگار لمحوں کو شباب کے پھول قرار دیتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ جوانی کے ان خوبصورت لمحوں میں صحرا کے بگولے بھی بہاروں کے روپ میں محوِ سفر تھے یعنی میں نے اپنی جوانی کے زمانے کے صحرا کی صعوبتوں اور سختیوں کو خوش دلی سے برداشت کیا تھا، میری جوانی کے یہ دن میری امیدوں، امنگوں اور پختہ عزم و استقلال کے جیتے جاگتے نمونے تھے جوانی میں زندگی کتنی حسین تھی ہر چیز گل رنگ نظر آتی تھی اور ہر طرف شفق اپنی رنگینیاں اور رعنائیاں بکھرائے ہماری منتظر رہتی تھی میری جوانی کے ان حسین لمحوں پر اگرچہ بڑھاپے کی خزاں

طاری ہو چکی ہے، مگر میں ہر لمحہ، ہر گھڑی آج بھی منتظر ہوں کہ کون جانے کب جوانی کے ایسے قافلے کو میں آج اپنے قریب سے گذرتا دیکھ سکوں یعنی کاش ایسا ہوتا کہ نوجوان نسل بھی میرے ہی جیسے جوش و جذبے اور امنگوں سے اپنا عہدِ جوانی گذارے اور شاید اسی طرح میری زندگی کی خزاں مجھ پر مہربان ہو کر میرے عہدِ جوانی کے خوش رنگ اور یادگار لمحوں کو اسی صورت میں مجھے واپس کر دے اور یہی سوچ کر میں آج بھی بے چین و بے قرار ہوں۔

نظم میں شاعر اپنی جوانی کے دنوں کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے انہیں زندگی کی خزاں سے پھر مانگ رہا ہے گویا وہ جوانی کی طرح کی پُر جوش زندگی گذارنے کا خواہش مند ہے۔

سیّد ضمیر جعفری

پُرانی موٹر

حلِ لغات

بار —— بوجھ۔ مردار۔ مرے ہوئے نظر آنے والے۔ بدبختی۔ بدنصیبی۔ بینِ جسم و جاں۔ جسم اور جان کے درمیان۔ دو طرفہ ندامت۔ کئی طرح کی شرمندگی۔ ملامت۔ بُرا بھلا کہنا۔ وفائے دوستاں۔ دوستوں کا خلوص اور محبت۔ بہرِ مشقت۔ محنت کے لیئے۔ زورِ دستِ دوستاں۔ دوستوں کے ہاتھوں کی قوت۔ جکڑ کے لانا۔ باندھ کر لانا۔ اذیت۔ دکھ تکلیف۔ شادماں ہونا۔ خوش ہونا۔ مغلوبِ گماں۔ شک و شبہ میں مبتلا ہونا۔ تعالیٰ اللہ۔ اللہ تعالیٰ۔ بہ طرزِ عاشقانہ۔ عاشقوں کی طرح۔ بہ رنگِ دلبرانہ۔ محبوب کی طرح۔ روپوش ہونا۔ چھپ جانا۔ لغزشِ مستانہ۔ دیوانوں کی سی حرکتیں۔ دمِ رفتار۔ چلتے وقت۔ نظامِ زندگی۔ زندگی کے معمولات۔ تہہ و بالا۔ الٹ پلٹ۔ بکھرا ہوا۔ عالم۔ حالت۔ دنیا۔ وجد و حال۔ بے خودی کی حالت میں جھومنا۔ شکستہ ساز۔ موسیقی کے ٹوٹے ہوئے آلات۔ محشرِ نغمات۔ بیشمار اور طرح طرح کے گیتوں کا مجموعہ۔ غمِ دوراں۔ زندگی کے غم۔ زمانے کی تلخیاں۔ چکرا جانا۔ سر گھوم جانا۔ بے ہوش ہو جانا۔ روگ پالنا۔ کسی مرض میں مبتلا ہو جانا۔ زراہِ قدردانی۔ عزت بڑھانے کے لیئے۔ حوصلہ افزائی کے لیئے۔ خجل۔ شرمندہ۔ سخت جانی۔ جفا کشی۔ بے حیائی کی زندگی۔ مرگِ ناگہانی۔ اتفاقی موت۔ وقتِ خرام۔ چلنے کا وقت۔ رہرو۔ مسافر

نظم کا تعارف اور تشریح

تعارف سیّد ضمیر جعفری اردو کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کا طنز بھرپور اور مزاح شگفتگی کی شان لیئے ہوتا ہے۔ اُن کی نظموں کے موضوعات کا انتخاب اُن کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ زیر مطالعہ نظم "پرانی موٹر" بھی اپنے موضوع اور پھر اس موضوع پر اُن کی منفرد شگفتہ گوئی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ نظم کی ہیئت "مسدس" ہے۔ مسدس اُس صنفِ نظم کو کہتے ہیں جس میں ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہو۔ مسدس کے ایک بند میں پہلے چار مصرعے ایک ہی ردیف قافیے میں ہوتے ہیں جبکہ آخری دو مصرعوں کا شعر الگ ردیف اور قافیے میں ہوتا ہے۔ یہ نظم ایسے کئی بندوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔

بند نمبر ۱:- عجب اک بارسا، مردار پہیوں نے اٹھایا ہے
اسے انساں کی بدبختی نے جانے کب بنایا ہے
نہ ماڈل ہے، نہ باڈی ہے، نہ پایہ ہے، نہ سایا ہے
پرندہ ہے جسے کوئی شکاری مار لایا ہے
کوئی شے ہے کہ بین جسم و جاں معلوم ہوتی ہے
کسی مرحوم موٹر کا دھواں معلوم ہوتی ہے

تشریح شاعر تعارف کروانے کے انداز میں کہتا ہے کہ یہ جو بظاہر موٹر نظر آتی ہے، اصل میں اس کے بے جان پہیوں نے ایک عجیب سا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ اور اس موٹر کو انسان کی بدنصیبی نے نہ جانے کب بنایا ہوگا۔ کیونکہ یہ نظر تو موٹر ہی آتی ہے مگر اس کا نہ کوئی ماڈل معلوم ہے کہ اسے کس سن میں بنایا گیا نہ اس کی اصل باڈی کی کوئی صورت نظر آتی ہے اور اس کی پائیداری بھی مشکوک ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ ایک ایسا پرندہ ہے جسے کوئی شکاری آسانی سے شکار کر کے لے آئے۔ یہ جان اور جسم کے درمیان کی کوئی چیز ہے۔ شاعر طنزاً کہتا ہے کہ یہ یقیناً موٹر نہیں بلکہ کسی مرحوم موٹر کا دھواں ہے یعنی بظاہر موٹر کا ڈھانچہ تو ہے مگر کارکردگی کے اعتبار سے یہ مایوس کن ہے۔

بند نمبر ۲:- یہ چلتی ہے تو دو طرفہ ندامت، ساتھ چلتی ہے
بھرے بازار کی پوری ملامت، ساتھ چلتی ہے
بہن کی التجا، ماں کی محبت ساتھ چلتی ہے

وفائے دوستاں بہر مشقت ، ساتھ چلتی ہے
بہت کم اس خرابے کو خراب انجن چلاتا ہے
عموماً زور دست دوستاں ہی کام آتا ہے

تشریح: شاعر اس پرانی موٹر کے چلنے کا نقشہ کھینچتا ہے کہ جب یہ چلتی ہے تو کیا بتائیں کیسی کیسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پورے بازار کے لوگ اس کے چلنے پر لعنت ملامت کرتے ہیں کیونکہ اس کا شور لوگوں کی برداشت سے باہر ہے اور ہم جو اسے چلا رہے ہوتے ہیں تو ہمارے ساتھ ہماری ماں اور بہن کی دعائیں اور محبت بھی ہوتی ہے۔ یعنی ہم اس موٹر پر باہر نکلیں تو وہ ہماری سلامتی کی دعائیں کرتی رہتی ہیں اور اسے چلتی رکھنے کے لیئے ہمارے دوستوں کی محنت اور مشقت بھی ہمارے ساتھ رہتی ہے کیونکہ اس بد بخت کو اس کا ہمیشہ خراب رہنے والا انجن کم ہی چلاتا ہے بلکہ دوستوں کے بازوؤں کی قوت ہی اسے چلانے کے کام آتی ہے کیونکہ اسے چلانے اور پھر چلتا رکھنے کے لیئے دوستوں کے دھکے ہی کام آتے ہیں اور اس طرح ہمیں اپنے دوستوں کو آزمانے کا بھی موقع مل جاتا ہے۔

بند نمبر ۳ :- کبھی بیلوں کے پیچھے جوت کر چلوائی جاتی ہے
کبھی خالی خدا کے نام پر کھنچوائی جاتی ہے
پکڑ کے بھیجی جاتی ہے ، جکڑ کے لائی جاتی ہے
وہ کہتے ہیں کہ اس میں پھر بھی موٹر پائی جاتی ہے
اذیت کو بھی اک نعمت سمجھ کر شادماں ہونا
تعال اللہ یوں انساں کا مغلوب گماں ہونا

تشریح: اس موٹر نے ہمیں کتنا پریشان اور رسوا کیا ہے کچھ نہ پوچھیئے کیونکہ یہ جہاں جی چاہتا ہے چلنا بند کر دیتی ہے۔ اور پھر اسے بیلوں کے پیچھے باندھ کر لانا پڑتا ہے۔ جب کوئی اور صورت نہیں بنتی تو اسے گھر تک لانے کے لیئے لوگوں کی منت سماجت کرنا پڑتی ہے اور اسے دھکا لگانے کے لیئے لوگوں کو خدا کے واسطے دینے پڑتے ہیں۔ اگرچہ اسے مشکل سے چلا کر روانہ کیا جاتا ہے اور ہمیشہ اسے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ باندھ کے لانا پڑتا ہے مگر پھر بھی یاروں کا اصرار ہے کہ اس میں خود بخود چلنے والی موٹر پائی جاتی ہے۔ حد ہے کہ لوگ اس سے کیسی کیسی اذیتیں اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں مگر پھر بھی اسے اللہ تعالٰے کی نعمت قرار دے کر خوش ہو جاتے ہیں کہ چلو

اس کے لیئے مصیبت اُٹھاتے ہیں تو کیا ہوُا، ہے تو یہ موٹر، جو اللہ کی نعمت ہے۔

بند نمبر ۴:۔ بہ طرزِ عاشقانہ دوڑ کر، بے ہوش ہو جانا
به رنگِ دلبرانہ جھانک کر، روپوش ہو جانا
بزرگوں کی طرح کچھ کھانس کر، خاموش ہو جانا
مسلمانوں کی صورت دفعتاً پُرجوش ہو جانا
قدم رکھنے سے پہلے لغزشِ مستانہ رکھتی ہے
کہ ہر فرلانگ پر اپنا مسافر خانہ رکھتی ہے

تشریح: اِس کا چلنا بھی کیا منظر پیش کرتا ہے، اگر یہ چل پڑے تو کمزور وناتواں عاشقوں کی طرح تھوڑی دور تک دوڑتی ہے اور بے ہوش ہوکر رک جاتی ہے اور کبھی اس کی چال کسی محبوب کی طرح ایک جھلک دکھا کر چھپ جاتی ہے اور کبھی کسی بوڑھے کی طرح کھانستی ہے اور خاموش ہو جاتی ہے اور کبھی مسلمانوں کی طرح جوش و خروش کا مظاہرہ کرتی ہے۔ غرض اِس کا کیا کہوں کہ چلنے سے پہلے ہی دیوانوں کی طرح جھومنے لگتی ہے اور چلتی ہے تو فرلانگ بھر سفر کرکے رک جاتی ہے اور ہر دفعہ یہی عمل دہراتی ہے۔ غرض اس موٹر میں عاشقوں، بوڑھوں اور پُرجوش مسلمانوں کی خوبیاں موجود ہیں مگر یہ اپنی مرضی سے اِن صفات کو استعمال میں لاتی ہے۔

بند نمبر ۵:۔ دمِ رفتار دنیا کا عجب نقشا دکھائی دے
سڑک بیٹھی ہوئی اور آدمی اُڑتا دکھائی دے
نظامِ زندگی اکثر تہ و بالا دکھائی دے
یہ عالم ہو تو اس عالم میں آخر کیا دکھائی دے
روانی اس کی اک طوفانِ وجد و حال ہے گویا
کہ جو پرزہ ہے اک بپھرا ہوا قوال ہے گویا

تشریح: جب یہ موٹر چلتی ہے تو دنیا کا عجیب نقشہ نظر آتا ہے اِس میں سوار لوگوں کو یوں لگتا ہے کہ سڑک بیٹھی جا رہی ہے اور اِس میں سوار لوگ ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ اِس کے چلنے پر زندگی کا نظام الٹ پلٹ کر رہ جاتا ہے اور جب حال اِس حد تک خراب ہو جائے تو بھلا اِس دنیا میں انسان کو کوئی چیز درست حالت میں نظر آ سکتی ہے۔ اس کے چلنے سے یوں لگتا ہے کہ ساری موٹر بے خودی اور مستی میں حال کھیلنے لگی ہے کیونکہ اس کے ہر پرزے سے کسی بپھرے

ہوئے پُرجوش قوّال کی سی آوازیں آتی ہیں، گویا اِس موٹر کے چلتے ہی اِس قیامت کا شور برپا ہوتا ہے کہ سب لوگ کام چھوڑ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور اِس میں سوار لوگوں کو دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوتی ہے

بند نمبر ۶ :- شکستہ ساز میں بھی، محشرِ نغمات رکھتی ہے
توانائی نہیں رکھتی مگر جذبات رکھتی ہے
پرانے ماڈلوں میں کوئی اونچی ذات رکھتی ہے
ابھی پچھلی صدی کے بعض پرزہ جات رکھتی ہے

غمِ دوراں سے اب تو یہ بھی نوبت آگئی اکثر
کسی مرغی سے ٹکرائی تو خود چکرا گئی اکثر

تشریح: اِس موٹر کا انجر پنجر سب ہلا ہُوا ہے گویا اس کے سارے ساز ٹوٹے ہوئے ہیں، پھر بھی کمال یہ ہے کہ اِس کے چلتے ہی ہر طرح کے نغموں کا ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔ یہ چلنے کی قوت سے محروم ہے مگر اِس کے جذبات کا یہ عالم ہے کہ اِس خستہ حالی کو پہنچنے کے باوجود بھی خود کو پرانے ماڈلوں کی اعلیٰ ترین ذات سے تعلّق رکھنے کا دعویٰ ہے۔ کیونکہ اب بھی اِس میں کچھ کل پرزے پچھلی صدی کے ہیں اور زمانے کے ہاتھوں یہ اتنی تباہ حال ہوئی ہے کہ اگر اِس سے کوئی مرغی بھی ٹکرا جائے تو اُسے کوئی نقصان پہنچانے کی بجائے یہ موٹر کار خود چکرا کر رہ جاتی ہے، گویا کسی معمولی رکاوٹ کو عبور کرنا بھی اب اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔

بند نمبر ۷ :- ہزاروں حادثے دیکھے، زمانی بھی، مکانی بھی
بہت سے روگ پالے ہیں زراہِ قدردانی بھی
تحمل اس سخت جانی پر ہے مرگِ ناگہانی بھی
خداوندا نہ کوئی چیز ہو اتنی پرانی بھی
کبھی وقتِ خرام آیا تو ٹائر کا سلام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

تشریح: اِس موٹر نے اپنی طویل زندگی میں مختلف زمانوں میں مختلف جگہوں پر بہت سے حادثات کا مزہ چکھا ہے اور اِن حادثات کے نتیجے میں کئی مرضوں میں مبتلا ہوئی ہے مگر سخت جانی اور بے حیائی کا یہ عالم ہے کہ موت تک کو اِس کے پاس آتے شرم آتی ہے۔ شاعر طنزاً کہتا ہے کہ اللہ نہ کرے کہ دنیا میں کوئی چیز اتنی اتنی بھی ہو جتنی یہ موٹر پرانی ہے۔ اس کی خستہ حالی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ

چلتے ہوئے کبھی ایک چیز خراب ہو جاتی ہے اور کبھی دوسری جواب دے جاتی ہے اور کبھی چلتے چلتے اس کا کوئی پرانا ٹائر پنکچر ہو کر بلند آواز میں سلام کر کے کہتا ہے کہ اے مسافر ذرا تھم جا، شاید اس سفر میں پھر کوئی مشکل مرحلہ آگیا ہے۔

ناصر کاظمی

غزل نمبر ۱

حلِ لغات وحشت ہونا ـــــ سودا یا جنوں ہونا، گھبرانا ؛ برہم ہونا۔ بگڑنا ؛ راحت۔ خوشی۔ اطمینان ؛ توفیقِ اضطراب۔ بے چین و بے قرار ہونے کا حوصلہ اور ہمت ؛ الم۔ دکھ۔ تکلیف ؛ حسن آفریں۔ حسن پیدا کرنے والا ؛ خلوت ؛ تنہائی ؛ جوشِ جنوں۔ دیوانگی کی شدت ؛ طغیانی۔ طوفان۔ سیلاب ؛ قیامت گذرنا۔ سخت مصیبت پیش آنا ؛ شبِ فرقت۔ جدائی کی رات ؛ ترکِ محبت۔ محبت کے تعلق کو چھوڑ دینا۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱:- ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

تشریح عشق میں ایک عاشقِ صادق مختلف کیفیات سے دوچار ہوتا ہے اور اُس کی سیمابی طبیعت مختلف اوقات میں مختلف طرح کے ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے یہاں بھی شاعر ایک ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہے اور محبوب سے کہتا ہے کہ عشق میں تمہارے لیئے ہم نے جو ظلم و ستم برداشت کیئے ہیں، اور ذلت و رسوائی قبول کی ہے اُس کے بعد بھی ہمیں تمہاری بے رخی، بے اعتنائی اور جفا کاری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں طبیعت بگڑ جاتی ہے کہ ہم نے تیرے لیئے کیا کیا، ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا اگر تو اپنی روش بدلنے کے لیئے تیار نہیں اور یہی سوچ کر طبیعت کچھ ایسی برہم ہوتی ہے کہ تیرے نام تک سے وحشت ہونے لگتی

ہے اور ایک جنوں کی کیفیت ہم پر طاری ہو جاتی ہے، ظاہر ہے یہ عاشق کے ہر قربانی کرنے کے بعد بھی مایوس و نامراد رہنے کا قدرتی ردِ عمل ہے۔

شعر نمبر ۲:- اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

تشریح کبھی کبھی عشق میں ایک چاہنے والے کو اِس کیفیت سے بھی گذرنا پڑتا ہے کہ دوست کے دیئے ہوئے دکھ اور ظلم و ستم بھی اُس کے لیئے ایک لذت اور لطف کا سامان فراہم کرنے لگتے ہیں اور ایسی لذتِ آزار کے لیئے وہ بے چین و بے قرار رہتا ہے۔ یہاں بھی ناصر خود کلامی کے سے انداز میں کہتے ہیں کہ اے میرے دل! تیری طرح عشق میں بے چین و بے قرار رہنے کا حوصلہ اور ظرف بھلا اور کسے نصیب ہو گا، زندگی میں اس مقام کو پا لینے کی خوشی اور راحت کبھی کبھی ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا تو خوش نصیب ہے کہ تیری زندگی کا ہر لمحہ فراقِ یار میں مضطرب گذرتا ہے اور تیری سوچوں کا محور و مرکز تیرا محبوب ہی رہتا ہے۔

شعر نمبر ۳:- تیرے کرم سے اے المِ حسن آفریں
دل بن گیا ہے دوست کی خلوت کبھی کبھی

تشریح اے پیکرِ حسن و جمال! تیرے دیئے ہوئے دکھوں کا بہت بہت شکریہ، کہ ان کی مہربانی سے ہمارا دل دوست کی خلوت گاہ بن گیا ہے۔ کیا ہوا اگر تو حقیقی زندگی میں اپنے لطف و کرم اور التفاتِ نظر سے نہیں نوازتا اور رنج و الم کے لامتناہی سلسلے میں الجھاتا چلا جاتا ہے۔ مگر اس سے یہ تو فائدہ ہوا کہ ہم عالمِ تصور میں ہی اپنے گداز دل کی تنہائی میں تجھے آباد کر لیتے ہیں اور پھر جو کچھ عملی زندگی میں ممکن نہیں وہ اس خیالی دنیا میں ممکن ہوتا چلا جاتا ہے ہمارا دل تمہاری خلوت گاہ بن کر سرفراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ مومن کے لفظوں میں۔

ع تم میرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شعر نمبر ۴:- جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ   اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی

تشریح اے دوست کبھی کبھی ہم اِس مرحلے سے بھی گذرے ہیں کہ دیوانگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور شدتِ درد و غم ہماری آنکھوں سے چھلکنے لگا، اور آنسوؤں کا وہ تانتا بندھا کہ تمہاری صورت بھی ہمارے آنسوؤں میں ڈھل کر رہ گئی۔ دراصل جب انسان روتا ہے تو آنکھوں میں آنسوؤں کی کثرت سے کوئی چیز بھی واضح نظر نہیں آتی اور اگر یہ شدتِ گریہ قائم رہے تو قریب بیٹھنے والوں

کے چہرے بھی دھواں دھواں نظر آتے ہیں۔ شاعر نے اپنے اسی مشاہدے کی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ اے دوست! تمہارے عشق میں شدّتِ غم کا یہ عالم ہے کہ تمہاری صورت بھی ہمارے آنسوؤں میں ڈھل کر دھواں دھواں ہو گئی ہے۔

شعر نمبر ۵ :- تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا گذری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

تشریح ہجر و فراق میں کبھی کبھی عاشق کی شدّتِ طلب اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وقتِ ملاقات وہ اپنے جذبوں کی تشنگی کو برقرار پاتا ہے۔ گویا وصلِ دوست میں بھی ایک تشنگی کا احساس اُسے بے چین رکھتا ہے۔ ناصر اِسی کیفیت کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں کہ اے دوست! اِس سے بڑھ کر قیامت مجھ پر اور کیا گذرے گی کہ تیری قربت میں بھی مجھے وہ سکون اور وہ اطمینان نصیب نہ ہوا جس کے لیئے میں تجھ سے ملاقات کا متمنّی تھا۔ بے چینی اور بے قراری کے ساتھ ایک تشنگی کا شدید احساس تیرے قرب کے باوجود قائم رہا۔ گویا مجھے عشق اب اُس مقام پر لے آیا ہے کہ تیری قربت بھی میری تشفی کا باعث نہیں بنتی اقبال یہی کیفیت اِس طرح بیان کرتے ہیں۔

؎ عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذّتِ طلب

شعر نمبر ۶ :- کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا یوں بھی گذر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

تشریح اے دوست! ہجر کی رات ہم پر کیسے گذری یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ درد و غم اور احساسِ ناکامی و نامرادی نے ہمیں کچھ یوں گھیرا کہ ہمیں نہ اپنے آپ کا ہوش رہا اور نہ ہی کچھ تمہارا خیال رہا۔ کیونکہ اِسی احساسِ غم سے فرار کے لیئے ہم نے بزمِ خیال سجالی اور پھر جو اِس محفل کی رعنائیوں میں کھوئے تو عملی زندگی کو یکسر فراموش کر دیا یہاں تک کہ ہم اپنی ذات اور تمہارے وجود سے بھی وقتی طور پر بے نیاز ہو گئے اور یوں شبِ فرقت نہ جانے کب گذر گئی۔ فیض نے اِسی بات کو اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

؎ بزمِ خیال میں تیرے حسن کی شمع جل گئی درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

شعر نمبر ۷ :- اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

تشریح اے دوست! ہم نے تم سے محبّت کا تعلق تو بظاہر ختم کر لیا مگر سچّی بات یہ ہے کہ اِس ترکِ تعلق کے بعد بھی تو ہماری زندگی کے تناظر سے غائب نہ ہُوا اور ہم اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگرچہ تجھ سے خلوص اور وفا کا رشتہ ہم نے توڑا تھا۔ بنیادی اعتبار سے تو شاید ایسا ہی نظر آتا ہو مگر حقیقتاً یہ ہے کہ

آج بھی تو ہمارے دل میں پنپتا ہے اور کبھی کبھی ہمیں اپنی زندگی میں تمہاری کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور اپنی حماقت پر رونا آتا ہے کہ ترکِ تعلق کا اعلان کرکے ہم ایک کربِ مسلسل سے دوچار ہو گئے کیونکہ مولانا حسرت موہانی کے بقول

ع ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی   دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

غزل نمبر ۲

حلِ لغات احساسِ زیاں ـــــ نقصان کا احساس اور خدشہ ؛ لرز اُٹھنا۔ خوف سے کانپنا ؛ نشۂ خوابِ گراں۔ گہری نیند کا نشہ ؛ گرم سفر۔ سفر میں مصروف ؛ سنگِ نشاں۔ میل کا نشان ؛ سفرِ شوق۔ عشق کا سفر ؛ فرسنگ۔ کوس۔ میل ؛ بے قیدِ مکاں۔ جہاں مقام اور جگہ کی کوئی پابندی نہ ہو ؛ راس۔ سازگار۔ مبارک ؛ اندیشۂ جاں۔ جان کا خطرہ ؛ کنجِ اماں۔ سلامتی کا گوشہ۔ مراد ہے پناہ گاہ ؛ رواں۔ جاری ؛ خرابہ۔ تباہ شدہ مقام طیور۔ جمع طائر کی۔ پرندے ؛ ملکِ سخن۔ شاعری کا ملک۔ مراد ہے شاعری ؛ خموشی کو زباں بخشنا۔ بات کرنے کا سلیقہ عطا کرنا ؛ مجبورِ فغاں۔ نالہ و فریاد کرنے پر مجبور ؛ معمورۂ غم۔ غم کی بستی مراد ہے دنیا ؛ خانہ برباد۔ جس کا گھر تباہ ہو چکا ہو ؛ حسنِ بہار۔ بہار کی خوبصورتی ؛ عطرِ گل۔ گلاب کا عطر ؛ صرفِ خزاں۔ خزاں کے استعمال میں۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱:۔ کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے   دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

تشریح آج ہمارا دل جس بے نیازی کی کیفیت سے دوچار ہے ہمارا یہ حال پہلے کب تھا بلکہ ماضی میں تو ہم خاصے محتاط تھے ہمیں اپنے نفع و نقصان کا شعور و ادراک بھی تھا اور اپنے اچھے بڑے پر بھی غور کرتے تھے مگر اب عشق میں یہ حال ہے کہ صرف محبوب کی ذات ہی ہماری سوچوں کا محور و مرکز بن کر رہ گئی ہے اور سب کچھ بھول گیا ہے۔ اب نہ ہمیں اپنے نقصان کی پروا ہے اور نہ کسی اور چیز کی۔

شعر نمبر ۲:۔ اب تو جھونکے سے لرز اُٹھتا ہوں   نشۂ خوابِ گراں تھا پہلے

تشریح ماضی میں ہمارا یہ حال تھا کہ نیند ایک نشہ بن کر ہمیں اپنی آغوش میں لپیٹے رکھتی تھی بڑی سے بڑی بات بھی ہماری اِس کیفیت میں خلل انداز نہیں ہوتی تھی اور ہم اپنی دنیا میں مست رہتے تھے مگر اب غمِ دوراں اور غمِ جاناں

نے ہمیں کچھ ایسا حساس بنا دیا ہے کہ کبھی آنکھ لگتی بھی ہے تو معمولی سے کھٹکے سے بھی آنکھ کھل جاتی ہے ہوا کا کوئی تیز جھونکا بھی پاس سے گذر جائے تو کانپ اُٹھتے ہیں اور پھر کسی پل بھی چین نہیں آتا۔

شعر نمبر ۳:- اب تو منزل بھی ہے خود گرمِ سفر ۔۔۔ ہر قدم سنگِ نشاں تھا پہلے

تشریح آغازِ عشق میں منزل پر پہنچنے کا کچھ ایسا ذوق و شوق تھا کہ ہر قدم پر ایک نیا مرحلہ طے کرنے کا گمان ہوتا تھا گویا ہمارا ہر قدم ہی ایک سنگِ میل ہو مگر اب وہی راستے جو کبھی کٹھن اور طویل لگا کرتے تھے اب ہمارے جوشِ جنوں کے سامنے سمٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں بلکہ اب تو ہمیں یوں لگتا ہے گویا خود منزل ہماری قدم بوسی کے لیے مصروفِ سفر ہے اور ہمیں گلے سے لگانے بے تاب و بے چین ہے بقول حفیظ جالندھری۔

؎ ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل ۔۔۔ برابر چل رہا ہوں آ رہا ہوں

شعر نمبر ۴:- سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ ۔۔۔ وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے

تشریح عشق میں انسان منزل پر پہنچنے کے کس ذوق و شوق سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ شاعر یوں پیش کرتا ہے کہ ہماری زندگی کا وقت پہلے قیدِ مکاں سے آزاد تھا یعنی عشق سے پہلے ہمارے لیے وقت اور مقامات کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے مگر اب عشق میں مبتلا ہونے کے بعد ہمارے مرحلہ ہائے شوق کے بارے میں کچھ نہ پوچھ کیونکہ اس راہِ عشق کا ایک طویل کوس ختم ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہو جاتا ہے گویا ہماری زندگی انہی راستوں پر چلتے چلتے ہی تمام ہو جائے گی۔

شعر نمبر ۵:- یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب ۔۔۔ اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے

تشریح ابتدائے عشق میں جب رنج و الم سے پالا پڑا تو یوں لگتا تھا کہ عشق کے یہ غم ہماری جان لے کے چھوڑیں گے مگر رفتہ رفتہ غموں سے ہمارا رشتہ دائمی ہوتا چلا گیا۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ غم راس سے آگئے ہیں اور انہی کو برداشت کرتے ہوئے زندگی گذر رہی ہے اور ہم سوچتے ہیں اگر ان غموں کا سلسلہ نہ ہو تو نہ جانے زندگی کا چلن کیسا ہو۔ دراصل عشق کی مشکلات برداشت کرتے کرتے انسان ان کا عادی ہو جاتا ہے بقول غالب۔

؎ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ۔۔۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

شعر نمبر ۶:- یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے ۔۔۔ دل عجب کنجِ اماں تھا پہلے

تشریح عشق کا آزار لگنے سے پہلے ہمارا دل امن وسلامتی کا گہوارہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی راحتیں اور خوشیاں اسے مطمئن کر دیتی تھیں مگر جب ہم عشق کے حادثے سے دوچار ہوئے تو اب بے چینی و بے قراری کی ایک مسلسل کیفیت ہے کہ پریشان رکھتی ہے اور ہر گھڑی کوئی نہ کوئی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ گویا دل کی پناہ گاہ کیا چھنی کہ خوف وہراس اور گھبرائے رہنے کا ایک عذابِ مسلسل اب جان نہیں چھوڑتا۔

شعر نمبر ۷:۔ اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن — اس قدر دور کہاں تھا پہلے

تشریح اے دوست! اس میں شک نہیں کہ اب بھی ہمیں تیری قربت نصیب نہیں اور ہم ہجر کی آگ میں جل رہے ہیں اور یہ دوری اور ہجر تو گویا ہمیشہ سے ہماری قسمت میں لکھ دیا گیا تھا مگر پہلے اس دوری کے باوجود یہ احساس زندگی بخش تھا کہ ہم تیرے دل کے تو قریب ہیں۔ مگر اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب تو جسمانی اور دلی طور پر جتنا دور تھا پہلے کبھی نہ تھا۔ گویا پہلے جدائی کے باوجود محسوسات کے اعتبار سے ایک قربت کا احساس برقرار رہتا تھا مگر لگتا ہے اب تو نے ہمیں دل سے بھی بھلا دیا ہے اسی لیے یہ دوری اب کہیں زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک لگتی ہے۔

شعر نمبر ۸:۔ ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں — اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے

تشریح ناصر کاظمی اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی اور تغیر پذیری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ صحرا، آج جہاں بگولے خاک اڑاتے پھرتے ہیں اور ہر طرف زندگی ناپید نظر آتی ہے، وہاں کل تک چشمے جاری تھے اور آبِ رواں زندگی کی رونقوں کو چار چاند لگائے ہوئے تھا مگر انقلاب زمانہ نے زندگی کے ان ہنگاموں کو مٹا کر اسے صحرا میں بدل دیا اور آج ان صحراؤں میں خاک اڑاتے بگولوں کی حکومت ہے۔ بقول حالی۔

جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت، رقص کرتے سیم بر، یاں تھے

شعر نمبر ۹:۔ اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ — کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

تشریح اقبال کے لفظوں میں زندگی ہر لحظہ تغیر آشنا ہے اور زمانے میں تغیر و تبدل کو ہی ثبات حاصل ہے۔ اور ہر چیز کچھ اس تیزی سے تبدیل ہوتی ہے کہ انسان کی محدود عقل میں کچھ نہیں آتا۔ ناصر کاظمی اسی بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کل تک جو دریا ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا اور اس کے کنارے زندگی کی ہنگامہ خیزیوں

سے معمور لوگ اپنی بستی میں شاد و آباد تھے مگر آج سب کچھ زمانے کے انقلاب کی نذر ہو چکا ہے نہ وہ دریا کی روانی ہے۔ نہ وہ بستی ہے اور نہ ہی وہ لوگ موجود ہیں۔ شاعر فلسفیانہ انداز سے سوچتا ہے کہ کیا خبر کہ ماضی میں یہاں کیا تھا اور اسی طرح نہ جانے آئندہ یہاں کیا ہو گا۔

شعر نمبر ۱۰:۔ ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے　　میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

تشریح ہر عمارت کے کھنڈرات گویا اِس بات کا اعلان ہیں کہ میں ہمیشہ سے یہی یوں تباہی بربادی کا منظر پیش نہیں کر رہا بلکہ کل تک میں بھی مسرت و شادمانی سے بھرپور ایک گھر تھا جہاں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ سرگرمِ عمل تھی مگر زمانے نے میری شان و شوکت کو پیوندِ زمین کر دیا اور اب میں عبرت گہہِ عالم ہوں۔

شعر نمبر ۱۱:۔ اُڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیور　　سرو اک شوخ جواں تھا پہلے

تشریح دنیا کی ہر چیز زوال آمادہ ہے حسن اور جوانی بھی زوال کی نذر ہو کر ڈھل جاتی ہے۔ شاعر نے اِس حقیقت کو تمثیلی انداز سے بیان کیا ہے کہ پرندے شاخ پر بیٹھے تھے اور اٹھکیلیاں کر رہے تھے لیکن پھر یہ کہتے ہوئے اُڑ گئے کہ یہ سرو کا درخت جو آج خزاں رسیدہ ہو کر اپنی رعنائیاں کھو بیٹھا ہے یہی کل ایک شوخ جواں کی مانند اپنے حسن و جوانی کے نشے میں چور تھا۔ گویا حسن و جوانی ڈھلتی چھاؤں ہے۔ آج اِن پر ناز کرنے والے لوگوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ کل اُنہیں اِس کے زوال پر بھی کفِ افسوس ملنا ہو گا۔

شعر نمبر ۱۲:۔ کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے　　تُو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

تشریح ناصر کاظمی خود کلامی کے انداز میں کہتے ہیں کہ اہلِ دنیا بدلتے حالات کے مطابق خوراک کو ڈھال لیتے ہیں اور یہی اُن کی کامیابی کا راز ہے اور اِسی زمانہ سازی کی بدولت لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے زندگی کی کامیابیاں اُن کے قدم چوم رہی ہیں مگر افسوس ہم نے زمانے سے کوئی سبق نہ سیکھا۔ ہمیں یہ زمانہ سازی کا فن نہ آ سکے نتیجتاً ہمارے حالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ نہ غمِ دوراں سے جان چھوٹی اور نہ غمِ جاناں کے عذاب سے نجات مل سکی۔ بقول دردؔ

ع ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست　　زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

شعر نمبر ۱۳:۔ ہم نے آباد کیا ملکِ سخن　　کیسا سنسان سماں تھا پہلے

تشریح اس شعر اور بعد میں آنے والے اشعار میں شاعر کا لہجہ فخریہ ہے وہ اپنے اس فخر کا سبب بھی وہ پیش کرتا ہے کہ ہم نے شعر و شاعری کی دنیا

آباد کیا ورنہ ہم سے پہلے یہاں کیسی وحشت ٹپکتی تھی، کیسی ویرانی کا عالم تھا اور شعر و شاعری کا ملک کیسا اجاڑ اور سنسان نظر آتا تھا۔ گویا شاعر کے خیال میں یہ اُسی کی ذات تھی جس نے شعر و شاعری کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا اور اِس فن کو لوگوں کے لیے باعثِ عزت و توقیر بنا دیا۔

شعر نمبر ۱۴:- ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں　　　درد مجبور فغاں تھا پہلے

تشریح: ہم سے پہلے بھی لوگ شاعری کرتے تھے مگر دل کی دردمندی کو شعر کی زینت بنانے سے خوفزدہ رہتے تھے مگر ہم نے جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اِس روش کی بغاوت کی اور جو کچھ محسوس کیا اسے ہی شعر کے قالب میں ڈھال دیا گویا جب ہم نے حقیقت بیانی کا طریقہ اختیار کیا تو دوسروں کو بھی حوصلہ ہُوا اور وہ بھی اسی ڈگر پر چل پڑے ورنہ ہم سے پہلے تو لوگ ظلم کی چکی میں پستے تھے اور دوسروں کو پست دیکھتے تھے مگر جرأتِ اظہار سے قاصر تھے۔ گویا یہ اعزاز بھی ہمارے سر ہے کہ ہم نے شاعری کے خموش لبوں کو قوتِ گویائی عطا کی۔

شعر نمبر ۱۵:- ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق　　　شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے

تشریح: ہمارے جذبہ عشق کی صداقت کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ ہم نے شوق کا وہ تیشہ ایجاد کیا جس کی بدولت پتھروں میں پوشیدہ شعلوں کو نکالنا ممکن ہُوا۔ گویا ہماری سخت کوشی کی بدولت پتھر کی طرح گم سُم لوگوں میں شعلہ نوائی کا ہنر جاگا اور وہ زندگی کے جوش و جذبے سے سرشار ہو گئے۔

شعر نمبر ۱۶:- ہم نے روشن کیا معمورۂ غم　　　ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے

تشریح: شاعر اپنے غرور و فخر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ ہم نے اِس غم کی بستی یعنی دنیا کو آباد کیا ورنہ ہم سے پہلے تو یہاں کچھ نہ تھا اور اس کا ماحول دھواں دھواں نظر آتا تھا، مراد ہے اس دنیا کو اولاد آدمؑ کی ہنگامہ خیزیوں نے آباد و پُررونق بنایا ہے ورنہ حضرت آدمؑ کے اِس دنیا میں ظہور سے پہلے تو اس میں کچھ نہ تھا۔

شعر نمبر ۱۷:- ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار　　　عطرِ گل صرف خزاں تھا پہلے

تشریح: شاعر اپنے فخر و افتخار کا ایک سبب یہ بیان کرتا ہے ہمیں یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ہم نے بہار کی رنگینیوں اور رعنائیوں کو عطرِ گل کی صورت میں محفوظ کر لیا ورنہ عطرِ گل کی صورت میں ڈھلنے سے پہلے تو موسم بہار کے پھولوں

کا حسن وجمال اور خوشبوئیں خزاں کی بھینٹ چڑھ جاتی تھیں۔

شعر نمبر ۱۸:- غم نے پھر دل کو جگایا ناصرؔ خانہ برباد کہاں تھا پہلے

تشریح: غزل کے اس خوبصورت مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے ناصرؔ! ایک بار پھر غم نے ہمارے دل کا زخم تازہ کر دیا ہے سوئے ہوئے غم تازہ ہو گئے اور ماضی کے تمام حوادث ایک بار پھر ہم پر ستم توڑنے اور قیامت ڈھانے کے لیئے جلوہ گر ہو رہے ہیں یہ خانہ خراب نہ جانے اب تک کہاں تھا اور اس نے ایک عرصہ تک ہم سے الگ رہ کر کچھ پُرسکون زندگی گذارنے کا موقع کیوں دیا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اب پھر یک بیک اس غم نے ہمارے دلِ نازک پر یلغار کر دی ہے اور دل میں سوئے جذبوں اور امنگوں کو ایک بار پھر بیدار کر کے گویا ایک بار پھر ہماری تباہی کا سامان کرنا چاہتا ہے۔

منیر نیازی

مشکل الفاظ کے معنی: صرصر- طوفان، بام - چھت، در - دروازہ، باب - دروازہ، زرفشانی - سونا بکھیرنا۔ مراد چمک۔

شعر نمبر ۱:- سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں اُن امتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں

تشریح: اس غزل میں منیر نیازی نے کسی ایسی قوم کا ذکر کیا ہے جس پر خدا نے بڑی نوازشات کیں لیکن وہ قوم سرکشی، ظلم وجور، استحصال اور دیگر برائیوں سے باز نہ آئی۔ چنانچہ اُس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔ اس طرح کی بہت سی قوموں کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ مثلاً ہود اور لوط کی قومیں۔ شاعر انہی میں سے کچھ قوموں کا حال سناتے ہوئے آج کے لوگوں سے کہتا ہے کہ اُن بستیوں کا احوال مجھ سے سنو جو اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے اعتدال کے راستے کو چھوڑ کر ظلم وستم اور دوسری برائیوں میں حد سے گزر گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قومیں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی خدا کے غیض وغضب کا شکار ہو کر تباہ وبرباد ہو گئیں اور لوگوں کے لیئے درسِ عبرت بن گئیں۔ ان قوموں کی مثال کے ذریعے شاعر کا درحقیقت اپنی قوم کو خرابیاں دور کرنے کا درس دینا مقصود ہے۔

شعر نمبر ۲:- کر یاد اُن دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں گلیاں جو خاک وخون کی دہشت سے بھر گئیں

تشریح اس شعر میں بھی پہلے شعر کا تسلسل قائم ہے کسی زمانے میں ایک علاقہ آباد تھا۔ لوگ خوش و خرّم زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن انجام سے بے پرواہ تھے کچھ وقت اسی تعیش میں گزر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر غضب نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ غضب اُن پر کسی اور قوم کے حملہ آور ہونے یا باہمی خانہ جنگی کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جن گلیوں میں لوگ محوِ خرام تھے۔ اُن گلیوں میں جگہ جگہ قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا اور لوگ ڈر کر گھروں میں دبک گئے اور گلیاں ویرانی کا منظر پیش کرنے لگیں۔

شعر نمبر ۳: صرصر کی زد میں آئے ہوئے بام و در کو دیکھ — کیسی ہوائیں کیسا نگر سرد کر گئیں

تشریح اس شعر میں بھی پہلے کے دو اشعار کا تسلسل برقرار ہے۔ بات اُسی قوم اور اُسی ملک کی ہو رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ ملک خوبصورت بھی تھا اور آباد بھی۔ لیکن پھر اچانک ایک طوفان اٹھا اور وہ طوفان دیکھتے ہی دیکھتے اتنا پھیل گیا کہ اُس نے گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ طوفان جب شروع میں اُٹھا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ یہ خوشگوار ہوا ہے۔ لیکن جب طوفان پوری طرح پھیل گیا تو اُس کی شدت نے پورے علاقے کو تباہ کر دیا۔ جب طوفان گزر گیا تو معلوم ہوا کہ علاقہ ویران ہو چکا ہے اور زندگی مر چکی ہے۔ زندگی کے مرجانے کو سردی سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ موت زندگی کی حرارت اور دورانِ خون کو ختم کر کے لاش کو بالکل ٹھنڈا اور ساکت کر دیتی ہے۔ یہاں گویا پورا علاقہ ہی موت کی سردی میں ڈوب گیا۔

شعر نمبر ۴: کیا باب تھے یہاں جو صدا سے نہیں کھلے — کیسی دعائیں تھیں جو یہاں بے اثر گئیں

تشریح اس شعر میں بھی خدا کے عذاب کی زد میں آئی ہوئی قوم کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ قیامت سے کچھ عرصہ قبل ایسا وقت آئے گا جب توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے، اُس وقت توبہ کرنا، خدا کے حضور گریہ زاری کرنا اور اپنے گناہوں پر پچھتانا بیکار ہو گا۔ اس شعر میں قربِ قیامت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جب توبہ کے دروازے بند ہو گئے۔ پھر لوگوں نے بہت گریہ زاری کی، خدا کے حضور رو رو کر دعائیں کیں لیکن اب ان دعاؤں اور صداؤں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دعائیں بے اثر گئیں اور قیامت آ کر رہی۔

شعر نمبر ۵: تنہا اجاڑ برجوں میں پھرتا ہے تو منیرؔ — وہ زر فشانیاں ترے رُخ کی کدھر گئیں

تشریح غزل کے مقطع سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے خود بھی اپنے آپ کو پوری غزل کی فضا میں شریک کر لیا ہے یا پھر شاعر بھی کسی ایسے ہی ملک کا باشندہ ہے جس پر یہ قیامت گزر گئی۔ اور وہ اس قیامت کے بعد تنہا اجڑے ہوئے مکانوں اور برجوں میں پھر رہا ہے اور اجاڑ وحشت زدہ علاقے کو دیکھ کر اُس کے اپنے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے۔